قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں
۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے
۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

(دوسرا ایڈیشن)
حضرت نیاز کے متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔
قیمت ...... عہ/

گہوارۂ تمدن

(دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۲ع

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ/

فراستِ الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص نہ صرف ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ/

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱ا/

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک مبسوط تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل پھڑک جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ا/

صحابیات

جسمیں عہد رسالت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کردیے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے قیمت علاوہ محصول ۱ع

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہ عبدالباری آسی جسمیں نہ امداد و فارسی کے ظریف شعرا کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف کے کلام کے درج ہیں قیمت علاوہ محصول

نگار

جلد ۱۹　فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۳۱ء　شمار (۱)

فراست التحریر

کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جو اُردو رسم الخط سے متعلق ہے اور دوسرا انگریزی طرز تحریر سے۔ اس ماہ میں صرف پہلا حصہ اُردو کے متعلق شائع کیا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ جو انگریزی خط سے تعلق رکھتا ہے فروری کے نگار میں شائع ہوگا۔

یہ دونوں حصے یکجا کتابی صورت میں بھی مل سکیں گے۔ قیمت معہ محصول ایک روپیہ تجویز ہوئی ہے اور ۱۵ فروری کے بعد سے روانگی شروع ہو سکے گی۔

منیجر "نگار"

علم فراست التحریر

مرتبہ

سید یامین ہاشمی ایم اے، ال ال بی،

فہرست مضامین

علم فراست التحریر

(یعنی ایک شخص کی تحریر کو دیکھکر اُسکی سیرت اور اُسکے مستقبل پر حکم لگانیکا علم)

تمہید

ایک زمانہ وہ تھا جب انسان اور اُس کی زندگی کے تمام واقعات و حوادث اتفاقات پر محمول سمجھے جاتے تھے، لیکن صدہا سال کے تجربات و تحقیقات نے آخر یہ ثابت کر دیا کہ اس کے ظاہری و باطنی قویٰ سب مرتب و معین اصول پر قائم ہیں، اور جن میں تغیر و تبدل بھی انسانی قدرت سے باہر نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دریافت کے ساتھ ساتھ مصنوعی زندگی کا دور شروع ہوا جس نے انسان کے فطری قویٰ کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اور ہماری یہ مصنوعی زندگی اگر کبھی فریب و کذب کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوئی تو اس سے زیادہ اتفاقات ایسے بھی پیش آئے جب اوس نے باطن کو ظاہر سے مطابقت دینے کے لئے ہماری اخلاقی زندگی کو بہتر بنانیکی کامیاب کوشش کی۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ اس مصنوعی دورِ حیات نے قیاسی علوم کی تحقیق و دریافت میں صدہا حجابات پیدا کئے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ ان علوم و فنون کی اہمیت روز افزوں ترقی پر نہیں۔

انسان پر تو "الٰہی" ہے۔ اوسکی کوشش بھی ہمیشہ یہی رہی کہ وہ خدا بن کر زندہ رہے، انسانی زندگی کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہا، اوس کی یہ زندگی تین دور میں تقسیم کیجا سکتی ہے اور ہر دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے نمایاں اور ممتاز ہے۔

(۱) دورِ اول۔ یہ وہ دور تھا جب انسان نے اپنی جاہ و حشمت و دولت کے نشہ سے مدہوش ہو کر خدائی کا دعوےٰ کیا۔ اوس کی پشت پناہی کے لئے نہ مادی ترقیاں تھیں اور روحانی قول، چونکہ یہ زعم باطل جہالت پر مبنی تھا اس لئے اس کے تار و پود فوراً بکھر گئے۔ ہر فرعون کی سرکوبی کسی موسیٰ نے کر دی اور معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ مگر یہ جذبات بالکل فنا نہ ہو سکے۔ ادعائے الوہیت نے خدا سازی کی صورت اختیار کی اور ہر شخص نے اپنا خدا

علحدہ بنالیا۔ میں بت پرستی کی تاریخ پر جہاں تک غور کرسکا ہوں، اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اس کی ابتدا انسان نے اس وقت کی جب وہ خود کو خدا ثابت کرنے سے معذور و مجبور سمجھنے لگا۔ علمارفن نے اس دور کو دور اوہام پرستی سے بھی موسوم کیا ہے۔

دوسرا دور مذہبیت کا تھا اور اس میں انسان نے روحانی ترقیوں سے خدا بننے کی خواہش کی۔ گزشتہ تجربات نے اوسکو مجبوریوں سے واقف کردیا تھا، اس لئے گو اوس نے کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا لیکن اوسکی سعی تامتر اسی طرف رہی۔ کبھی وہ کہتا کہ "ہمہ اوست" اور یہ کہکر وہ خود کو اوسکی ذات کا جزو قرار دینے کی کوشش کرتا۔ اور کبھی "انا الحق"، "قم باذنی" سے اس خواہش کو بالاعلان بھی ظاہر کردیتا۔ مگر اوس کی خواہشات کا یہ دور بھی دور اول کی طرح ناکامیاب رہا۔

تیسرا دور مادیت کا ہے، اور اس دور میں انسان اپنی مادی ترقیوں سے خدا بننے کی خواہش میں مصروف ہے، وہ چاہتا ہے کہ اوسکی موت وحیات اوس کے اختیار میں ہوجائے، اوسکی خواہش ہے کہ وہ اپنے سامان رزق پر حادی ہوجائے۔ اوس کی تمنا ہے کہ وہ مصنوعی ابر سے پانی برسائے۔ الغرض اوسکی زندگی قانون فطرت کے خلاف ایک جنگ ہوکر رہ گئی ہے۔ اوس کی ان کوششوں میں سب سے زیادہ اہم کوشش یہ ہے کہ وہ غیب پر بھی حادی ہونا چاہتا ہے، وہ ایسے آلے ایجاد کرچکا ہے جس سے وہ طوفان کی آمد کا پتہ چلا لیتا ہے، موسم کے آئندہ تغیر و تبدل کا بھی اوس کو علم ہوجاتا ہے۔ اور وہ گرمی و زلزلہ کا حال بھی بہت پہلے سے جان لیتا ہے۔

یہ تو اوسکی واقفیت انسانی زندگی کے گرد و پیش سے تھی۔ اب انسان کی خود ذات کو لیجئے۔ نجوم، جفر و رمل سے وہ ہماری آئندہ زندگی کے تفصیلی واقعات بتاتا ہے، وہ ہماری زندگی کے آئندہ اہم واقعات کے متعلق کامیاب پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ علم قیافہ سے وہ ہمارے بشرہ کو دیکھکر ہمارے اخلاق کو بتاتا ہے، ہاتھوں کی لکیروں سے ہماری گزشتہ و آئندہ زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمارے سر کی ساخت سے وہ ہماری عقل و فہم کا اندازہ کرتا ہے۔

اسی طرح اوسکی یہ کوشش بھی ہے کہ وہ ہماری تحریروں سے ہمارے خیالات وجذبات کا پتہ بتائے اس خاص صنف میں انسان نے اب تک کوئی نمایاں ترقی نہیں کی ہے۔ اور یہ بھی دیگر قیاسی فنون کی طرح تحقیق کا محتاج ہے، اسی طرح کے دیگر فنون کی طرح ایک فن یہ بھی ہے کہ انسانی تحریر دیکھ کر اس کی سیرت پر حکم لگایا جائے اور آج مغرب میں اس فن کے کاملین انسانی زندگی کی ترتیب و تدوین میں اچھا خاصہ حصہ لے رہے ہیں۔ میں نے اس مضمون کی ترتیب میں متعدد مغربی مصنفین کی گرانقدر تصنیفات سے مدد لی ہے، لیکن چونکہ اردو اور مغربی زبان کے خطوط میں نہ صرف صوری فرق ہے، بلکہ طرز تحریر بھی جدا ہے، اس لئے مجھے بیحد دقتوں کا سامنا

کرنا پڑا۔ اور کامل تین سال تک تجربہ کرنے کے بعد میں اسے رسالہ کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس رسالہ میں جو تحریر یا دستخط ہیں، وہ اس معنی میں فرضی ہیں کہ اون سے کسی خاص شخص کو تعلق نہیں۔ یہ تحریر اور دستخط صرف علمی و تحقیقی اعتبار سے درج کئے گئے ہیں۔ کسی خاص شخص کی توہین و تذلیل کبھی اس کا مقصود نہیں۔ تحریروں میں تو اخفاء نام ممکن تھا، لیکن دستخطوں میں یہ صورت ناممکن تھی، اسلئے میں نے ان کو بالکل فرضی صورتوں میں پیش کیا، کسی شخص خاص سے نہ اس کو تعلق ہے اور نہ یہ دستخط جعل و فریب کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اگر دستخط یا تحریر کسی شخص خاص سے ملتی ہوئی ہو تو مجھے امید ہے کہ وہ اوسے میری بدنیتی پر محمول نہ فرمائیں گے۔

مقدمہ

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیا کروں۔ گو مجھے آئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا، لیکن تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اودہر بالڈو کے متعدد خطوط طلبی کے آچکے۔ اگر تم کہو تو علالت کا بہانہ لکھکر ہفتہ دو ہفتہ اور رہجاؤں پیارے روڈالف! تم نے مجھے اپنا کر لیا!"

"مگر تمہاری علالت کی خبر سُن کر وہ فوراً چلا آئے گا۔ اور وہ تم کو بیمار نہ پاکر نہ صرف مشتبہ ہوگا بلکہ اوس وقت تم کو بجبر ساتھ لے جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ پھر وہ تم کو یہاں آنے کی کبھی اجازت نہ دے۔"

یہ گفتگو شہر وینس (ملک اطالیہ) کے ایک دور افتادہ قصبہ (میلان) کے معمولی پھوس کے مکان میں ہو رہی ہے شب کے بارہ بج چکے ہیں۔ سارا عالم سو رہا ہے۔ دنیا پر خاموشی طاری ہے۔ حسین **لوسیانا** کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے اور اوسکے سامنے اوسکا چچازاد بھائی **روڈالف** آتش خانہ پر جھکا ہوا کوئلہ ڈال کر آگ کو مشتعل کر رہا ہے۔

لوسی۔ "تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں چلی جاؤں" یہ کہکر وہ رونے لگی۔ **روڈالف** نے اپنے ہاتھ کے کوئلے پھینکدیے اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

روڈو۔ "نہیں میرا یہ مقصد نہیں کہ تم چلی جاؤ" یہ کہتے ہوئے اوس نے لوسی کو سینہ سے لگالیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ "میں یہ چاہتا تھا کہ تم ضرور رہو لیکن اس طرح کہ بالڈو کو ہماری محبت کا شبہ نہ ہو۔"

لوسی۔ افسوس! روڈالف، افسوس!..........."

روڈو نے لوسی کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ سوچکر اوس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

لوسی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ بالڈو میری علالت کی خبر سُن کر مجھے لینے ضرور آئے گا۔

روڈو۔ میرا یہی خیال ہے.........

لوسی۔ اور وہ تنہا آئے گا۔

روڈو۔ ہاں......... کیا اوس وقت؟

یہ کہکر روڈالف کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی اوسکی نگاہ لوسی پر پڑتی اور کبھی وہ کمرے کی ہر سمت دیکھتا۔ تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد اوس نے شمعدان ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔

لوسی۔ تو پھر کیا رائے ہے.........." دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔

گفتگو خیالات کے اظہار کا عام طریقہ ہے، لیکن بقول شریڈن ایک بھدا طریقہ ہے۔ بعض حکماء کا خیال ہے کہ انسان کا موجودہ نطق کسبی ہے فطری نہیں۔ اگر ایک تعلیم یافتہ کوئی خیال بذریعہ گویائی ظاہر کرتا ہے تو وہ صاف ہوتا ہے اور جلد سمجھ میں آجاتا ہے لیکن وہی خیال اگر کوئی جاہل بذریعہ گویائی ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ناصاف ہوتا ہے اور اوسکے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوت کسبی ہے اور تربیت کی محتاج ہے۔ اب دوسرے طریقے اظہار کے ملاحظہ ہوں۔ آپ کو خوشی ہوتی ہے تو آپ ہنستے ہیں۔ آپ کو ملال ہوتا ہے تو آپ روتے ہیں۔ آپ خشمگیں ہوتے ہیں تو آپ کے ابرو پُرشکن ہوجاتے ہیں، آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔ آپکو شرم آتی ہے تو آنکھیں جُھک جاتی ہیں۔ آپ ممنون ہوتے ہیں تو آپ کا چہرا تمتما اوٹھتا ہے اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آتے ہیں۔ آپ کچھ مانگتے ہیں تو آپ کی آنکھیں ملتجی ہوتی ہیں۔ یہ ہے وہ خاموش ذریعہ اظہار خیال کا جسے فطرت نے ودیعت کیا ہے۔ اور یہ خاموش گفتگو ایک نگاہ میں اتنی باتیں کہہ جاتی ہے جو شاید آپ اپنی زبان سے گھنٹوں میں بھی بیان نہ کرسکیں۔ نہ لوسی نے کچھ کہا اور نہ روڈالف نے۔ دونوں خاموشی سے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ خوں آشام نگاہیں کسی زبردست سازش کا پتہ دیتی تھیں۔ ولی ممکن ہے کہ ولی کو نہ پہچانے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اخلاقی مجرم اپنے ہمخیال کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ لوسی نے روڈالف کا اور روڈالف نے لوسی کا مطلب سمجھ لیا۔ لوسی دوڑ کر روڈو سے یہ کہتی ہوئی لپٹ گئی "بس روڈو۔ بس۔ میں تیرے لئے سب کچھ کرنیکو آمادہ ہوں"۔

تھوڑی دیر تک کمرہ میں خاموشی طاری تھی۔ دونوں ایک ہی خیال میں محو تھے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ لوسی کے چہرہ سے اطمینان ظاہر تھا اور روڈو متفکر و پریشان۔ بالآخر اس سکوت کو روڈو نے توڑا۔

روڈو۔ تو پھر اسی وقت خط لکھدو تاکہ صبح کسی شخص کی معرفت بھیجدیا جائے۔

لوسی۔ خط تم لکھدو، دستخط میں کردوں گی۔ اس سے مری علالت بھی قابل یقین ہوجائے گا۔

روڈو اٹھا۔ میز پر بیٹھکر ایک خط لکھا اور دستخط کے لئے لوسی کے سامنے رکھ دیا۔

روڈو۔ خط پڑھ لو۔ صحیح ہے یا نہیں۔

لوسی۔ نہیں۔ میں خط نہیں پڑھوں گی۔ میں صرف دستخط کردوں گی۔ یہ کہکر اوس نے روڈالف کے ہاتھ سے قلم لے لیا۔ اوسکا ہاتھ کانپنے لگا۔ دونوں نے ایکدوسرے کی طرف دیکھا۔

روڈو۔ ذرا دم لے لو۔ گھبراؤ نہیں۔

لوسی نے پھر لکھنا چاہا۔ اس مرتبہ بھی اوس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ روڈ د سے پانی منگا کر پینے کے بعد اوس نے سہ بارہ ہمت کی۔ اور گو اوس کا ہاتھ اب بھی مرتعش تھا لیکن اوس نے ہاتھ روک کر دستخط کر ہی دیے۔

روڈ ولف (دستخط دیکھکر) مگر اس میں کسی قدر تموج ہے۔

لوسی - "یہ بھی میری علالت کی وجہ سے ہے" یہ کہکر لوسی مصنوعی ہنسی ہنسنے لگی۔

بالڈو خط پڑھ کر بیحد پریشان ہوا۔ اوسی لوسی سے بیحد محبت تھی۔ شادی کے بعد سے اس وقت تک اوس نے لوسی کو علیحدہ ہونے نہیں دیا تھا۔ میز پر خط رکھ کر بالڈ و کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اوس نے دوبارہ پھر خط اوٹھاکر پڑھا۔ دستخط کو غور سے دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔

"ابھی دو روز ہوئے میرے پاس خط آیا تھا۔ دو روز میں اس درجہ ہاتھوں میں کمزوری نہیں آسکتی۔ مرض بھی معمولی۔ پھر یہ حروف میں تموج اور سانپ کی سی لہریں کیسی" بالڈو نے ہاتھ میں خط لے کر ٹہلنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

"کیا لوسی بیوفا نکل گئی؟ مگر پھر مجھے بلایا کیوں۔ کیا ...."

بالڈ و پروفیسر تھا اور اس پیشہ کی ساری خصوصیات اوس میں موجود تھیں۔ وہ بہت کم چیزوں کو دلچسپی سے دیکھتا۔ لیکن جب کوئی شے اوسکی توجہ منعطف کرلیتی تو وہ پھر اوس پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ لوسی کا دستخط اس وقت اوس کے پیش نظر تھا۔ خط کے متن میں اوس کو کوئی مشکوک صورت نظر نہ آتی ہے اس لئے کہ روڈالف کا خط دیکھنے کا وہ عادی نہ تھا۔ لیکن لوسی کے دستخط اوسے بیحد مشتبہ معلوم ہوئے۔ وہ پورے دو گھنٹہ تک کمرہ میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے ٹہلتا رہا۔ وہ دستخط کو بار بار دیکھتا اور خاموش ہوجاتا۔

"نہیں۔ میں کبھی نہیں تسلیم کرسکتا کہ وہ بیمار ہے۔ لوسی بیوفا نکل گئی"

انسان جبتک کسی امر کی جانب بے توجہ رہتا ہے اوسوقت تک اہم امور بھی اوس کی توجہ منعطف کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ متوجہ ہوجاتا ہے تو اوس کے خیالات زنجیر کی باریک سی باریک کڑی سامنے لاکر پیش کردیتے ہیں اور اوس کو اپنی غفلت پر حیرت ہوتی ہے۔ اب بالڈ و کی آنکھیں کھلیں۔ گذشتہ بار روڈ د کے دوران قیام میں لوسی کے ساتھ اوسکی بے تکلفی۔ گھنٹوں دونوں کا خلوت میں باتیں کرنا۔ دونوں کا تنہا چراگاہ و باغ میں ٹہلنا۔ ایک بار دونوں کا ہم آغوش ہونا۔ روڈ د کا لوسی کو ساتھ لیجانے کیلئے اصرار۔ لوسی کی جاتے وقت خوشی۔ جسوقت یہ واقعات پیش ہوتے رہے۔ اوس وقت بالڈو نے اُنھیں کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن آج یہ تسلسل ایک مستقل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ دونوں مجھے مل کر مار ڈالیں گے" "تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد" مگر آخر اون کے اس ارادہ کی تصدیق کیسے ہو؟

بالڈو نے جانے کا ارادہ کر لیا مگر اوسوقت اوس نے لکھدیا کہ وہ نہیں آسکتا۔ تیسرے دن وہ مغالطہ دے کر پہونچا۔ دونوں کو شب میں مجرمانہ بے تکلفی میں مشغول پایا۔ روڈو نے خنجر سے حملہ کیا۔ بہ مشکل بالڈو اپنی جان بچا کر بھاگا۔

اس واقعہ کے بعد بالڈو نے یہ فن ایجاد کیا۔

اس فن کی تاریخ

انسان کا ہر فعل اوسکے اخلاق و ذہنیت کا روشن آئینہ ہے، اگر وہ تصنع یا مکر وفریب سے کام نہ لے تو اوسکی زندگی کا ہر پہلو اوس کے افعال وحرکات سے نمایاں ہو سکتا ہے اور اوس کے ہر عمل سے اوس کی تربیت ذہنی کا پتہ چل سکتا ہے۔ وہ اگر متین ہے تو اوس کے ہر فعل سے سنجیدگی نمایاں ہوگی۔ اگر وہ عجلت پسند ہے تو اوس کی ہر حرکت سے جلدی مترشح ہوگی۔ اگر وہ متکبر ہے تو اوس کا ہر انداز مغرورانہ ہوگا اور اگر وہ منکسر المزاج ہے تو اوسکے ہر طرز عمل سے فروتنی ظاہر ہوگی۔

جس طرح آپ ایک شخص سے گفتگو کرکے اوس کے اخلاق واطوار کے متعلق رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح آپ تحریر سے بھی تحریر کنندہ کے خیالات و ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ تحریر "لکھی ہوئی گفتگو" کا نام ہے۔ البتہ جس طرح گفتگو میں تصنع وریا کو دخل ہے اوسی طرح تحریر بھی مصنوعی ہو سکتی ہے اور اس وقت بے شک آپ کے نتائج غلط ہوں گے۔ لیکن اگر تحریر کنندہ اپنی عادت وطرز کے مطابق لکھے تو یقیناً اوس کی تحریر اوس کی فطرت کا آئینہ ہوگی۔

کسی شخص کی تحریر سے اوسکے خیالات، اطوار، اخلاق اور ذہنیت کا پتہ چلانا ایک فن ہے۔ جسے سب سے پہلے سیوٹانیس (SUETONIUS) نے ایجاد کیا۔ شاہنشاہ آگسٹس کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

> "میں نے اوس کی تحریر میں یہ خاص بات دیکھی کہ وہ الفاظ کو جدا جدا نہیں لکھتا تھا۔ اور اگر آخر سطر میں جگہ نہیں بھی رہتی تب بھی وہ باقی الفاظ کو سطر کے نیچے لکھدیتا اور اونکے گرد ایک دائرہ کھینچ دیتا"

گو سوٹانیس کے نتائج ہم تک نہیں پہونچے ہیں، لیکن خیال ہے کہ اوس نے ان علامات سے ضرور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شہنشاہ آگسٹس کے خیالات متحد و منظم تھے۔ اور اوسکی ذہنیت میں ایک قسم کا ربط تھا۔ اوسکی شجاع طبیعت مواقع کی منتظر نہ رہتی تھی بلکہ وہ خود اسکے مواقع پیدا کر لیتا تھا۔

آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ سیوٹانیس کے بعد یہ فن مدتوں تک کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ بالآخر ایک

اطالوی پروفیسر مسمی بالڈو نے سنہ ۱۶۲۲ء میں اس فن پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ بالڈو کا خیال ہے کہ "چونکہ تحریر اک گونہ محرر کی فطرت کا آئینہ ہے۔ اس لئے اوس کے ذریعہ سے ہم اوس کے اخلاق کو دریافت کرسکتے ہیں"۔ اس کتاب نے ملک میں اک ہیجان پیدا کر دیا، مختلف و متعدد لوگوں نے اس فن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہانتک کہ سنہ ۱۶۴۲ء پٹرس ولیس (PETRUS VELLIUS) نے بالڈو کی معرکۃ الآرا تصنیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

گو ماہران فن کا خیال ہے کہ بالڈو ہی اس فن کا موجد ہے۔ لیکن اوسکی تصنیف سے قبل سروریس (SERVERINUS) بھی اس فن پر ایک کتاب لکھنے میں مشغول تھا، مگرافسوس کہ اوسکی تصنیف اوسکی زندگی میں طبع نہ ہوسکی اور وہ سنہ ۱۶۵۶ء میں انتقال کرگیا۔ ہمیں پٹرس کے ترجمہ کا ممنون ہونا چاہئیے کہ بالڈو کی تصنیف بھی ہم تک پہونچ گئی۔ کیونکہ اصلی کتاب جو اطالوی زبان میں تھی وہ ناپید ہے۔

اس کے بعد اس فن کا مطالعہ دو سو برس تک پھر معرض التوا میں رہا۔ یہانتک کہ سنہ ۱۸۷۵ء میں ایک فرانسیسی شخص ابے میچن (ABHE MICHON) نامی نے بالڈو کے ترجمہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد تو تحقیق و مطالعہ کا دروازہ یورپ کے لئے کھل گیا۔

اہل جرمنی ابے میچن کی کوششوں کے قائل تھے۔ اس لئے کہ اون کا خیال ہے کہ خود جرمنی میں گراہمن (GROHMAUN) نامی ایک عالم نے سنہ ۱۹ء میں انھیں نظریات کو پیش کیا تھا۔ اوس کا خیال ہے کہ:۔

> "علم قیافہ اور فراست التحریر میں بعید تعلق ہے۔ کیونکہ اس سے بھی انسان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم ایک شخص کی تحریر دیکھ کر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اوس کے بالوں کا رنگ کیسا ہے، اوسکی آنکھیں کیسی ہیں۔ اوس کا رنگ سیاہ ہے، سانولا ہے یا گورا، اور اوس کا قد کیسا ہے، اور اوسکی جسمانی صحت کس حالت میں ہے؟"

گراہمن غالبًا اپنے حدود سے متجاوز تھا۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں ہنزی (HENZE) نامی ایک جرمن نے ایک نہایت مبسوط کتاب اس فن پر لکھی، لیکن اوسکی ضخامت اوس کی عدم مقبولیت کا سبب ہوئی۔

گیٹے اور لوئسٹر کے خطوط اس فن پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ موخرالذکر کا خیال ہے کہ ایک شخص کی تحریر اوسکے دماغی کیفیات کا آئینہ ہوتی ہے، لوئسٹر کا یہ بھی خیال ہے کہ ہر قوم و ملک کا طرز تحریر مختلف ہوتا ہے۔

ہماری خوش قسمتی سے اڈگرالن پو (EDGAR ALLEN POE) نے اس فن پر متعدد مضامین شائع کئے۔ جن سے ہمیں بعید مدد ملتی ہے۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں ایک مستقل مدرسہ فرانس میں اس فن کی تعلیم

کے لئے قائم کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت دنیا میں جتنی کتابیں اس فن پر فرانسیسی زبان میں ملتی ہیں اوتنی کسی زبان میں نہیں ملتیں۔

متعلم کو چند مفید ہدایات

اس فن کے جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جب اس کے عام اصول ذہن نشین ہو جائیں۔ تو آپ اپنی تحریر کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ آپ کے جذبات و خیالات وغیرہ کیونکر اوس میں منعکس ہیں۔ اس زینہ کو طے کرنے کے بعد آپ اب کسی ایسے شخص کی تحریر لیں۔ جسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اوس کے خیالات و حالات کی روشنی میں آپ اوس کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی تحریر کے مطالعہ کے بعد جو نتائج آپ اخذ کر چکے ہیں۔ اونکو اس تحریر سے مطابقت دیجئے۔ اس طرح جب آپ متعدد اشخاص کی تحریر دیکھ چکیں تب کسی اجنبی کی تحریر اوٹھائیے اور اپنے گذشتہ تجربات کی روشنی میں اوس کو دیکھئے۔

یہ اون علوم میں نہیں ہے جو ہندسہ یا حساب کی طرح معین ہوں اور جن کے عام اصول سے خاص نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ علم فراست التحریر ایک قیاسی علم ہے اور اس کے اصول متعدد تحریروں کی مشترک خصوصیات کی روشنی میں مرتب ہوئے ہیں۔ ایسے علوم شخصی تجربات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ آپکا تجربہ خود آپ کی رہبری کرے گا۔ اور بعد چندے آپ اس میں مہارت تامہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کی تحریر میں بزدلی کے علامات ہیں اور آپ میں یہ نقص نہیں ہے تو فوراً آپ اس کو فن کے نقص کی دلیل نہ سمجھیں۔ اگر آپ جسمانی جرات رکھتے ہیں، تو پھر بھی یہ سوال رہجاتا ہے کہ آیا آپ اخلاقی جرات کے بھی حامل ہیں یا نہیں۔ اگر آپ میں یہ بھی موجود ہے تو پھر آپ دیکھیں کہ آیا آپ میں اعتقادی جرات کی کمی تو نہیں۔ آپ کا تجربہ آپ کو بتا دے گا کہ نقائص و محاسن کے مختلف مدارج و اقسام ہوا کرتے ہیں۔

ابتدا میں آپ کے دوست اپنی تحریر دکھا کر ایسے سوالات پوچھیں گے۔ اگر اون میں نقائص ہیں تو آپ کہتے ہوئے رُکیں گے۔ لیکن اگر آپ ایسا کریں تو یہ آپ کی اخلاقی کمزوری ہوگی۔ اگر آپ اپنے نتائج میں قطعی نہیں ہیں تب تو جواب بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بلا ضرورت کسی کو خیالی تکلیف دینی معیوب ہے۔ اگر آپ ایک شخص کے نقائص اوس سے بیان کر رہے ہیں، تو آپ کا فرض ہے کہ ہر ممکن متانت اور نرمی سے آپ اوس کو متنبہ کریں۔ آپ کی حیثیت ایک حکیم کی ہے۔ آپ کی تلخ دوائیں مریض کو ضدی بنا کر ترک دوا پر نہ مجبور کر دیں۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا ہر شخص اس فن کو سیکھ سکتا ہے؟ قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دوں۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک طبیب اپنے شاگرد کے ساتھ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ سرہانے چنے پڑے ہوئے تھے۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی حکیم صاحب نے فرمادیا کہ مریض نے کوئی ثقیل غذا مثل چنے کے کھائی ہے۔ مریض

نے اسے شرمندگی سے تسلیم کیا۔ مگر پر اصرار شاگرد نے اس غیب دانی کے اسباب دریافت کئے۔ بعد اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ سرہانے جو چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔ یہ سبق شاگرد کو یاد رہا۔ فارغ التحصیل ہو کر جب کسی مریض کو دیکھنے گئے تو ادھر ادھر بہت دیکھا۔ کوئی شئے نظر نہ آئی۔ سرہانے چارپائی کے نیچے ایک نمدہ کا ٹکڑا رکھا تھا۔ دیکھتا تھا کہ چلا اٹھے۔" تمنے نمدہ کھایا ہے"۔

بالکل یہی حال قیاسی فنون کا ہے۔" یک من علم را دہ من عقل باید" جس قدر ان علوم سے متعلق ہے اوس قدر معین علوم سے متعلق نہیں۔ یوں تو اس فن کی اصولی باتیں ایک بچہ بھی سیکھ سکتا ہے لیکن صرف اس فن میں صرف انھیں کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے جن کی مرتب ذہنیت انسانی زندگی کے گرد و پیش پر عبور کامل رکھتی ہے۔ مثلاً اگر ایسی تحریر آپ کے سامنے موجود ہے جس میں تموج ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ کاتب کی عمر ۲۵ سال کی ہے تو آپ کبھی بھی اس تموج کو رعشہ یا خامی کتابت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ماہران اخلاقیات کا جدید نظریہ یہ ہے کہ ۲۰ سے ۳۰ سال کی عمر تک مجرمانہ ذہنیت جعل و قتل میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ لازماً اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ کاتب ان عیوب میں مبتلا ہے یا اون کی جانب راغب ہے۔

اس فن پر عبور کامل حاصل کرنے کیلئے علم النفس و علم قیافہ کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ گراہین (جرمن مصنف) علم قیافہ کے مطالعہ کو زیادہ مفید قرار دیتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک علم النفس اس فن سے زیادہ متعلق ہے۔ لوئیٹر (مشہور عالم فرانسیسی فلسفی) کی رائے میری تائید کرتی ہے۔ علم قیافہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ مسئلہ اب تک ماہران فن کے درمیان مابہ النزاع ہے کہ ذہنیت کا اثر جسم کی ساخت کا ذمہ دار ہے یا جسم کی ساخت اپنے مطابق ذہنیت پیدا کر دیتی ہے لیکن علم النفس کا تعلق تو اس علم سے ظاہر ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ بغیر واقفیت علم النفس، علم فراست التحریر پر عبور ناممکن ہے۔ چونکہ انسانی تحریر اوس کے" دماغی عمل" کا پرتو ہے، اس لئے جبتک ہم موخرالذکر کو نہ معلوم کر لیں، اول الذکر پر عبور محال ہے۔

اس علم کی اہمیت یورپ میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ بعض ممالک میں تو خفیہ پولیس نے جرائم کی تحقیقات کا اس کو مفید و معین ذریعہ بنا لیا ہے۔ جیسے اطبا کا ایک گروہ" تحلیل تخیلات" کو علاج کا بہترین ذریعہ سمجھنے لگا ہے، اوس وقت سے مریضوں کی تحریر، عدالت کے بیان سے زیادہ" گویا" ثابت ہوئی ہے۔ کاروباری اشخاص امیدواروں سے ملازمت کے لئے اون کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی درخواست لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح وہ اون کے صحیح خیالات اور چال چلن سے واقف ہو سکتے ہیں۔ جعل کے دریافت

میں یہ علم سب سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ماہران تحریر صرف ظاہری صورتوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہر دو تحریروں کے کاتبوں کے اخلاقی حالات پر بھی غور کریں۔ ممکن ہے کہ میں اس نظریہ میں یکہ وتنہا ہوں۔ لیکن اس کی مزید توضیح اس مسئلہ کو حل کر دیگی۔ میرے نزدیک یہ صنف علم اس درجہ اہم ہے کہ میں نے ایک علیحدہ باب میں اس کی تفصیل ضروری سمجھی۔

عام اجتماعی زندگی میں بھی یہ علم مفید ثابت ہوا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب انسان خلوت نشیں ہوکر انفرادی زندگی بسر کردے۔ تہذیب و تمدن نے ہر ایک کو دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔ آج سب سے زیادہ مشکل انتخاب احباب ہے۔ اس فریب و خود غرضی کے زمانہ میں ہر شخص آپ کو دوست نظر آئے گا۔ لیکن معیار دوستی "دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست"۔ جو آج سے ہزار برس پہلے تھا وہ اب بھی اوسی طرح صحیح و درست ہے۔ آپ اپنے ملاقاتیوں کی تحریر کا بغور امتحان کرلیں۔ اور اگر وہ معیار اخلاق پر صحیح اُترتے ہیں۔ یا اونکے طبائع آپ کی طبیعت سے مناسبت رکھتے ہیں تو آپ اون سے راہ و رسم بڑھائیں۔ مجھے متعدد ایسے اصحاب کی تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو آج سوسائٹی کے بام رفعت پر ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے عمومًا یا تو یہ پایا کہ اون کی موجودہ زندگی کا باطن پہلو تنگ و تاریک ہے یا اگر یہ نہیں ہے تو اون میں وہ خامیاں مخفی طور پر ضرور موجود ہیں۔ جو اگر آج نہیں تو کل ظاہر ہو کر رہیں گی۔ اگر آپ کو ذاتی طور پر اس کا امتحان مقصود ہے تو آپ اون "رہنمایان قوم" کی تحریریں ملاحظہ کریں۔ جو کل بام رفعت پر تھے۔ لیکن آج زمانہ نے انھیں بے نقاب کرکے قعر مذلت میں گرا دیا ہے۔ جہاں وہ گمنامی میں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں متانت و دور اندیشی بھی آتی ہے۔ مگر آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ بسا اوقات ابتدائی زندگی کی مستحکم فطری کمزوریاں آخر زندگی تک کم و بیش نمایاں رہتی ہیں۔ میرے سامنے میری وہ تحریر موجود ہے جو میں نے آج سے پندرہ برس پہلے لکھی تھی، جب میری عمر قریب تیرہ سال کے تھی۔ گو زمانہ کے تجربات نے مجھ میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے، لیکن پھر بھی میں تو وہی ہوں۔ جذبات کا غلبہ جو مجھ پر پہلے تھا وہ اب بھی ہے۔ گو کسی قدر کمی کے ساتھ۔ میرا تجربہ ہے کہ ابتدائی زندگی کی وہ خامیاں جو مقتضائے عمر ہوتی ہیں۔ وہ تو تحریر سے آخر زندگی میں نکل جاتی ہیں لیکن دستخط میں اوس کے اثرات کم و بیش ضرور نمایاں رہجاتے ہیں، اسی لئے ماہران فن نے دستخط کو بہت اہمیت دی ہے۔

اس علم کی تحقیقات کے دوران میں مشکل ترین اوقات میرے لئے وہ تھے جب مصنوعی تحریریں میرے سامنے پیش کی گئیں۔ بعض نے دوسروں کی تحریر اپنے نام سے پیش کی۔ چند لوگوں نے حروف بدل کر تحریر لکھدی لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اون لوگوں کی تحریریں تھیں۔ جو اس علم کے ابتدائی اصول سے تھوڑی بہت واقفیت

حاصل کرکے اپنی تحریر میں اون علامات کو مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جن سے اون کے عیوب ظاہر ہو جاتے۔

اول الذکر کے متعلق رائے زنی مشکل نہ تھی، اس لئے کہ اس علم کو شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کی تحریر ہو اوسی کے حالات ظاہر ہوں گے۔ جن لوگوں نے اصول علم سے ناواقف رہ کر اپنے خطوط تبدیل کئے وہ اون نقالوں کے مانند ہیں، جو اپنی صورت بدل کر اکبر و اورنگ زیب کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اتنی بھی یہ معلوم نہیں کہ اونکی شبیہیں ناقص تھیں۔ ایسی صورت میں مصنوعی و غیر مصنوعی کا امتیاز بجد آسان تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے موخر الذکر صورتوں میں دقتیں پیدا ہوئیں۔ ابتدا مشق میں تو بالکل ناکامیاب رہا۔ لیکن بعد چندے مجھے قدرے کامیابی ہوئی۔ ایسے لوگوں سے میں صرف اس قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہر فراست التحریر پیغمبری کا مدعی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک طبیب کی مانند ہے جو مریض کے حالات کے لحاظ سے نسخہ تجویز کرتا ہے۔ بچپن میں ایک میرے ہم مکتب کو پنجشنبہ کے دن درد شکم کا دورہ شروع ہوتا تھا۔ اصل سبب یہ تھا کہ مولوی صاحب اوس دن امتحان لیتے اور بصورت ناکامیابی خوب زدوکوب کرتے۔ دنیا جانتی تھی کہ یہ صرف بہانہ ہے، لیکن کوئی بھی اس کا ثبوت نہ دے سکا۔

ایسی تحریر کے کاتب کا صرف ایک علاج ہے۔ آپ اوس سے متعدد تحریریں حاصل کریں۔ اگر وہ ابتدائی تحریر مصنوعی ہے تو وہ شخص اس "فریب" کو اپنی تمام تحریروں میں یکساں نہ ظاہر کر سکے گا۔ مختلف تحریروں کا تقابل آپ کو صحیح نتیجہ پر پہونچا دے گا۔ اس کے علاوہ میرا ایک خاص تجربہ ہے، ایسی تحریر کی ہر سطر سے چار الفاظ داہنے اور بائیں سے قلم زد کر دیجئے۔ سطر کا وسط حصہ آپ کو صحیح راستہ پر پہونچا دے گا۔ عموماً انسان مصنوعی تحریر ابتدا و انتہا سطر میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے، سطر کا درمیانی حصہ تقریباً اوس کے فریب سے محفوظ رہتا ہے۔

تحریر کے اقسام ایک اور امر قابل لحاظ ہے، جس شخص کی تحریر آپ کے سامنے موجود ہو اوس کی تین حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) محتاج مشورہ (۲) مستفسر (۳) اور ممتحن۔ یہ امور آپ زبانی گفتگو سے یا تحریر سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عموماً ممتحن طبائع فریب دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

عام علامات کو بہ غور دیکھنے کے بعد ایک ایک متعلم کا فرض ہے کہ وہ کاتب کے اخلاقی و علمی و ذہنی حالات کے اعتبار سے صحیح و مناسب جگہ تجویز کرلے۔ میرے خیال میں گو یہ ابتدائی منزل ہے، اس لئے کہ اس یقین کے بعد ساری باتیں۔ بہ طور نتیجہ لازماً نکلتی آئیں گی۔

اصولاً دنیا میں دو ہی قسم کے انسان ہیں، اعلی اور ادنی۔ متوسط طبقہ کوئی مخصوص جدا حیثیت

نہیں رکھتا۔ اوس کی خصوصیات مشترکہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اعلےٰ و ادنےٰ دونوں کے مزید تین تدریجی اقسام ہیں۔

علویت

(۱) قسم اول۔ اس صنف میں دنیا کی مخصوص ذاتیں شامل ہوسکتی ہیں۔ جن کی اخلاقی قوتیں۔ دنیا کی تاریخ بدل دیتی ہیں۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جو زمانہ کو بناتی ہیں، تیر و تفنگ سے نہیں، تلوار و خنجر سے نہیں، بلکہ صرف اپنی اخلاقی مثال سے وہ انسان کو کھینچکر اپنی سطح پر لاکھڑا کرتی ہیں، جس طرح ہم بجلی کی تحلیل سے قاصر ہیں، اوسی طرح اونکی تحلیل بھی مشکل ہے۔" ان کے کان دیکھتے ہیں۔ اون کی آنکھیں سنتی ہیں۔" اونکی دماغی و روحانی قوتیں عام انسانی سطح خیال سے بالاتر ہیں۔ وہ بام رفعت پر اوس جگہ پہونچے ہوئے ہیں۔ جہاں سے آگے "فروغ تجلی بسوزد پرم"۔ رسول و انبیا اس کی مثال ہیں۔

(۲) قسم دوم۔ اس صنف میں جو اشخاص شامل ہیں۔ جو تاریخ بدلتے نہیں، لیکن تاریخ بناتے ہیں۔ انہیں وہ الہامی قوت تو موجود نہیں ہوتی جو قسم اول کی خصوصیت ہے، لیکن ان کا ضمیر ان کے مستقبل کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ گو یہ ساری خوبیاں اکتسابی ہوتی ہیں وہبی نہیں، اونکی آنکھیں روشن ہوتی ہیں، لیکن اونکا آئینۂ دل "علم مستقبل کے لئے پرتو کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ کامل ہوتے ہیں اور اون کے اعمال و افعال کمال کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن کمال بھی وہ جو اضافی ہے۔ قسم اول کی طرح اون کی شیرینی بیانی ایسی نہیں ہوتی کہ آپ یہ کہہ سکیں

میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور نہ اونکی آواز کا "نغمۂ حق" ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے کانوں کی روئیاں نکال کر پھینک دیں اور پکار اٹھیں کہ

ہذا اسحر عظیم

مگر ہاں اونکی منطق دل کو نہیں تو کانوں کو ضرور بھلی معلوم ہوتی ہے اور دماغ ان کی "لذت تقریر" سے متاثر ہوتا ہے ٹالسٹائی اس کا صحیح مصداق ہے۔

قسم سوم۔ اس صنف میں وہ دنیا کی ذہین شخصیتیں شامل ہیں جو عقل سلیم رکھتی ہیں۔ یہ نکات پیدا نہیں کرتے۔ لیکن اون کی پرورش ضرور کرتے ہیں۔ وہ معاملات کی حقیقت سمجھتے ہیں۔ قسم دوم کی طرح اون کی عقل خود رہبری تو نہیں کرتی۔ لیکن اون کے تجربات ضرور اون کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایک ادنےٰ شخص کی طرح سانپ کے سوراخ میں دوبارہ ہاتھ نہیں ڈالتے۔"

اعلیٰ تحریر کے علامات

نمبر شمار	وصف	علامات
(۱)	صفائی دماغ	صاف و نمایاں حروف۔ حروف و سطر کے درمیان مناسب فاصلہ
(۲)	طاقت و قوت دماغی	پیوستہ تحریر، سطر ہموار۔ حروف کے معین دائرے و کشش
(۳)	قوت مطابقت	کاغذ اور جگہ کی مناسبت سے حروف و تحریر
(۴)	عقل و فراست	داہنی جانب جھکی ہوئی تحریر
(۵)	حوصلہ مندی	بلند حروف و تحریر
(۶)	خوش اخلاقی	بیضاوی تحریر
(۷)	اعلےٰ تربیت	تحریر جیسی پیشہ ور کاتب لکھتے ہیں، مگر پیشہ ور کی نہ ہو،
(۸)	مذاق سلیم	خوبصورت رواں تحریر
(۹)	خلوص و دیانت	تحریر جس کے الفاظ کے آخری حروف واضح اور نمایاں ہوں۔
(۱۰)	اعلےٰ تخیل	دستخط جس میں پورا نام واضح ہو۔

دنائت انسان کی قوتیں تقریباً نامحدود ہیں۔ "وہ عیسیٰ بھی ہو سکتا ہے اور خرِ عیسیٰ بھی"۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ علویت کی جانب تو حدود پھر بھی قدرے معین ہیں۔ لیکن اسفل کی جانب انسان کی قوتیں صرف اوس کی مرضی پر منحصر ہیں، وہ چوری کرتا ہے، وہ زنا کرتا ہے، وہ قتل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اوس سے وہ بداخلاقیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ جو جانور اور چوپایوں سے بھی ناممکن ہیں اور جنھیں بیان کرتے شرم آتی ہے۔

علویت کی طرح دنائت کے بھی کئی مدارج ہیں۔

قسم اول۔ عوام الناس۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں ہوشیار و چالاک ہیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ذمہ دارانہ فرائض کی انجام دہی بھی ان سے ممکن ہے۔ ان کے نزدیک علویت و دنائت میں کوئی امتیاز نہیں۔ انکا معیار زندگی بھی معمولی ہوتا ہے۔

قسم دوم۔ انسانی زندگی کا ہر پہلو ایک معمہ ہے۔ جس کا حل خود اس کے ہاتھوں میں ہے اور اسی حل

میں اُس کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ ایک دہقانی جاہل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے گی اگر آسمان ٹوٹ کر زمین پر آجائے۔ سیارے متصادم ہوں۔ زمین زلزلوں سے تباہ و برباد ہو جائے۔ جب تک اوس کا ذریعۂ معاش درست و مناسب ہے اوس وقت تک اوس کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اوس جانب متوجہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اوس کے معمولات (محنت و مزدوری۔ کھانا۔ اور سونا۔) میں اگر فرق نہیں آتا تو اوسے مطلب نہیں۔ اگر ملک میں برطانیہ کی حکومت رہے یا سوراج قائم ہو۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ خوش بھی ہے۔ اوسنے کچھ رقم پس انداز بھی کرلی ہے۔ جو کبھی بھی بصورت قحط کافی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اوس کی "حساب داں ذہنیت" اوسے کو کافی سے زیادہ سمجھتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ترقی کسے کہتے ہیں۔ اوس نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ جارج ایلیٹ (مشہور انگریزی ناول نویس) کا بیان ہے کہ اوس نے ایک بار ایک غریب جان بلب ہمسایہ سے پوچھا کہ "کیا تم کوئی ایسی میٹھی دوا پینا چاہتے ہو۔ جس سے تمہاری تکلیف میں سکون ہو" اوس کا جواب تھا "دوا۔ اور میٹھی۔ میری زبان کیا مرے کان بھی اس سے آشنا نہیں۔ نہیں۔ تم مجھے دوا نہ دوگے۔ تم غلط کہتے ہو۔ آخری وقت میں تم ایک موہوم شے کی حرص پیدا کرکے میری تکلیف کو بڑھا رہے ہو۔"

آپ کو حیرت ہوگی کہ ایسے لوگ خوشی سے زندہ ہیں اور خوشی سے مرتے ہیں۔ اونکی زندگی معین معمولات پر مشتمل ہے۔ ہمسایہ سے جنگ، اعزا و اقارب سے جدل۔ بی بی کو تنبیہ یہ واقعات دوسروں کے لئے خلاف معمول ہوں، لیکن اون کے لئے یہ بھی معلومات میں داخل ہے اس فن کے اعتبار سے ایسوں کی زندگی صفر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ نفسیات کا متعلم ممکن ہے کہ اون کی ظاہری صورتوں سے فریب میں آجائے لیکن ہم کبھی ان سے دہوکا نہیں کھا سکتے۔ دنیا کے نزدیک اونکی خاموشی فراست کی دلیل ہے، ایک عالم ہے کہ اون کی کم ہمتی کو احتیاط سے تعبیر کرتا ہے۔ چونکہ اون سے کوئی کام خلاف امید سرزد نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ اون کو صاحب عقل بتاتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے لئے پارینہ امثلہ کو سند میں بھی پیش کرسکتے ہیں۔ گو ہم آپ اون کو جانور سے بھی بدتر سمجھکر نظرانداز کردیں۔ لیکن دنیا اون کو فراست و دانائی کا مجسمہ سمجھتی ہے۔ یہ ہے دنائت کی دوسری صنف۔

قسم سوم۔ یہ دنیا کی بدترین مخلوق ہے "یقولون مالا تفعلون" ان کا اصول عمل ہے، سوسائٹی ممکن ہے کہ سفید پوش و غیر سفید پوش میں تفریق کرکے اول الذکر کی وجاہت سے مرعوب ہو جائے۔ لیکن عالم اخلاق دونوں کو برابر سمجھتا ہے بلکہ اول الذکر کو اجتماعی زندگی کے لئے زہر قاتل جانتا ہے، ایک چور سے آپ اپنا مال و اسباب محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ریاکار سے حفاظت مشکل ہے۔ یہ شیطان صفت گروہ

دنیا کی بدترین معصیت کا مرتکب ہو سکتا ہے، اوس کی زندگی بدکاریوں کا ناتمناہی سلسلہ ہے اور اوسکی حیات ظاہری ایک زبردست فریب۔

ادنےٰ تحریر کی علامات

نمبر شمار	عیوب	علامات
(۱)	بدمذاقی	بھدی تحریر۔ مصنوعی کشش و دائرے
(۲)	نفسانیت	بلند تحریر۔ (ادنیٰ قسم) جس میں مصنوعی ارتعاش ہو۔
(۳)	حمق و ابلہی	جامد و ساکن۔ تحریر کثرت سے زاویہ دار حروف۔
(۴)	پریشانیٔ خیال	منتشر تحریر
(۵)	خودغرضی	طویل تحریر
(۶)	خباثت	تنگ تحریر
(۷)	جہل	ناہموار تحریر
(۸)	کاہلی	پست تحریر
(۹)	مجرمانہ ذہنیت	تحریر جس کے حروف پتلے ہوں۔
(۱۰)	ضد۔ فضول گوئی۔	موٹی تحریر

آپ سے یہ پوشیدہ نہیں کہ دنیا میں عیوب و محاسن کے اقسام ہیں۔ کبھی ایک ہی صفت یا عیب اخلاق پر موثر ہوتا ہے۔ اور کبھی متعدد عیوب اور متعدد محاسن یا متعدد محاسن و عیوب کا اجتماع ایک نیا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہ علم النفس کے حدود میں ہے مگر چونکہ اس علم سے بھی ہم کو اس وقت تعلق ہے۔ اس لئے فراست التحریر کے متعلم کا فرض ہے کہ وہ ان اجتماع کے اثرات کی صحیح تحلیل پیش کرے۔ یہی وہ تحلیل ہے جس کے نتائج کاتب کے مستقبل کا پتہ بتا سکیں گے۔ بہ طور مثال میں چند ایسی اجتماعی کیفیات کا اثر بیان کروں گا، مثلاً

(۱) عقل۔ ہمت۔ محنت کا اجتماع "کامیابی" ہوتا ہے۔

(۲)	عقل۔ ہمت	کا اجتماع	جوش۔	اگر اس جوش کا مصرف خراب رہا تو ناکامی۔
(۳)	فراست۔ تخئیل	"	شاعری۔	
(۴)	غرور۔ جہل	"	ناکامیابی۔	
(۵)	خودغرضی۔ ہوشیاری	"	خباثت۔	
(۶)	تخئیل۔ خوش اعتقادی	"	توہم پرستی۔	
(۷)	تخئیل۔ اخلاقی جرات۔ استقلال	"	بدیر کامیاب کرتا ہے۔	
(۸)	کمزور اخلاق۔ دماغی مطابقت	"	فریب	
(۹)	فضول گوئی۔ جہل	"	کاہلی	
(۱۰)	عقل۔ تخئیل	"	مآل اندیشی	
(۱۱)	ضد۔ جہالت۔ بیکاری	"	بداطواری	
(۱۲)	حرص۔ جھوٹ۔ خودغرضی	"	چوری و خیانت کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے۔	
(۱۳)	لاپرواہی۔ کاہلی	"	گندگی	
(۱۴)	حرص۔ ہمت	"	ظلم	
(۱۵)	خودداری۔ جہالت	"	غرور	
(۱۶)	علم۔ احساس ذرالطف	"	عمل	

اسی طرح آپ تمامی اوصاف و عیوب کے اجتماعی اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اخذ نتیجہ کے وقت یہ امر ملحوظ رہے کہ جو صفت یا عیب قوی الاثر ہوگا۔ اوس کا اثر غالب رہے گا۔ عقل و تخئیل میں اگر عقل غالب رہی تو مآل اندیشی ہے اور اگر تخئیل غالب رہی تو ناقابل عمل نظریات کی تخلیق کے سوا دماغ کا اور کوئی کام نہوگا۔

علم فراست التحریر

" لکھنے والے! کیا یہ تجھے معلوم نہیں کہ تیری تحریر کی زندگی تیری زندگی سے زیادہ ہے"
" تو مرجائے گا، لیکن تیری تحریر کی روشنی میں اہل نظر تیرے محاسن و معائب دیکھینگے "

(جان ٹرنر)

باب اول

فن کا مفید پہلو

میں نے اپنا کافی وقت اس فن کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور انگریزی زبان میں جتنی بھی کتابیں مجھے دستیاب ہو سکیں۔ میں نے اون کا بغور مطالعہ کیا۔ بقول الن پو میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ:۔

"انسان کے کسی واحد فعل یا ترک فعل سے آپ اوس کے خیالات، اخلاق، ذہنیت، نقائص و محاسن کا صحیح پتہ نہیں چلا سکتے۔ لیکن اگر کوئی واحد فعل ایسا ہے۔ جس سے آپ بہت کچھ مفید نتائج اس کے متعلق اخذ کر سکتے ہیں، تو وہ اوس کی تحریر ہے۔"

تحریر انسان کی کیفیات دماغی کا آئینہ ہے۔ اوس کے معائب و محاسن اوس سے مترشح ہوتے ہیں۔ علم قیافہ کے احکام غلط ہو سکتے ہیں، چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر کی شکل و صورت اصول قیافہ کی عدم تکمیل کا کافی ثبوت ہے۔ اسی طرح آپ کے ہاتھ کی لکیریں غلط پتہ دیتی ہیں۔ چنانچہ بجرا جیت کے ہاتھ کے نشانات اس فن کے نقص پر دال ہیں۔ لیکن آپ کی تحریر آپ کے خصائل کی صحیح ترجمان ہے۔ کیوں، صرف اس لئے کہ وہ آپ کا عمل ہے، اور آپ کا ہر عمل آپ کی آیندہ زندگی کی ترتیب و تدوین میں ایک اہم حصہ لیتا ہے۔

بہ طور مثال آپ یوں ملاحظہ فرمائیں کہ اگر ایک شخص صاف و عمدہ کاغذ پر لکھتا ہے، اوس کے الفاظ واضح و نمایاں ہیں۔ حروف کی کشش صحیح و درست ہے، مناسب و ضروری حروف پر نقطے بھی لگے ہوئے ہیں۔ تو آپ یقین کر لیں کہ وہ شخص صفائی پسند ہے، وہ ہر کام کو مکمل طور پر کرنے کا عادی ہے، اوسکے خیالات پریشاں نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے اگر کاغذ گندہ ہے جس پر ادھر ادھر سیاہی کے دھبے ہیں۔ حروف کی کشش غیر مکمل ہے، الفاظ جا بجا قلمزد ہیں۔ ضروری نقطے غائب ہیں۔ جا بجا "کہ" "ہے" "نہیں" وغیرہ ایسے معمولی لیکن سیاق و سباق کے لئے ضروری الفاظ چھوٹے ہوئے ہیں تو آپ سمجھ لیں کہ اوس کا لکھنے والا، گندگی پسند، عجلت پسند، غیر مستقل اور غیر مرتب ذہنیت کا شخص ہے۔

بعض معترضین کا خیال ہے کہ ایک شخص کی تحریر عمر کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے اوس سے کوئی مستقل نتیجہ برآمد نہیں کیا جاسکتا۔ نیول (NEWELL) کی رائے ہے کہ یہ اعتراض خود ہمارے دعوے کو ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خیالات واطوار میں بھی تو تبدیلیاں پیدا ہوا کرتی ہیں، اسلئے تحریر میں اون خصوصیات کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ نیول کے اس قول سے میں یہ اخذ کرسکا ہوں کہ صرف کسی کی تحریر محض تحریر کنندہ کے اون دماغی کیفیات کو بتا سکتی ہے جو بوقت تحریر موجود تھے، لیکن اگر وہ تحریر اون اوقات کی ہے جس وقت لکھنے والا اپنے طبعی خیالات وجذبات کا حامل تھا تو بیشک وہ اوس کے مستقل اخلاق کا پتہ دے سکتی ہے۔ اسی لئے خطوط سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ اکثر صحیح نہیں ہوتے اگر آپ اپنے دوست کو خط لکھ رہے ہیں تو آپ کا طرز تحریر نہایت سلیم ہوگا، لیکن اگر آپ کسی دشمن کو خط لکھ رہے ہیں تو کہیں آپ کی تحریر سے خشونت نمایاں ہوگی اور اگر آپ نے جذبات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تو کہیں مکر وفریب کا اظہار ہوگا۔

جذبات کے علاوہ لکھنے والے کی عمر کا بھی اوس کی تحریر پر اثر ہوتا ہے۔ اگر وہی تحریر ایک بچہ کی لکھی ہوئی ہے تو آپ اوسے معمولی خامی سمجھیں گے لیکن اگر ایک معمر شخص بچوں کی سی تحریر لکھتا ہے تو اوس کے یہ معنی ہیں کہ اوس کے خیالات وتربیت میں معتد بہ خامیاں موجود ہیں۔

تیسرا اثر تحریر پر لکھنے والے کے پیشہ کا پڑتا ہے۔ ایک دفتر کا کلرک معمولی لیکن صاف لکھنے کی کوشش کرے گا۔ اول تو یہ اوس کے پیشہ کی خصوصیت ہے، دوسرے یہ کہ اوس کے حوصلے، اوس کی ہمت اور اوس کی عقل نہایت درجہ محدود ہے، دفتر اوس کی دنیا ہے، اور دنیا اوس کا دفتر ہے۔ میں نے ایک دفتر کے کلرک کو نیند میں انگلیوں کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے کہ وہ بہت خوشخط حساب لکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ برخلاف اس کے ایک باہمت اور حوصلہ مند شخص جو کسی معزز پیشہ میں ہو اور جس کے سامنے ترقی کی بیشمار راہیں کھلی ہوں وہ کبھی بھی خوشخطی کی پرواہ نہیں کرے گا۔ اوس کے حوصلے، تحریر میں ایک روانی پیدا کردیں گے۔ اوس کی ہمت اوس کے خطوط کو پیوست کردے گی۔ اور اوس کی ترقی کی امیدیں اظہار خیال کے لئے کاغذ کی وسعت وعدم وسعت کو نظر انداز کردے گی۔ عقلائے زمانہ کی خصوصیت خاموشی رہی ہو زبانیں گو اون کی خاموش رہیں، لیکن اون کے "خیالات خاموش" ہمیشہ گویا رہے۔ رسول اکرم صلعم کے متعلق کارلایل نے جو لکھا ہے "کہ اون کے کان دیکھتے تھے اور آنکھیں سنتی تھیں" اس کے معنی بالکل یہی ہیں ہم آپ گفتگو میں وہ اثر نہیں پیدا کرسکتے جو خاموش امرسن (EMERSON) نے اپنی تحریر میں پیدا کردیا ہے۔ فطرت کا اصول ہے کہ غیر مستعملہ طاقت وقوت اپنے اظہار کے دوسرے راستے اختیار کرتی ہو۔

چونکہ گفتگو اور تحریر اظہار خیال کے دو طریقے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی ایک قوت غیر مستعمل رہی تو دوسری قوت یقیناً ترقی پذیر ہو جائیگی۔

قومیت کا بھی ایک نہایت لطیف اثر تحریر پر پڑتا ہے۔ یہ اثر بھی اپنے ساتھ ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے جو کسی قدر غائر مطالعہ کا محتاج ہے۔ یہ بحث بھی نہایت لطیف ہے اور امید ہے کہ آپ میری تحقیق کی تائید فرمائیں گے۔ ابتداءً انسان اپنے خیالات محض گفتگو سے ظاہر کرتا تھا" گویائی اظہار خیالات کا فطری طریقہ ہے" تمدن کے نشوونما کے ساتھ ساتھ طرز تحریر کی ایجاد ہوئی۔ حروف کی ابتداء تصویر سے ہوئی۔ جس چیز کو انسان تحریر میں لانا چاہتا اوس کا نقشہ کھینچ دیتا۔ چینی تمدن دنیا کا قدیم ترین تمدن ہے چنانچہ اس نظریہ کی تائید چینی حروف سے ہوتی ہے۔

	قدیم طرز تحریر	معنی	موجودہ طرز تحریر
(۱)	⊙	آفتاب	日
(۲)		پہاڑ	山
(۳)		چڑیا	鳥
(۴)		دروازہ	門
(۵)		اوپر	上
(۶)		نیچے	下

مذکورہ بالا مثالوں سے شاید آپ میرے دعوے کی تائید میں کافی ثبوت پاسکیں۔ اسی طرح آپ دوسری زبانوں کے حروف کے متعلق نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ چونکہ دوسری زبانوں کے ارتقائی مدارج ہمارے پیش نظر نہیں اس لئے ہم چینی خطوط کی سی طرح اون میں پیش تو نہیں کر سکتے۔ لیکن مذکورہ بالا بحث اور ثبوت کے بعد ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے حروف بھی اسی طرح وجود میں آئے ہوں گے۔

مذکورہ بالا نظریہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اب آپ دوسرے امر پر غور فرمائیں۔

ہر ملک و قوم کے ابتدائی حروف و تحریر یقیناً اوس ملک و قوم کے ماحول سے متاثر ہو کر مرتب ہوئے

ہوں گے۔ اب آپ اوپر کے نقشہ میں نمبر ۴ کو ملاحظہ کریں جس سے آپ بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس وقت یہ تصویری لفظ اختراع ہوئی۔ اوس وقت چین میں دروازے اسی صورت کے رہے ہوں گے۔ گو امتداد زمانہ نے مختلف اثرات کی باعث اوس کی موجودہ شکل ضرور تبدیل کردی ہے۔ اسی طرح اور زبانوں کا یہی حال رہا۔ اور اون میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن اگر ہمارے سامنے اون کے ابتدائی حروف موجود ہوں تو ہم بآسانی درمیانی مدارج کی توجیہ اون کے ماحول کی روشنی میں کرسکتے ہیں۔

ان دو قضیوں کو سامنے رکھنے کے بعد آپ بآسانی اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہر زبان کا طرز تحریر اہل زبان کے ماحول و گردوپیش کی کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ کسی زبان کی فطری آواز اہل زبان کے قومی کیرکٹر کا پتہ دیتی ہے۔ یعنی بر طرف، محض الفاظ کی آواز آپ کو اہل زبان کی سیرت کا راز بتا دے گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس زبان کا یہ شعر ہے۔

نازکاں را چو غم حال گرفتاراں نیست
سارباناں مددے۔ ناخوش و آساں بردم (حافظ)

. . . . . . اوس زبان کے حامل آرام طلب، سہولت پسند نہیں ہوئے۔ الفاظ کی موسیقی بتا رہی ہے کہ ملک کی آب و ہوا خوش گوار ہے۔ بہرحال تحریر پر قومیت کے اعتبار سے دو اثر پڑ سکتے ہیں۔ ایک تو وہ قدیم تمدن جس نے ہزارہا سال کی کشمکش کے بعد نفس زبان (تحریری) کو مرتب کیا ہے۔ اور دوسرا اثر خود اوس لکھنے والے کا ہوگا۔ جس میں قومی خصائل موجود ہوں گے۔ شاید میرا مفہوم کسی قدر مزید توضیح کا محتاج ہے۔ بہ طور مثال آپکے سامنے اگر اردو کی تحریر کسی ہندی مسلمان کی لکھی ہوئی موجود ہو تو آپ کو ایک طرف خود زبان اردو کی خطی تدریجی تاریخ پر غور کرنا ہوگا اور دوسری طرف پہلے تو ایک مسلمان کی ذہنیت کا اندازہ کرنا ہوگا۔ پھر اوس کے بعد بھی دیکھنا ہوگا کہ اس ملک کے اختلاط نے اوس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کردی ہیں۔ اس قدر تحلیل کے بعد کہیں آپ اس وقت کو حل کرسکیں گے۔ ماہران فن نے صرف اسی قدر لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ قومیت کا اثر تحریر میں نمایاں ہوتا ہے لیکن افسوس کہ اتنی بھی توضیح جس قدر میں نے کی ہے کسی کتاب میں نہ مل سکی۔ میں نے حتی المقدور اسے واضح کرنیکی کوشش کی ہے۔

عمر، پیشہ، اور قومیت کے اثرات کی وضاحت ہوچکی، لیکن محض یہ کافی نہیں ہیں۔ چوتھی لیکن آخری واہم ضرورت لکھنے والے کے نام کی ہے۔ یہ بحث کا ٹکڑا اس درجہ تفصیل و بحث کا محتاج ہے کہ اس پر خود ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر موجودہ بحث کے لحاظ سے جس قدر وضاحت ضروری ہے اسکو پیش کرتا ہوں۔ مغربی مصنفین کی جتنی بھی کتابیں میری نظر سے گذریں کسی میں میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ لکھنے والے

کا نام جاننا ضروری سمجھتے ہوں۔ بلکہ میں نے کہیں اس کا ذکر بھی نہیں دیکھا۔لیکن یہ میرا خود خیال ہے کہ عمر، پیشہ اور قومیت سے زیادہ لکھنے والے کا نام جاننا ضروری ہے۔

مغربی عقلاء اب تک نام کے اثرات کے قائل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب تک اونھوں نے اس صنف علم پر کوئی توجہ نہیں کی۔لیکن مشرق میں صرف نام سے موسوم کے خصائل و عادات اور عمر وغیرہ دریافت کرنا ایک فن ہے۔میں نے اپنے ایک عربی داں دوست کے پاس ایک مبسوط قلمی کتاب عربی زبان میں اس فن پر دیکھی ہے سر نامہ چونکہ غائب تھا اس لئے مصنف اور کتاب کا نام معلوم نہ ہو سکا[۵]۔ فاضل مصنف نے پہلے تو احادیث سے استدلال کیا ہے، بعد ازاں فلسفہ و نجوم سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر نام اپنے ساتھ اثرات رکھتا ہو بقول فاضل مصنف اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کا نام یوسف ہو وہ نہایت حسین ہو۔یا جس کا نام فاطمہ ہو وہ خوش اخلاق ہی ہو۔انسان کا خاندان، اوس کا ابائی، یا ذاتی پیشہ۔اوس کی تعلیم و تربیت یہ سب اپنی اپنی جگہ پر موثر ہوتے ہیں۔لیکن اگر تمامی بیرونی و اندرونی اثرات کی تحلیل کی جائے اور بعد تحلیل سب اثرات جدا کردئے جائیں تو نام کا اثر باقی رہ جاتا ہے جو عموماً نا قابل نظر انداز ہوتا ہے۔

(بہ طور تلخیص ماسبق) آپ کے سامنے نہ صرف میں اس فن کی اہمیت پیش کرسکا۔بلکہ میں نے یہ بھی عرض کردیا کہ اگر آپ کسی کی تحریر سے اوس کے اخلاق، عادات، کمزوریاں، معائب و محاسن جاننا چاہتے ہیں۔ تو آپ کو لکھنے والے کا (۱) نام (۲) عمر (بوقت تحریر) (۳) پیشہ (۴) قومیت معلوم کرنا چاہیئے۔ اگر مسلسل تحریر کے علاوہ کاتب کے دستخط بھی مہیا ہوسکیں تو بہتر ہے۔ اس لئے کہ عموماً دستخط کنندہ کے خیالات کا اندازہ اوسکے دستخط سے بھی ہوتا ہے۔عموماً دستخط کا مقصد نام کا اختصار ہوتا ہے۔جس سے کاتب کی شخصیت کا صحیح پتہ چلے، سیدھی، سادی تحریر میں جعل ممکن ہے۔اس لئے کبھی دستخط کا یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ دستخط کی نقل اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے۔

نپولین اعظم کے دستخط مشہور ہیں۔ سنہ ۱۷۹۵ء تک (عروج شہنشاہیت سے قبل) اوس کے دستخط سے ہمت، حوصلہ مندی، فراست اور اعتماد نفس مترشح تھا۔ اوس کی طاقت میں جب ترقی ہوئی تو اوس کا دستخط مختصر ہونے لگا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں وہ صرف "نپولین" لکھتا۔ اوس کے دستخط کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کبھی اوس کے دو دستخط یکساں نہ ہوتے۔اس سے اس کی ظاہرا تلون پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے

---
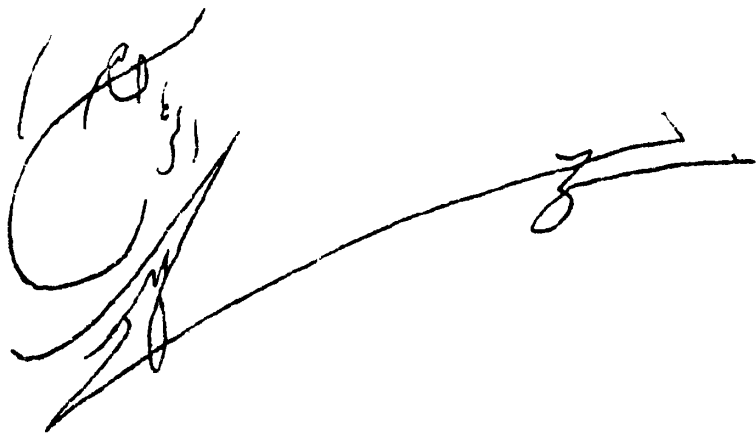
[۵] مجھے نہایت درجہ افسوس ہے کہ میں اوس وقت اس کتاب کو حاصل نہ کر سکا۔ بعد میں دریافت سے معلوم ہوا کہ مالک کتاب کی ناقدری نے اوسے کیڑوں کی نذر کردیا۔

دستخط کے تحت میں ایک خط ضرور کھینچ دیتا۔ دوران جنگ میں جو دستخط ہوتے اوس کے تحت کی لکیریں موٹی ہوتیں جس سے اوس کی درشتیٔ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ اسٹرلٹز کی نمایاں فتح کے بعد اوس کے دستخط کا آخری حرف (N) سطر سے بہت بلندی پر پہونچ جاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اوس کا ستارہ انتہائی عروج پر تھا اور اوسکی حوصلہ مند طبیعت دنیا کو فتح کرنا چاہتی تھی۔

واٹرلو کی شکست کے بعد اوس کے دستخط بالکل بدل گئے۔ نہ وہ روانی تھی اور نہ حروف کی پیوستگی دستخط کے نیچے کی لکیر میں بھی وہ "اوج پسند کشش" نہ تھی۔ چونکہ آخر وقت تک وہ اس فکر میں رہا کہ قید سے آزاد ہوکر پھر حکومت حاصل کرلے اس لئے اوس کے دستخط کے تحت میں آپ کو ہمیشہ لکیریں ملیں گی۔ لیکن یہ وہ خط نہ تھے جن سے عزم و حوصلہ نمایاں ہو بلکہ اون سے ایک گونہ ضد اور کشمکش کا پتہ چلتا تھا۔

نیول کی رائے ہے کہ اگر دستخط بقیہ تحریر سے نمایاں اور وسیع تر ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ "دستخط کنندہ کو اپنی رائے پر بہت اعتماد ہے اور دوسروں کی رائے کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔" وہ حوصلہ مند ہے لیکن عجلت پسند۔ وہ بہادر ہے لیکن غیر مستقل مزاج۔ خوش قسمتی سے ہمارے سامنے امان اللہ خاں سابق امیر افغانستان کے دستخط موجود ہیں، جس سے اس نظریہ کی مکمل تائید ہوتی ہے۔ امیر موصوف کے کیرکٹر پر یہاں بحث کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ لیکن اون کا گذشتہ انقلاب افغانستان کے ماقبل و مابعد کا طرز عمل میرے دعوے کی بین دلیل ہے۔

باب دوم

اندرونی کیفیات کا اثر تحریر پر

میں نے آپ کے سامنے ایک مختصر خاکہ اس فن کے اُصول کا پیش کر دیا۔ لیکن ابتک میں نے زیادہ تر بیرونی اثرات سے بحث کی۔ مثلاً نام۔ عمر۔ پیشہ اور قومیت۔ مگر اب میں خود تحریر کی خصوصیات سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

مذکورہ بالا امور کے دریافت کے بعد متعلم کا فرض ہے کہ وہ نفس تحریر کا بغور مطالعہ کرے۔ انسان کی طرح اوس کی تحریریں بھی تین اقسام کی ہوتی ہیں۔

(۱) اعلےٰ (۲) اوسط (۳) ادنےٰ [1]

اعلےٰ تحریر کی شناخت نہایت آسان ہے۔ خط میں صفائی۔ تحریر میں روانی۔ حروف میں پیوستگی الفاظ کا مناسب اتحاد۔ جا بجا خوب صورت دائرے۔ سطر برابر۔ مناسب جگہوں پر نقطے۔ بین السطور صاف دیکھیاں عبارت یا الفاظ شاذ و نادر قلمزدہ۔ ترمیمات واضح۔ خود تحریر پکار اوٹھے گی کہ یہ اعلےٰ کیرکٹر کا آئینہ ہے۔

معمولی تحریر کی شناخت بھی مشکل نہیں۔ کبھی تو خیالات کی پریشانی کا اظہار خطوط و سطر کی پریشانی میں نمایاں ہوتا ہے۔ کبھی اوس کی تحریر بالکل ایک کلرک کی تحریر کی طرح "خاموش اور مردہ" ہوتی ہے گو صاف ہوتی ہے۔ لیکن وہ صفائی بجائے دلپذیر ہونے کے "ویرانی" ظاہر کرتی ہے۔ اعلےٰ تحریر کی صفائی کی مثال اوس چمن کی روشنی کی ہے جس پر سبزے اُگے ہوئے ہیں۔ لیکن گرد و غبار و کثافت کا نام نہیں۔ متوسط تحریر کی صفائی اوس ویران لیکن صاف میدان کی سی ہے۔ جہاں سبزہ کا نام نہیں۔ اس نوعیت کی تحریر کے متعلق میں صرف یہ رائے قائم کر سکا ہوں کہ اعلےٰ و ادنےٰ تحریرات کے علاوہ جو تحریر ہو وہ متوسط ہے، معمولی تحریر اوس معمولی انسان کی مانند ہے جس میں اگر وس خوبیاں ہیں تو دس عیوب بھی موجود ہیں۔

---

[1] دراصل تقسیم ادنےٰ و اعلےٰ ہی ہے۔ درجہ اوسط دونوں کا امتزاج ہے۔ اسکی مفصل تشریح آیندہ ملاحظہ ہو۔

ادنےٰ تحریر کی شناخت گو آسان ہے، لیکن غائر مطالعہ کی محتاج ہے۔ حروف غیر مکمل کشش ودائرے بے ربط، الفاظ پریشان، ہر نقطہ دار حرف پر نقطہ دینے کی کامیاب وناکامیاب کوشش۔ سیاہی کی غیر موجودگی کے باعث جابجا غیر نمایاں حروف ودائرے، کہیں کشش ودائرے میں اختراع بھی کی تو نہایت بدنما سطر کج۔ تحریر میں آورد۔ یہ سب ادنےٰ تحریر کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ادنےٰ واعلےٰ تحریر سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہر خوش خط تحریر اعلےٰ ہے اور ہر بد خط ادنےٰ، کبھی حالت بالکل اس کے برعکس ہو جاتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بد باطن عموماً صاف لکھنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے کہ اسکی زود پسند طبیعت اُسے ریا پر مجبور کرتی ہے۔

میرا یہ قطعی خیال ہے کہ ایک فریب پسند شخص غلط لفظ یا حرف کو قلمزد کرکے کبھی صحیح لفظ یا حرف علیحدہ نمایاں جگہ نہیں لکھے گا۔ بلکہ ہمیشہ اوسی غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کرے گا۔ عبارت کی ترمیم وتنسیخ بھی اپنے ساتھ خاص معنی رکھتی ہے۔ اگر غلطی اس طرح قلمزد کی گئی ہے کہ پڑھی نہ جائے تو سمجھ لیجئے کہ لکھنے والا صاحب شرم ہے اور اپنی غلطی کو دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا۔ اور اگر عبارت اس طور پر قلمزد ہے کہ آپ اوسے بآسانی پڑھ سکتے ہیں۔ تب یہ کاتب کی "استغنا رازداری" پر دال ہے۔ ایسا شخص کسی کا رازدار نہیں ہو سکتا۔ متعدد جگہ قلمزدہ عبارت والفاظ کاتب کی پریشانی دماغ ظاہر کرتے ہیں۔ قلمزدہ الفاظ وعبارت کے اوپر اگر ترمیم شدہ عبارت والفاظ موجود ہیں تو اس سے حوصلہ مندی ظاہر ہوتی ہے اور اگر اسی سطر میں ہے تو وہ معمولی ذہنیت کا شخص ہے، اور اگر زیرین سطر ہے تو اس سے کاتب کی دنائت ظاہر ہوتی ہے۔

عام علامات میں تحریر کی نشست وصفائی بھی قابل لحاظ ہے۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں کہ صفائی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک میدان وریگستان کی اور دوسرے سبزہ زار کی۔ اول الذکر متوسط یا ادنےٰ ذہنیت کی علامت ہے اور موخر الذکر اعلےٰ تخیل کی نشانی۔ دونوں میں امتیاز کرنا، تجربہ اور حسن نظر پر منحصر ہے۔ بہر نوع چند ظاہری علامتیں بھی ہیں جن سے آپ تفریق کر سکتے ہیں۔ اگر صفائی بالقصد ہے اور تحریر میں تصنع ہے تو اس سے کاتب کی ریاکارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا شخص موجد شاعر۔ یا فنون لطیفہ کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ اگر صفائی میں "آمد" ہے اور تحریر میں روانی ویکسانیت ہے تو اس سے کاتب کا عزم۔ ہمت اور فنون لطیفہ سے اشتیاق ظاہر ہوتا ہے۔ حروف کا تناسب اور پیوستگی اعلا تخیل کی علامت ہے۔ آپ ذیل کا دستخط بغور ملاحظہ فرمائیں۔ تو آپ کو میرے دعوے کی تائید میں کافی ثبوت ملیں گے۔ صاحب دستخط کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔

محمد اقبال

باب سوم

مخصوص علامات

کسی تحریر کی عام خصوصیات دریافت کرنیکے بعد، متعلم کا فرض ہے کہ اپنے نتائج کو مخصوص علامات کی روشنی میں دیکھے۔ عام علامات میں اکثر غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے جب تک مخصوص علامات بھی پیش نظر نہ رہیں اوس وقت تک صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عموماً انسان داہنے ہاتھ سے لکھتا ہے اس لئے کسی زبان کے حروف ہوں وہ عموماً داہنے جانب جھکے ہوئے ہوں گے۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ عموماً یہ جھکاؤ ۴۵ ڈگری کا ہوتا ہے۔ ایسی تحریر کا کاتب سلامت روی کو بہتر سمجھتا ہے۔ وہ خطرات سے پرہیز کرتا ہے۔ اگر ۴۵ ڈگری سے زیادہ جھکاؤ داہنی جانب ہو، تو کاتب ذکی الحس ہے۔ اگر ایسی تحریر عورت کی ہے تو وہ اختناق الرحم میں مبتلا ہے۔ اگر جھکاؤ بالکل سطر سے ملا ہوا ہے تو اوس صورت میں کاتب یا تو غیر معمولی طور پر ذہین ہے یا مجنوں۔ وہ تحریر جو بائیں جانب کو جھکی ہوئی ہو اوس کا کاتب مشتبہ چال چلن کا شخص ہوگا۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایسی تحریر کے کاتب خواہ کتنے ہی نیک نفس ہوں لیکن اون کی اندرونی زندگی میں کوئی نہ کوئی زبردست خامی ضرور موجود ہو گی۔ ایک میرے ملاقاتی (جن کا نام لینا قرین مصلحت نہیں)، جو نہایت ممتاز عہدہ پر سرفراز ہیں۔ اون کی حسب ذیل تحریر ملاحظہ ہو۔

[illegible]

میرا ذاتی تجربہ اون کی اندرونی زندگی کے متعلق نہایت تلخ ہے۔ وہ لوگ جو اونکے صرف ظاہری زندگی سے واقف ہیں۔ وہ کبھی اون کی بابت اون کمزوریوں کا شبہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی تحریر بعض اوقات اسکول کے اساتذہ، کاپی نویس اور کلرک کی بھی ہوتی ہے۔ لیکن اوس حالت میں اون کی تحریر سے یہ نتائج برآمد کرنا غلطی ہوگی۔ بعض تحریریں بالکل سیدھی ہوتی ہیں ایسی تحریر کے کاتب نیک نفس و رحم دل ہوتے ہیں۔

لیکن اون میں جوش و شوق تقریباً مفقود ہوتا ہے۔
ایک عجلت پسند شخص جاذب کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ کاغذ پر دھبہ آجاتا ہے۔ یورپ میں عموماً خودکشی سے قبل جان دینے والا کوئی نہ کوئی تحریر ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ ایسی ہزار ہا تحریروں کو دیکھنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اس جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اون کی سطریں عموماً نیچے کی جانب مائل ہوتی ہیں وہ سطریں جو اوپر کی جانب مائل ہوتی ہیں۔ اون سے کاتب کی "سعی پسند" وحوصلہ مند فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اول الذکر تحریر سے کبھی ضد اور خشونت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر سطریں اوپر کی جانب بہت چڑھی ہوئی ہیں۔ تو اس سے کاتب کی عملی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ وہ خیالی گھوڑے بہت دوڑائے گا۔ لیکن عملی زندگی اوس کی کمزور اور خام ہوگی۔ خصوصاً اوس صورت میں جب اوپر کی جانب ۶۰ ڈگری یا اس سے زیادہ کا میلان ہو۔ سطریں اگر نشیب و فراز ہے تو وہ دلچسپ لیکن بے وفا دوست ہوگا۔ اگر ہر سطر کے ابتدائی الفاظ سطر سے کسی قدر اوپر ہوں تو سمجھ لیجئے کہ کاتب کو اپنی زندگی میں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن وہ باہمت و مستقل مزاج ہے۔
آج یورپ اور خصوصاً فرانس میں ملازمت کی درخواستیں امیدوار کے ہاتھ کی لکھی ہوئی لی جاتی ہیں۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ وہ امیدوار کی اخلاقی حالت کا صحیح اندازہ اس سے کر سکتے ہیں۔ ملر (MILLER) کا خیال ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے دریافت کا صحیح و کبھی نہ غلط ہونے والا طریقہ محض مجرم کی تحریر کا امتحان ہے۔ اوس کا خیال ہے کہ پیشہ ور مجرم مثلاً جعل ساز۔ ڈاکو وغیرہ کے خطوط کے زیریں دائرے کبھی بھی صاف نہ رہیں گے۔ پہلی نظر میں تو یہ معلوم ہوگا کہ سیاہی کی کمی پڑ گئی ہوگی۔ لیکن خوردبین آپکو بتاوے گی کہ یہ اوس کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ ینول کا خیال و تجربہ ہے کہ جرائم پیشہ اشخاص کے خطوط بہت خوب صورت۔ صاف لیکن چھوٹے ہوتے ہیں۔ ضمیر ایمانی کی کمزوری اونھیں بڑے اور نمایاں حروف لکھنے سے منع کرتی ہے۔ حروف کی خوب صورتی اون کی بدترین طینت کی قوت متعارضی کا اثر ہے۔
بسا اوقات آپ نے ایسی تحریریں بھی دیکھی ہوں گی، جن میں حروف کی ابتدائی یا آخری کشش اور اون کے دائرے خوب صورت اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کشش اور دائرے بالقصد نہیں بنائے گئے ہیں تو یہ بھی کاتب کے اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر یہ کشش و دائرے ساری تحریر میں یکساں ہیں تو اس سے کاتب کی شخصیت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کم ہیں تو اس سے اوس کی دماغی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ بسا اوقات مغرور و متکبر اشخاص کی تحریریں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اگر کشش و دائرے بدنما ہیں تو اس سے کاتب کی پریشانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکثر اشخاص جملہ کے ابتدائی الفاظ نمایاں لکھتے ہیں۔ اس سے کاتب کا تکبر مترشح ہوتا ہے۔ بہت سی ایسی بھی تحریریں آپ کو ملیں گی۔ جن میں جملوں کے آخری الفاظ یا حروف میں کشش ہوتی ہیں۔ ایسی تحریر کا کاتب اکثر دوراندیش ہوتا ہے۔ اور اوس کی آنکھیں ہمیشہ نتیجہ و انجام پر لگی رہتی ہیں۔ مگر اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کشش ہمیشہ صحت اخلاق کی علامت ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایسے اشخاص خراب و ناجائز ذرائع سے حصول مقصد کے عادی ہوتے ہیں۔ اون کے نزدیک ذرائع خراب ہوں یا اچھے، اون کا مقصود پورا ہونا چاہیئے۔

آپ کو یہ معلوم کرکے شاید تعجب ہو کہ تحریر سے کاتب کے امراض جسمانی و دماغی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ باڈول (BODWELL) کا خیال ہے کہ وہ دل و دماغ کے مریضوں کو بآسانی اون کی تحریروں سے پہچان سکتا ہے۔ میرا تجربہ دماغی مریضوں کے متعلق ناقص ہے۔ اس لئے میں خود اپنا تجربہ اس کے متعلق نہیں پیش کرسکتا۔ مصنف مذکور کا تجربہ ہے کہ دماغی مریضوں کی تحریر میں روانی نہیں ہوتی اور اون کی سطریں عموماً بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اور حروف میں پیوستگی نہیں ہوتی۔ میں خود دل کے مرض میں مبتلا ہوں، اس لئے میں نے ایسے مریضوں کی متعدد تحریروں کا بغور مطالعہ کیا اور شاید میں اون کی قطعی علامات آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ دل کے مریض کی تحریر میں شگفتگی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی لفظ متعدد حروف متحد کرکے لکھا جاتا ہے، تو اوس کی تحریر میں کبھی آپ حروف کی واضح تقسیم نہ پائیں گے۔ ضعیف القلب عموماً عجلت پسند ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس تقسیم کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ اوس کے دائرے بھی عموماً کشش کی صورت میں ہوں گے۔ وہ عموماً اون نقطوں کے دینے سے پرہیز کرے گا، جن کے بغیر حروف آسانی سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ اوس کے نقطے عموماً غیر واضح ہوں گے۔ اور عموماً وہ دو نقطوں کا کام ایک ہی نقطہ سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ اوس کی تحریر میں وہ عیوب جو دماغی نقص کے باعث پیدا ہوتے ہیں موجود نہ ہوں گے۔ اوس کی تحریر میں ایک قسم کی آورد ہوگی۔ اوس کی تحریر کا جمود محض اُس سکون کا اثر ہے، جس کی ضرورت اوس کا قلب محسوس کرتا ہے۔ چونکہ مریض قلب جرم کی جانب کم مائل ہوتا ہے، اس لئے اوس کی تحریر میں مشکوک حروف کم ہوں گے۔ وہ غلط عبارت کو کاٹ کر اوسی کو صحیح کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

بعض علامات ایسی بھی ہیں۔ جن سے آپ مرد و عورت کی تحریر میں تفریق کرسکتے ہیں۔ ہندوستان میں چونکہ تعلیم نسواں تقریباً مفقود ہے، اس لئے اون کی تحریر کی شناخت تو نہایت آسان ہے۔ اسی لئے اس باب میں مجبوراً مجھے مغربی مصنفین کے تجربہ پر بھروسہ کرنا پڑا۔

گو یورپ میں نسائی ترقی کی ابتدا ملکۂ الیزبتھ کی تخت نشینی سے ہوتی ہے۔ لیکن واقعتاً اون کی ترقی کی نمایاں خصوصیات بیسویں صدی سے شروع ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی تک عورتیں نازک و کمزور

سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ اب مغربی عورتیں اس لقب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ انیسویں صدی تک یہ عام رواج تھا کہ مرد اپنی جگہ ٹرینوں میں عورتوں کو دیدیا کرتے تھے اور خود کھڑے رہتے، لیکن اب اگر کوئی یہ کرتا ہے تو اوسے عورتیں اپنی حقارت سمجھتی ہیں۔ انیسویں صدی تک اون میں متعدد اخلاقی کمزوریاں تھیں، تو اوس وقت تک اون کی تحریر بھی مخصوص تھی۔ جس سے خود متعدد عیوب مترشح تھے۔ اون کا خط بائیں جانب کو جھکا رہتا تھا اور اوس کو (LADYS HAND) یا عورتوں کا طرز خط کہتے تھے۔

گزشتہ صفحات میں میں اس قسم کی تحریر کی خصوصیات عرض کر چکا ہوں۔ جسکی تکرار یہاں بے سود ہے۔ بہر نوع بیسویں صدی سے یہ طرز تحریر مفقود ہو گیا اور اب مرد و عورت کی شان خط میں کوئی اصولی امتیاز باقی نہیں رہا۔ اس امتیاز کے فقدان نے ماہرین فن کی مشکلوں میں بیحد اضافہ کر دیا۔ دوسری وقت مغربی عورت کی مردانہ روش کی تقلید ہے، جس نے مشکل کو اور بھی بڑھا دیا اور اب اون کی تحریر کی لطافت آمیز خصوصیت بھی تقریباً جاتی رہی۔

عورتوں کے حروف عموماً چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر حروف میں کشش ہوتی بھی ہے تو وہ سطر کے بالائی یا زیریں حصہ میں نہیں بلکہ سطر کے برابر۔ عورت فطرتاً ہوشیار اور ذکی الحس ہوتی ہے۔ اس لئے آپ اوس کی تحریر میں یہ دو باتیں ضرور پائیں گے۔ چونکہ زمانہ نسائی ترقی و عروج کا ہے، اس لئے عموماً اون کی سطریں اوپر کی جانب چڑھی ہوئی ملیں گی۔ پیوستگی عورت کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔

باب چہارم

آپ کا مستقبل

میں "مقدرات" کا معتقد نہیں۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ میں "تدبیر" کا بھی ہمہ تن گرویدہ نہیں۔ دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جس قدر اول الذکر عقیدتمندیوں نے نقصان پہونچایا ہے وہ اک داستان کی محتاج ہے۔ کبھی ہم ترک سعی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مقدر میں ہوگا تو ملے گا۔ اور کبھی اپنی مجبوریوں کی زحمت کو یہ کہکر مطلق کردیتے ہیں کہ "یونہی مقدر میں لکھا تھا"۔ تدبیر پر ہمہ تن بھروسہ بھی غلط ہے، میں آج کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں، لیکن بادشاہ نہیں بن سکتا۔ اصلیت یہ ہے کہ ہماری زندگی تامتر حصول مواقع پر منحصر ہے جس گرد و پیش میں انسان رہتا ہے اوسی کے لحاظ سے اور مناسبت سے مواقع پیش آتے ہیں۔ اگر انسان نے اوس سے فائدہ اوٹھایا، اوس کی تدبیر کارگر ہوئی اور وہ "خوش قسمت" کہلایا۔ اگر اون مواقع سے اوس نے فائدہ نہیں اوٹھایا۔ اوس کی تدبیریں خاک میں مل گئیں۔ اور وہ بدقسمت ہے۔ آپ اگر خود کو بدقسمت سمجھتے ہیں تو اپنے گریبان میں سر ڈالئے اور شمار کیجئے کہ کتنے عمدہ مواقع آپ نے ترک کردئے، کتنی غلطیاں آپ سے سرزد ہوئیں۔ اگر آج وہ غلطیاں آپ سے سرزد نہ ہوتیں تو یقیناً آپ بھی خوش قسمت ہوتے۔

اس عقیدہ کا حامل ہوتے ہوئے میں مغربی مصنفین کی طرح کبھی بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ تحریر قسمت پر، یا قسمت تحریر پر موثر ہوتی ہے۔ واقعیت صرف اس قدر ہے کہ محاسن زندگی کو کامیاب بناتے ہیں اور معائب ناکام۔ بقول نیٹشے (جرمن مصنف و فلاسفر) میرے نزدیک کامیابی کا یہ بھی معیار نہیں۔ کہ دنیادی عروج میسر ہو۔ کوشش سے مراد "کوشش جائز" ہے۔ ایسی صورت میں میں صرف یہ نظریہ پیش کرسکتا ہوں کہ اس فن کا ماہر آپ کے نقائص بتاکر خطرات کو پیش کردے گا۔ جو اون نقائص کے لازمی نتائج ہیں۔ اب یہ صرف آپ کا کام ہے کہ آپ اون خطرات سے بچنے کی کوشش کیجئے۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ آپ کی تحریر آپ کے اخلاق کا آئینہ ہے۔ ایک نظر غائر آپ کے محاسن و معائب سے آپ کی آیندہ زندگی کی کامیابی و ناکامی کا

باسانی پتہ چلا سکتی ہے۔ ماہر فن کا فرض ہے کہ نہ صرف اون نقائص کو آپ پر واضح کرے بلکہ اون کے دفعیہ کی تدبیر بھی بتائے جو صرف اون بداخلاقیوں کے ترک میں شامل ہوگی وہ نہ تعویذ ہوگا اور نہ کوئی دوا۔ بداخلاقی کی دوا صرف ترک بداخلاقی ہے۔ ممکن ہے کہ "لذت عصیان" نے احساس معصیت فنا کر دئے ہوں۔ اور انسان جس حالت میں ہو اوس میں خوشی محسوس کرتا ہو، لیکن معلم اخلاق اس بے حسی کو اصل بداخلاقی سمجھکر سب سے پہلے اسی کی دوا کرے گا۔

اس فن کا ماہر کوئی پیغمبر نہیں ہوتا جو یہ بتا سکے کہ آیندہ آپ کو خزانہ ملے گا یا نہیں۔ وہ تو صرف ایک "شاعر" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی ذکاوت نفس ایک آئینہ کی مانند آیندہ واقعات کا عکس حاصل کرتی ہے۔ اگر آپ کی تحریر اور آئینہ کے درمیان دوسری ردگر یوالی قوتیں کارفرما ہیں تو ممکن ہے کہ عکس دھندلا ہو یا عکس نہ بھی پڑے۔ یہ فن حساب و ہندسہ کی طرح معین علوم میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ٹائپ رائٹر و دیگر ایسی مشینوں کی ایجاد نے اس فن کی اہمیت کم کرنے کے بجائے بہت بڑھا دی۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب ہر تحریر مشین سے ہونے لگے گی اوس وقت دستخط (اس لئے کہ دستخط کبھی بھی متروک نہ ہوگا) انسانی اخلاق کے پرتو کا صحیح مرکز ہوگا۔

اب آیئے چند نکات اس کے متعلق بھی ملاحظہ فرمائے۔

اگر آپ کی تحریر داہنی جانب جھکی ہوئی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تخیل بلند ہے اور آپ ذکی الاحساس ہیں۔ لیکن آپ اس سے خوش نہ ہوں۔ اس لئے کہ ان محاسن کا ایک تاریک پہلو بھی ہے یعنی قوت ارادی کی کمزوری۔ آپ خیالی محل اچھے بنائیں گے۔ لیکن آپ کی قوت عمل کی کمزوری آپ کو دنیا میں کامیاب انسان نہیں بننے دے گی۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ قوت ارادی کو مستحکم کریں۔ خیالات کی پرواز ترک کریں۔ جذبات انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ میں منطقی ذہنیت کو عیب سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ کا فرض ہے کہ آپ خود کو جذبات سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اس لئے کہ اگر ایک "منطقی کی کشتی ڈوب سکتی ہے"، تو صاحب جذب کی کشتی کا سنگ حقیقت سے متصادم ہو جانا زیادہ ممکن ہے۔

اسی طرح اگر آپ کی تحریر منتشر ہے تو اس سے آپ کی "پریشانی خیال" معلوم ہوتی ہے۔ اصل خوشی جمعیت خاطر ہے۔ اگر آپ کے پاس دنیا کی دولت ہے۔ لیکن جمعیت خاطر نہیں تو آپ کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی۔ آپ اگر غور کریں گے تو آپ کی "پریشانی خاطر" کے اسباب یقیناً آپ کی اخلاقی کمزوریوں میں مضمر ہوں گے۔ آمدنی سے زیادہ خرچ۔ دوسروں کے معاملات سے غیر معمولی دلچسپی وغیرہ وغیرہ بھی چند اسباب "پریشانی خاطر" کے ہو سکتے ہیں۔ اب ان کا علاج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اسے آپ یقینی سمجھ لیں کہ بغیر جمعیت

خاطر آپ دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ہمارے رنج وغم کے اسباب عموماً ہماری خود غرضی۔ حسد۔ قوت ارادی کی کمی۔ نامناسب تخیل۔ کاہلی۔ بے صبری۔ وغیرہ وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ خدا کی پرستش کا اصل مقصود ان معائب کا ترک کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ کتنے ہیں جنہوں نے خدا کی ظاہری پرستش کو خود مقصود سمجھ رکھا ہے۔ اس ذریعہ اور مقصود کا اختلاط ہمارے زوال کا تنہا سبب ہے۔ ان معائب کی موجودگی میں خدا کی "پرستش" "لہو ولعب" سے کم نہیں۔ اس عدم امتیاز کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق روز بروز خراب ہوتے گئے۔ اور مذہبی فروع میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی۔ ان بداخلاقیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری پرستش بھی قائم نہ رہ سکی۔ یہی سبب ہے جو آج آپ مسجد و مندر کو ویران پاتے ہیں۔ "غیر مرتب زندگی خود اپنا شکار ہے"۔ انسان نے حقیقت سے منہ موڑ کر سہولت کے لئے اپنے نفس پر خدا کی پرستش شروع کر دی۔ "میں"۔ "میرا"۔ "میرے مقاصد"۔ یہی الفاظ ہیں جو آج ہماری زبان پر ہیں۔ اور انھیں کا مفہوم ہمارا معبود ہے۔ خود غرض خود اپنا دشمن ہے۔ کاہل اپنا آپ دشمن ہے۔ یہ ہیں ہماری پریشانیٔ خاطر کے اسباب۔

اگر آپ کی تحریر سے قوت ارادی کی کمزوری مترشح ہے تو آپ کا فرض ہے کہ آپ اوسے مستحکم کرنیکی کوشش کریں۔ قوت ارادی کی کمزوری عموماً یا تو معیار اخلاق کی خرابی کی باعث پیدا ہوتی ہے یا غیر موجودگی اس کا سبب ہوتی ہے۔ زندگی نام ہے کسی "اسوۂ حسنہ" کو پیش نظر رکھ کر اس پر عمل کرنے کا۔ ترتیب و تربیت بغیر نمونہ ناممکن ہے۔ یہ سبب آپ کی قوت ارادی کی کمزوری کا ہے۔

کامیابی "اضافی" کیفیت ہے۔ ہر شخص اس کا مختلف معیار رکھتا ہے۔ ایک گدا ایک روٹی کا ٹکڑا پاکر خوش ہوتا ہے۔ اور آپ سکندر اعظم کی طرح "فتح کے لئے مزید دنیا" کے متلاشی ہو سکتے ہیں۔ اس تفریق کا سبب بھی وہی اختلاف معیار ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بلندی حوصلہ ترتیب حیات میں معین ہوتی ہے اور حصول معیار میں بھی اس سے بیحد مدد ملتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی تحریر سے قوت عمل کی کمی ظاہر ہوتی ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ آپکے حوصلے یا آپ کا معیار آپ کی قوت و وسعت سے بالاتر ہے۔ منصور و فرعون دونوں الوہیت کے مدعی تھے اور دونوں فنا کر دئے گئے۔ فرعون قابل لعنت صرف اس لئے ہے کہ اون سے غیر تدریجی ترقی کی کوشش کی اور اوسکا دعوے اوس کی وسعت سے باہر تھا۔ منصور کو بھی وہی سزا ملی۔ لیکن وہ ملعون نہیں ہوا اس لئے کہ انھوں نے "عرفانِ نفس" کے بعد "عرفان الہی" کا دعویٰ کیا تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ منزلِ مقصود تک رسائی کامیابی کی دلیل ہے۔ اگر آپ میں محاسن

ہوں موجود ہیں۔ تو آپ کی سعی آپ کی کامیابی ہے۔ ماہر فن کی نصیحت سعی سے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ اکثر بُرے بظاہر خوش ہیں۔ اور اچھے بظاہر رنجیدہ۔ اگر ان کے افعال کے ظاہری نتائج دیکھے جائیں تو اصول اخلاق میں فرق آتا ہے۔ ممکن ہے کہ مذہب اس کا کوئی دوسرا حل پیش کرے۔ لیکن اعلیٰ فلسفہ سے اس کی توجیہ صرف یہ کی ہے کہ محاسن و معائب خود مقصود ہیں۔ خوشی تو احساس و عدم احساس پر منحصر ہے۔ بہ ایں ہمہ آپ اہل عیب کو سچی خوشی کا حامل نہیں کہہ سکتے۔

جعل و ماہرانِ فراست التحریر

زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایسے جرائم کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ جس میں ہنر، عقل، و چالبکدستی سے کام لیا جاتا ہے۔ دیہاتوں میں تو اب بھی نقب زنی کی وارداتیں سننے میں آتی ہیں۔ لیکن شہر میں یہ صورت جرم تقریباً معدوم ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ یورپ میں شاذونادر نقب زنی ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ چوری یا بددیانتی کم ہے۔ بلکہ چوری کے طریقے نقب زنی سے زیادہ ماہرانہ اختیار کئے جاتے ہیں آج فریب و جعل کی کثرت ہے، ایک عالم ہے جو دوسروں کی حماقت اور جہالت سے فائدہ اوٹھا کر فریب کی روٹیاں کھا رہا ہے۔

تحریر کی ایجاد کے ساتھ ساتھ جعل کا جرم لازماً پیدا ہوگیا۔ انجیل و قرآن کی تحریف جعل کی بدترین مثالیں ہیں۔ یورپ میں اس جرم کی سزا عام طور پر جلاوطنی اور غلام کے لئے موت قرار دی گئی تھی۔ بعد کے قوانین نے سزائیں ترمیم کیں۔ آج ہندوستان میں جو تعزیری قانون جاری ہے اوس میں دو سال سے لے کر حبس دوام (دفعہ ۲، ۴) تک کی سزائیں تجویز ہیں۔

اس وقت جعل کے ثبوت کے لئے قانون نے چار طریقے تجویز کئے ہیں۔

(۱) چشم دید شہادت۔
(۲) ماہرانِ تحریر کی رائے۔
(۳) ملزم کی تحریروں سے واقف کاروں کی رائے۔
(۴) اصلی و جعلی تحریروں کے مقابلہ کے بعد خود عدالت کی رائے۔

نمبر ۱ و ۳ و ۴ سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے ہمارے مبحث سے اون کی رائے اور اون کے دلائل خارج ہیں۔ ہمیں صرف نمبر ۲ سے سروکار ہے اس لئے کہ وہ بحیثیتِ عالمِ فن ایک رائے رکھتا ہے۔ چونکہ

اس فن کے فرضی ماہرین علم فراست التحریر سے ناواقف رہتے ہیں۔ اس لئے اون کی رائے عموماً ناقابل اعتبار رہتی ہے۔ اون کا طریقۂ امتحان محض حروف کی پیمائش ہے، وہ اصلی وجعلی کی تصویریں لیتے ہیں۔ اوس کو دسیع کرتے ہیں۔ دونوں کے دائرے اور حروف کی پیمائش کرتے ہیں اور مماثلت اور غیر مماثلت سے جعل واصل تجویز کرتے ہیں۔ مگر انسانی قوت نقل اس درجہ زبردست ہے کہ یہ طریقۂ امتحان مطلق تشفی بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ صدہا بار ان فرضی ماہران علم کی رائے عدالتوں نے مسترد کر دی۔

لیکن اگر یہ لوگ اپنی تھوڑی موجودہ واقفیت کے ساتھ علم زیر بحث سے بھی واقفیت حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ اون کا علم مکمل ہو جائے۔ میں نے اس فن پر چند کتابیں مطالعہ کی ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ حسب ذیل مفید ہدایات سے خالی پائی گئیں۔ جن پر اگر عمل کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ صحیح و مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

(۱) جہاں تک ممکن ہو ہر دو تحریر (اصلی وجعلی) کا زمانۂ تحریر معلوم کیا جائے۔ اس لئے کہ دیرینہ تحریروں میں اخلاق کی روشنی کا عکس ماند پڑ جاتا ہے۔ اگر تحریر زیادہ زمانہ کی ہے تو اس نقص کو ملحوظ رکھ کر تقابل ضروری ہے۔

(۲) عموماً وہی کاغذات عدالت میں آتے ہیں۔ جو حقوق یا کاروبار سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اصلی تحریر کے اندر کاتب کی اس ذہنیت کی تلاش لازم ہے۔ ایک شخص جب کسی کو ہبہ کرتا ہے، تو اوس پر احسان ومحبت غالب رہتی ہے، جب وہ وصیت لکھتا ہے تو اوس پر موت کا خوف طاری رہتا ہے، جب وہ بیع کرتا ہے تو احتیاج کی مجبوریاں اوس کا دل دکھاتی ہیں۔ جب وہ معاہدہ کرتا ہے تو اوس پر کاروباری متانت کا غلبہ رہتا ہے۔ یہی وہ علامات ہیں۔ جن کی تلاش تحریر متنازعہ میں ضروری ہے۔ اب اصلی تحریر لیجئے، عموماً وہ بھی انھیں صورتوں میں لکھی گئی ہوں گی، اور اگر دوران مقدمہ میں مستغیث سے لکھائی گئی ہیں۔ تو اوس میں انتقام کے علامات ظاہر ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسٹر رالس کے طریقہ سے اس تحریر کو دیکھا جائے تو اس پر ایک خفیف سرخ رنگ ضرور پایا جائے گا۔

(۳) جعلی تحریر کی امتیازی خصوصیات بھی قابل غور ہیں۔ ایک مجرمانہ ذہنیت کے تمامی آثار اوس تحریر میں رونما ہوں گے۔ ایسی صورت میں متنازعہ تحریر کو ملزم کی تحریروں سے مقابلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ملزم کی وہ تحریر جو دوران مقدمہ میں لی جاتی ہے۔ وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اوس کی وہ تحریریں زیادہ مفید ہونگی جن کو اوس نے اطمینان کے وقت لکھا تھا۔ مذکورہ بالا امتیازی خصوصیات کو ان تحریروں میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔

(۴) اگر تحریر متنازعہ ملزم کی تحریر سے مشابہ نہیں ہے اور اسوقت بھی اگر اوس کے جعلی ہونے کا احتمال ہے تو پھر اوس میں دوسری خصوصیات ملیں گی۔ جعل ساز پر عموماً بوقت ارتکاب جرم حسب ذیل جذبات مسلط رہتے ہیں۔

(۱) خوف۔ اس جذبہ پر جب وہ قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اوس کا قلم ہر حرف کی کشش یا دائروں کے زاویوں پر رکتا ہے، جس سے باریک نقطے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس خوف میں کمی و زیادتی ملزم کی قلبی و دماغی قوت پر منحصر ہے۔ ایک پیشہ ور مجرم بہت کم خوف محسوس کرے گا، ایک صاحب عزت زیادہ خوف کھائے گا۔

(۲) ناجائز استفادہ کی خواہش۔ اس کا احساس بھی نفس معاملہ اور ملزم کی شخصیت کے لحاظ سے اضافی ہے۔ حروف و تحریر کی تنگی اس کے علامات ہیں۔ مقدمات کے سلسلہ میں مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا ہے کہ وسط حرف کی سیاہی التزاماً پھیکی رہ گئی ہے، یا بہت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ اختلاف ملزم کی قوت و ضعف پر منحصر ہے۔

(۵) سب سے زیادہ کامیاب جعل وہ شخص بناتا ہے، جس کو نفس معاملہ سے کوئی تعلق نہ ہو، ایسے شخص سے اگر واقفیت ہے تو اوس کی تحریر سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور تمامی نکات جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اوس سے بھی متعلق ہوں گے۔

(۶) بعض وقت ایسی صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، جب ایک شخص اپنی تحریر عام طرز سے علحدہ مصنوعی طور پر لکھتا ہے، اور پھر اوس سے انکار کرتا ہے۔ ایسا شخص اگر فراست التحریر سے واقف نہیں ہے تب تو امتحان آسان ہے لیکن اگر وہ واقف ہے تو صحیح پتہ چلانا مشکل ہے۔

باب ششم

علم فراست التحریر کا مستقبل

اب تک دنیا اس علم کو قیاسی قرار دیتی ہے۔ لیکن وہ زمانہ قریب ہے جب ہم دیگر معین علوم کی طرح اس سے بھی صحیح اور یقینی نتائج برآمد کر سکیں گے۔ اس وقت تک مغرب نے جو تحقیقات کی ہے۔ اوس سے اس علم کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے۔

مسمر نے سب سے پہلے جب اپنے نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے تو ایک عالم ہنستا تھا۔ لیکن آج ہپناٹزم کو جو جگہ صف علم میں حاصل ہو چکی ہے وہ قابل رشک ہے۔ "نظر ثانی" و دیگر تجربات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ انسان کی آواز کے ساتھ ایک لطیف شے بھی برآمد ہوتی ہے جو کسی کی نظروں میں رنگ معلوم ہوتی ہے لیکن بعض نے اوس کو شکل کی صورت میں بھی دیکھا۔ اس کی تحقیقات کے لئے نہایت نازک و لطیف آلے بھی ایجاد ہوئے اور آخر یہ دریافت ہوا کہ اگر منھ کے سامنے ایک صاف و شفاف پردہ لگا دیا جائے تو اوس پر آواز کی وجوں کی روشن لیکن باریک شکل ابھر آتی ہے۔ مزید تجربہ کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی گیت گایا جائے تو ہر لے کی موجیں مختلف رنگوں میں ابھر آتی ہیں۔ اور اگر لے پوری نہ ہو تو صرف عکس سا پڑ کر رہ جاتا ہے اس کے بعد اطبا نے رنگ سے علاج کا طریقہ نکالا۔ آج تک مختلف ممالک میں یہ آسان، لیکن سریع الاثر علاج متعدد امراض کیلئے جاری ہے شفا خانوں میں سرخ و سبز شیشے اسی باعث لگائے جاتے ہیں۔

زمانہ نے ترقی کی تو ایک فرانسیسی حکیم نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس میں انسانی جذبات کی تصویر آجاتی ہے۔ اب تک تحقیقات اس نوبت تک پہونچ گئے کہ اگر مختلف لوگ کسی ایک ہی جذبہ کا اظہار کریں تو سبکی تصویر یکساں آتی ہے۔ اس تحقیقات سے مدد لے کر مسٹر ہنری رائش ([illegible]) ایک امریکن ماہر علم نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہر شخص کی تحریر رنگین ہوتی ہے اور یہ رنگ جذبات کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ امریکن موصوف نے یہ تجربہ جس طرح حاصل کیا ہے وہ بعید دلچسپ ہے۔ اس لئے میں خود اوسکے

الفاظ آپ کے سامنے پیش کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ چونکہ یہ عمل نہایت آسان ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ ناظرین بھی اس کی کوشش کریں گے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"جب میں مختلف اشخاص کی تحریریں دیکھتا رہتا تو مجھے اونھیں رنگ کی جھلک دکھائی دیتی، خصوصاً اگر کرہ بہت زیادہ روشن ہوتا تو یہ رنگینی واضح ہوتی۔ بالآخر میں نے ایک مخصوص شخص کی تحریر کو جب بھی دیکھا تو وہی رنگ پایا اور یہ رنگیں اثرات بہت کچھ اوس عکس سے مشابہ تھے جو ہینا ٹزم والے آواز کے ذریعہ سے پردوں پر پیدا کرتے تھے۔ اوس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ جسطرح آواز کا عکس پردوں پر پڑتا ہے اوسی طرح اس کا بھی امکان ہے کہ انسان کے خیالات اپنا اثر کاغذ پر ظاہر کریں۔

اس کے بعد میں نے تحریروں کو ایسے تاریک کرہ میں دیکھنا شروع کیا جس میں صرف ایک روشن دان تھا اور اب مجھے رنگ زیادہ واضح نظر آئے۔ بالآخر میں نے ایک مخصوص کرہ کا اس کے لئے انتظام کیا۔ جس کا رخ دکھن کی جانب تھا اور اوس میں ڈالر برابر سوراخ کیا تاکہ روشنی آسکے۔ تب میں نے اوس سوراخ کے سامنے ایک آئینہ اس طرح لگایا کہ باہر کی خفیف روشنی اس پر منعکس ہوکر کرہ میں پڑے اور اگر براہ راست دہوپ آتی تو میں اس کو بہتر سمجھتا تھا۔ اس آئینہ سے جو روشنی منعکس ہوتی اوس کے سامنے میں نے تحریروں کو رکھا۔

اس کا فوری اثر نہایت تعجب خیز تھا۔ روشنی کی رنگین و متحرک کرنیں کاغذ پر کھلنے لگیں۔ میری طرح متعدد لوگوں نے اس روشنی کو دیکھا۔ بعض نے چند رنگ دیکھے۔ بعض نے اسکی شکایت کی کہ وہ رنگ تھوڑی دیر کے بعد غائب ہوگئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بلغمی جسم کے لوگوں نے کچھ نہیں دیکھا بلکہ یہ شکایت کی کہ اس روشنی کے اثر سے اون کا سر اور اونکی آنکھیں دُکھنے لگیں۔

رنگ کا اشتراک وانتظام گو بے انتہا ہے لیکن مرتب اصول پر مبنی ہے۔ لازم ہے کہ ایک محقق کی زندگی میں یہ اجتماع رنگ آمیزی اور روشنی اور اوس کے اثرات بطور راز قائم رہیں۔ اس لئے کہ معین قدر وقیمت تو اونکی اوس وقت معلوم ہوگی جب متعدد ماہرانِ فن اس کی تصدیق کرلیں۔ چند عام علامات فوراً ظاہر ہوجاتی ہیں۔ گہرے سُرخ رنگ سے قوت وجذبہ کا اظہار ہوتا ہے، زردی مائل آسمانی رنگ سے معیار کی بلندی معلوم ہوتی ہے اور تاریکی رنگ طاقت ظاہر کرتا ہے۔ لیکن نفسانیت نہیں۔ دہندلا بھورا رنگ قوت عمل کی علامت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ آیندہ واقعات بھی اپنا عکس ڈالتے ہیں۔ ایک ہلکی تصویر

کاغذ پر معلوم ہوتی ہے۔ جو بآسانی کسی شخص کا عکس معلوم ہوتا ہے، یا کسی آیندہ واقعہ کا پرتو۔"

اس عمل کو پیش نظر رکھ کر میں نے بھی تجربہ کرنا چاہا۔ لیکن دو تین بار ناکامیاب رہا۔ ایک واقعہ (جو میرے تجربہ میں تنہا واقعہ ہے) البتہ قابل الذکر ہے۔ میں نے اپنی تحریر میں گہری زردی دیکھی، جس وقت میں نے یہ رنگ دیکھا اوس وقت میں صحیح وتندرست تھا۔ لیکن چار گھنٹے کے بعد شام ہوتے ہوتے میں صفراوی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اطباء یونانی کے نزدیک صفرا زرد ہوتا ہے اور میرے استفراغ میں اس کی علامتیں پائی بھی گئیں مسٹر رالس کا یہ تجربہ کہ "قوت وجذبہ کا اظہار سرخ رنگ سے ہوتا ہے"۔ اس کی تائید فارسی کا محاورہ "سرخ رو" سے ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے مشاہدات یہیں تک محدود نہیں ہیں۔ چند دن ہوئے اسٹیٹسمین میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے۔ جس کے سامنے بیٹھ کر ایک شخص حروف کے نام بتاتا جائے گا اور گویائی کی لہریں اوس پر حروف کندہ کرتی جائیں گی۔ یہاں تک کہ پلیٹ تیار ہو جائے گی۔

ان واقعات کو پیش نظر رکھ کر ہم یقینی طور پر یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ زمانہ قریب ہے جب ہمارے جذبات کی تصویر دیگر مرئی اشیاء کی طرح لی جا سکے گی۔ اور رنگوں کا امتیاز یہ بتا سکے گا کہ کاتب تحریر کے وقت کن جذبات سے متاثر تھا۔

اب رہا اخلاق کا سوال۔ اس میں شبہ نہیں کہ نیک دل وبدطینت دونوں ایک ہی قسم کے جذبات مثلاً غصہ ورنج وغیرہ سے یکساں طور پر متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جذبات کی تصویر مستقل اخلاق کی تصویر نہیں کہی جا سکے گی۔

ایسی صورت میں ہماری مستقل اخلاقی حالت کا پتہ صرف اوسی وقت چل سکے گا۔ جب ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جو ہماری صلاحیت واہلیت کی تصویر کھینچ سکے، اس وقت تک جس طرح زمانہ ترقی کر رہا ہے اوسکو دیکھتے ہوئے وہ دن بھی بعید نہیں جب اس میں بھی ہم کامیاب ہو سکیں گے۔

ضمیمہ نمبر (۱)

تحریر۔ شان وطرز

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱۔	صاف و مرتب تحریر	جمعیتِ خاطر۔ سطح عام سے بالاتر دماغی قابلیت۔
۲۔	پریشاں و غیر مرتب۔	پریشانی خاطر۔ سطح عام سے کمتر دماغی قابلیت۔
۳۔	غیر موزوں تحریر جس کے حروف نامناسب طور پر چھوٹے یا بڑے ہوں۔	اختلاجِ قلب۔ عدم استقلال۔
۴۔	مستحکم و پیوستہ تحریر	صحت جسمانی۔ استحکام اخلاق
۵۔	ویران و خاموش تحریر	گمنام شخصیت۔ غیر دلچسپ شخصیت
۶۔	جامد وساکن تحریر	حمق۔ ابلہی
۷۔	تیز و سریع لیکن صاف	سرعت خیال۔ اخذ انجام میں مستعجل
۸۔	مرتب و تیز و سریع لیکن ناصاف	خوش اوقات مصیبت و معصیت میں جو گرفتار ہیں ان سے نامناسب نفرت و حقارت
۹۔	مربع تحریر	دیر آشنائی لیکن وفاداری۔ اصول عمل "یک در گیر و محکم گیر"
۱۰۔	وسیع تحریر	حوصلہ مندی۔ سخاوت۔ آزادی خیال۔ اعتماد نفس۔ اور کچھ غرور
۱۱۔	تنگ تحریر	خباثت، بغض۔ فضول گوئی۔
۱۲۔	خوبصورت رواں تحریر	لطافت جذبات۔ مذاق سلیم
۱۳۔	زاویہ دار تحریر (اعلیٰ قسم)	قوت ارادی۔ قوت دفاعی
۱۴۔	زاویہ دار تحریر (ادنیٰ قسم)	ضد اور غلطی پر اصرار۔ طعنہ زنی

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱۵-	بیضاوی تحریر جس میں زاویہ موجود نہ ہو	خوش اخلاق۔ جنگ و فساد سے نفرت۔
۱۶-	بہت چھوٹی تحریر صاف و مرتب (اعلیٰ قسم)	تفصیل پسندی۔ علوم سے رغبت۔
۱۷-	چھوٹی تحریر معمولی	تنگ نظر۔ بزدل۔
۱۸-	بلند تحریر (اعلےٰ قسم)	جوش۔ حوصلہ۔
۱۹-	بلند تحریر (ادنےٰ قسم)	تصنع۔ غرور۔ سوقیانہ روش
۲۰-	پست تحریر	غم۔ کاہلی۔ علالت۔
۲۱-	ناہموار تحریر (مرتب و دلفریب)	زندہ دلی۔ وسعت ذرائع۔ گردوپیش سے مطابقت کی عادت
۲۲-	ناہموار تحریر (غیر مرتب و ویران)	جہل مرکب
۲۳-	منتشر تحریر	پریشانیٔ خیال
۲۴-	بھدی اور گندہ تحریر	بوالہوسی
۲۵-	متحرک تحریر	پیری و ضعف جسمانی
۲۶-	شکستہ تحریر جس میں تھوڑی تھوڑی دور پر الفاظ منتشر ہوجاتے ہیں۔	ضعف قلب یا فالج کے آثار
۲۷-	طویل تحریر جس میں حروف لانبے ہوں۔	سردمہری۔ خودستائی۔ خودغرضی۔
۲۸-	داہنی جانب جھکی ہوئی تحریر	بلندیٔ تخیل۔ ہمدردی، ذکاوت احساس
۲۹-	بائیں جانب جھکی ہوئی تحریر	عدم اعتماد۔ عدم ایثار، ظاہرداری، فنون لطیفہ کا شوق۔
۳۰-	بہت پھیلی ہوئی تحریر جس کے الفاظ کے آخری حروف عموماً دور تک کھینچ دیئے گئے ہوں	آرام طلبی
۳۱-	گنجان تحریر	حرص۔
۳۲-	رواں تحریر جس میں قلم کی حرکت کے متعدد نشانات موجود ہوں۔	سرعت خیال۔ خاموشی
۳۳-	چھوٹی تحریر جسکے حرف بہت زیادہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں	مجلل و دنائت

نمبر شمار	علامات	اثرات
۳۴۔	کشادہ تحریر جس کے حروف واضح ہوں	سخاوت۔ ایسا شخص عموماً زود رنج ہوتا ہے۔ ہر شخص سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے لیکن بہت جلد ترک بھی کر دیتا ہے۔
۳۵۔	تحریر جو کاغذ کی وسعت کی مطابقت سے چھوٹی و بڑی کی گئی ہو۔	ذہانت۔ ماحول و گرد و پیش سے مطابقت کی کوشش
۳۶۔	تحریر جس میں تموج یا سانپ کی طرح لہریں ہوں۔	وقت شناس حیل و فریب
۳۷۔	تحریر جس کے جملوں کے آخری الفاظ عموماً ناصاف ہوں	چالاک فریبی اور جھوٹا
۳۸۔	تحریر جس کے الفاظ کے آخری حروف عموماً واضح اور بڑے ہوں۔	خلوص۔ ایمانداری۔ سادہ لوحی۔
۳۹۔	تحریر جس کے حروف عموماً مرتب و خوبصورت ہوں لیکن جا بجا بد وضع اور بد صورت الفاظ یا حروف بھی ہوں	کاتب کی زندگی میں بعض واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں جنھوں نے اوس کے دماغی توازن پر خراب اثر ڈالا ہے
۴۰۔	باریک تحریر	ذہن باریک بیں، ذکی الحس، اور ضعیف قلب۔ دیر آشنا
۴۱۔	موٹی تحریر	فضول گو۔ جاہل، ضدی
۴۲۔	تحریر جیسی پیشہ ور کاتب لکھتے ہیں اگر پیشہ ور کاتب کی نہ ہو۔	اعلیٰ تربیت و جذبات
۴۳	تحریر جس کے حروف پتلے ہوں اور حروف زاویہ دار ہوں۔	مخفی نفسانی خواہشات۔ جرائم پیشہ اکثر ایسی تحریر کے مالک ہوتے ہیں۔
۴۴۔	پھول دار تحریر	ذہانت کی کمی۔ بدمذاقی۔
۴۵۔	ٹھوس تحریر	مذاق۔ سائنس و دیگر علوم

ضمیمہ نمبر (۲)

حروف۔ شان و طرز

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱۔	نمایاں اور ممتاز حروف جملہ کی ابتدا میں	بلندیٔ تخیل
۲۔	نمایاں اور ممتاز حروف ہر لفظ کی ابتدا میں	غرور و خود پسندی
۳۔	بقیہ تحریر سے چھوٹے حروف جملہ کی ابتدا میں	ریاکاری۔ حرص زر۔
۴۔	بقیہ تحریر سے چھوٹے حروف ہر لفظ کی ابتدا میں	بدترین شخصیت۔ مجرمانہ ذہنیت
۵۔	خوبصورت حروف جملہ کی ابتدا میں	فنون لطیفہ کا شوق
۶۔	خوبصورت حروف ہر لفظ کی ابتدا میں	تصنع۔ بیجا خودداری
۷۔	شکستہ حروف جملہ کی ابتدا میں	خباثت نفس
۸۔	شکستہ حروف ہر لفظ کی ابتدا میں	مجرمانہ و سازشانہ ذہنیت
۹۔	جملہ یا الفاظ کے ابتدائی حروف اگر کھنچکر تحریر کے نیچے جا پڑیں۔	خودداری۔ خطرات سے پرہیز۔ سخاوت
۱۰۔	جملہ یا الفاظ کے ابتدائی حروف بھدے اور بدنما	جنون اگر تحریر عورت کی ہے تو اختناق الرحم
۱۱۔	الفاظ کے ابتدائی حروف بقیہ جزو لفظ سے ملے ہوئے	مرتب خیال۔ خلوص و سخاوت۔ ایسے کاتب سے احباب کو نفع پہونچتا ہے۔
۱۲۔	مدور حروف	فرقہ پسندی۔ اعزا کی حمیت
۱۳۔	مربع حروف	دیر آشنائی لیکن وفاداری
۱۴۔	لفظ کا ابتدائی حرف جدا اور نمایاں	آزادی کی خواہش

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱۵۔	الفاظ کے حروف منتشر	پریشانی خیال۔ اگر عورت کی تحریر ہو تو وہ بانجھ ہوگی
۱۶۔	غیر مکمل حروف	خباثت
۱۷۔	کج حروف	ضد
۱۸۔	الفاظ کے مرکب حروف منتشر	واقفیت عامہ
۱۹۔	ایک لفظ کے آخری حرف دوسرے لفظ کے ابتدائی حرف سے ملا ہوا	صدق قول
۲۰۔	لفظ کے آخری حرف کی نامناسب طویل کشش	مبالغہ پسندی
۲۱۔	لفظ کے آخری حرف کی غیر مکمل کشش	بدعہدی
۲۲۔	الفاظ کے آخری حروف بڑے	ذہب لنفس۔ حسد
۲۳۔	زاویہ دار حروف	معین شخصیت
۲۴۔	الفاظ کے آخری حروف اگر مدور ہوں	ضد
۲۵۔	الفاظ کے آخری حروف بے ضرورت اگر سطر سے بلند ہوں	باطنی علوم کا شوق۔ اگر ضرورت سے زیادہ ہو تو اس سے کاتب کی دماغی پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔ اور تعجب نہیں کہ کاتب کبھی خودکشی کرلے۔
۲۶۔	اگر الفاظ یا حرف بوجہ قلت جا آخر سطر کو بلند ہو جائیں۔	بلندی ہمت۔ کاتب کو تلخ تجربات فراموش ہوسکتے ہیں لیکن حوصلہ مند بنادیا ہے
۲۷۔	جابجا مدور حروف	کاتب کے دماغ پر کسی مخصوص مصیبت نے برا اثر کیا ہے۔
۲۸۔	وسط تحریر میں نامناسب اور بھدے حروف	کاتب کی اخلاقی حالت بالکل صاف نہیں ہے۔ اسکا امکان ہے کہ اگر بداخلاقیاں سرزد ہو جائیں۔
۲۹۔	اگر سطر کے آخری حروف یا الفاظ سطر سے نیچے چلے آئیں	کاروبار سے ناواقفیت۔ آمدنی سے زیادہ خرچ۔ جس کے باعث معیوب ذرائع کی خواہش۔
۳۰۔	باریک حروف	ضعف قلب۔ دنائت
۳۱۔	بندھے ہوئے حروف	خودداری احتیاط
۳۲۔	کشادہ حروف (اعلےٰ قسم)	صاف۔ پاک زندگی
۳۳۔	کشادہ حروف (ادنےٰ قسم)	عریاں زندگی
۳۴۔	خمدار حروف	بوالہوسی

ضمیمہ نمبر (۳)

مثالیں

میرا خیال تھا کہ تمہارا خط گذشتہ ڈاک

(اعلیٰ تحریر)

یہ تحریر میرے دوست ڈاکٹر محمد نعیم صاحب النصاری کی ہے اور اس خط کا جزو ہے جو اونھوں نے زنجبار سے تحریر فرمایا ہے۔ جو لوگ اون سے واقف ہیں وہ اس تحریر کو اون کے حالات کا آئینہ سمجھیں گے۔ "ک" کے بلند مرکز علوئے ہمت ظاہر کرتے ہیں۔ لانبے حروف سے عزم و حوصلہ مندی مترشح ہے۔ حروف و تحریر کی وضاحت سے خلوص و صاف دلی نمایاں ہے۔ مگر اس تحریر میں کسی قدر پریشانی دماغ کے بھی آثار ہیں۔ وہ محض وقتی حالات کے نتائج ہیں۔ یہ تحریر اوس وقت کی ہے جب وہ زنجبار میں پہلے پہل پہونچے ہیں۔ لیکن ابھی مستقل قیام کے سامان مہیا نہیں ہوئے۔

لیکن آپ مضامین بھیج دیجئے

یہ تحریر "ٹھوس" علمی مذاق کو ظاہر کرتی ہے۔ اس تحریر کے کاتب سے میں کامل واقفیت نہیں رکھتا، لیکن صرف تحریر سے میں اونکے متعلق جو رائے قائم کرسکا ہوں وہ قطعی ہیں۔ ہر حرف سے حوصلہ مندی نمایاں ہے۔ "مضامین" کی "ن" کی کشش سے وہ شوق علم ظاہر ہے جو ایک اپنی مستقل "سطح" قائم کرنا چاہتا ہے۔ آخر جزو لفظ کی ندرت سے غموض ظاہر ہے، خیالات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن کاتب اون کو صاف و واضح کرنے کی بجد کوشش کرتا ہے۔ "لیکن" میں "ک" کا مرکز غیر معمولی ہے۔ یہ شخص اپنے بلند خیالات کو سطح عام

پر لائنکی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ مرکز کا ابتدائی حصہ بتاتا ہے کہ خیالات کی ابتدا ر نہایت بلند ہوتی ہے۔ لیکن پھر آگے چلکر وہ جھک جاتی ہے اور عام سطح پر آجاتی ہے، مگر "ک" کے مرکز سے وہ خودداری نمایاں ہے، جس سے غرور کی بو آتی ہے، نقطوں سے خلوت پسندی ہویدا ہے۔

~~~~~~~~

نہ گرے دوس نگاہ سے کوئی

(صاف و مرتب تحریر)

یہ تحریر میرے مرحوم چچا حکیم سید محمد صاحب شاد غازی پوری کی ہے۔ مرحوم کی اعلےٰ دماغی قابلیت کا اندازہ آپ صرف اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ بغیر اعانت غیرے اونھوں نے ۶ ماہ میں خاصی استعداد انگریزی زبان میں پیدا کرلی تھی۔ غالب مرحوم نے گودوں میں لیکر بچپن میں دعا دی تھی کہ خدا اچھے ذہن رسا عطا فرمائے اور یہ سچ کہا تھا" گلے شگفت محمد ز باغ عبد اللہ"، عبد اللہ والد کا نام تھا۔

~~~~~~~~

کس پر نہیں ہے بھروسہ کسی کا

(ویران و خاموش تحریر)

کاتب تحریر معمولی عقل و فہم کا شخص ہے۔ تحریر سے کسی قدر پریشانی دماغ بھی ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ صورت عارضی ہے، اس لئے کہ حروف کی سادگی و یکسانیت سے اطمینان ظاہر ہوتا ہے۔ کاتب کی ایک اخلاقی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تنگ بیں ہیں، اون کے اخلاق کا یہ پہلو "وحشی" "ھ" سے ظاہر ہوتا ہے جو وسط سطر میں ہے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

بھیجی اور بادام ہمراہ

اس تحریر سے کاتب کی پریشانی دماغ مترشح ہوتی ہے۔ کاتب خوش اخلاق ضرور ہے، لیکن خود ستائی بھی شامل ہے۔ ایسا شخص اپنی زندگی میں مستقل اصول کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ایمانداری کا شائبہ ممکن ہے، لیکن دماغی توازن مفقود ہوگا۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے ایسے اشخاص کی باطنی زندگی تاریک ہوتی ہے "خیالی جنت" سے وہ زیادہ تر لطف اندوز ہوتا ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے

اس قسم کی تحریر بہت کم سامنے آتی ہے۔ اس سے خیالات کی بلندی ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ بلندی غرور و تکبر کی حد تک ہوتی ہے جس سے کاتب کے دماغی توازن میں نقص ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا شخص بعید حریص ہوتا ہے۔ اوس کی طمع جنوں کی حد تک ہوتی ہے۔ تحریر کی بجا وسعت سے آرام طلبی نمایاں ہے، لیکن کاہلی کی حد تک نہیں۔

زیر برسات کی ہر ہر زلف پریشاں خوب ہے

ہر نشیں کی ہر شہ ما کی پریشاں خوب ہے

جسمانی تندرستی سطح عام سے کم تر دماغی اہلیت۔ عجلت۔ تشاؤم۔ اس تحریر کی خصوصیات میں۔ ہر مصرع کا پہلا لفظ، بقیہ الفاظ سے کسی قدر علحدہ ہے، اس سے طبیعت کا جمود ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے شخص

کی سمجھ میں بات جلد نہیں آتی، لیکن جب آجاتی ہے تو وہ اوس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بخز رسی بھی اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا شخص اعضائے رئیسہ کی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ داہنی جانب جھکا ہونا ذکاوت احساس کی دلیل ہے جو عموماً امراض قلبی کے باعث پیدا ہوتی ہے۔

[illegible]

اس تحریر کا کاتب بد اخلاقی میں سزایاب ہو چکا ہے۔ غیر مکمل حروف سے خباثت ظاہر ہے۔ تحریر کا تموج چالاکی ظاہر کرتا ہے، حروف کی بیجا بلندی سے سوقیانہ روش مترشح ہے۔ ایسا شخص عموماً حریص ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی دولت اوس کے گھر آجائے۔ کاتب کو بازاری شاعری سے بھی دلچسپی ہے جو حروف کی طوالت سے ظاہر ہے۔

[illegible]

ایسی تحریر شاذ و نادر دیکھنے میں آتی ہے، الفاظ کا اس طور پر انتشار ضعف قلب کی دلیل ہے۔ اس خاص تحریر کے کاتب لقوہ میں بیمار ہو گئے تھے۔ "ک" کے مرکز تخیل کی بلندی ظاہر کرتے ہیں۔ چھوٹے حروف سے اونکی جزرسی ثابت ہوتی ہے۔ تحریر کا عام طرز اگر انتشار کو نظر انداز کر دیا جائے، تو عامیانہ ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ شخص اگر ضعف قلب میں مبتلا نہ ہوتا تو خطرناک ذہنیت کا شخص تھا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی

(بائیں جانب جھکی ہوئی تحریر)

اس تحریر کے کاتب ایک دفتر میں ملازم ہیں کسی قدر شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے، بے حد خود غرض ہیں۔ حروف کی کجی، ضد کی علامت ہے۔ ہر شخص کو مشتبہ نظروں سے دیکھنا ان کی خصوصیت ہو۔

[illegible]

اس تحریر کے کاتب ایک غیر معمولی ذہنیت کے شخص ہیں۔ تحریر کے ہر جز سے شعلے نکلتے ہیں۔ جذبات مبت قوی ہیں، اگر دش نے ناموزوں جگہ پر بٹھلا دیا ہے۔ ورنہ ایسا شخص جو بھی کام کرتا، یا ہیں یکہ و تنہا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ ایسی تحریر کا مالک صحیح و مناسب اخلاق کا بھی حامل ہو۔ جس جانب اوسکی طبیعت مائل ہو جائیگی وہ کمال پیدا کریگا اور اوسکی جرات ناقابل مدافعت ہوگی۔ نقطے جس قوت کے ساتھ لگائے گئے ہیں وہ آپ اپنی زبان ہیں۔

[illegible]

اس تحریر کے حروف مدور ہیں۔ تحریر قدرے گنجان لیکن پست ہے۔ یہ میرے ایک قدیم شناسا کی تحریر ہے۔ آدمی بہت معمولی پڑھے لکھے تھے، مذہبی مباحث سے بیحد دلچسپی تھی، نہایت متعصب سنی تھے صحت بیحد خراب رہتی جس کے باعث اون میں کاہلی بیحد آگئی تھی، بہت کینہ پرور تھے۔

[illegible]

(غیر مکمل حروف)

یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جس سے مجھے ذاتی تعارف نہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہ نمونہ عنایت کیا ہے۔ اونکی روایت سے میں اس تحریر کے کاتب کو اصولاً ضدی اور طعنہ زن سمجھتا ہوں۔ غیر مکمل حروف سے خباثت ظاہر ہوتی ہے، میں نے اس طرح کے غیر مکمل حروف کم دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عدم تکمیل پست خیالی پر دال ہے "ک" کے پست مرکز بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

بکھر کہ دند و مسی اشتر نام پہ رز

میرے کتب خانہ میں ایک قلمی دیوان حافظ ہے اوس کے ابتدائی صفحہ پر یہ مصرع لکھا ہوا ملا۔ تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کاتب کی باطنی زندگی پاک وصاف نہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہ سخی بھی رہا ہو۔ لیکن صرف احباب اوس سے فائدہ حاصل کرسکے ہوں گے الفاظ کی آمیزش سے خیالات کی ترتیب کا اندازہ ہوتا ہے۔

کہو سہ حور کہاں سے جنت کیا

(روال تحریر)

کاتب سریع الخیال ہے۔ بدذوقی ہے۔ حروف کی پستی نے نقص پیدا کردیا۔ ورنہ یہ تحریر بے مثل ہوتی یہ پستی غم کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ میں نے اونکی ابتدائی تحریریں بھی دیکھی ہیں اوس میں یہ پستی نہ تھی۔ داہنی طرف کا میلان ہمدردی کی علامت ہے۔

میں نا منقدہ دیا بلکہ بھلنے کو تم نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا

آپ اس تحریر کی ظاہری خوبصورتی سے دہوکا نہ کھائیں۔ اس تحریر کے متعلق جس درجہ میرا تجربہ

وشاہدہ ہے، اوس قدر کسی تحریر کے متعلق نہیں ہے۔ ایسی تحریر کے کاتب بیحد چالاک، سازشی اور نہایت درجہ خطرناک ہوتے ہیں، حروف کا چھوٹا ہونا خباثت کی دلیل ہے، حروف کا اتحاد ان کی سازش پسند طبیعت کو ظاہر کرتا ہے آپ مشکل سے کسی دو حرف کے درمیان خالی جگہ پائیں گے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر ایسے لوگ اخلاقاً بیحد بزدل ہوتے ہیں۔ "ک" کے مرکز بھی بلند نہیں ہیں۔ اس سے ان کی پست طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سطر کا ہموار ہونا اون کی مستقل بد اخلاقی کی علامت ہے۔

〰〰〰

الٰہی سے کرے کوئی اندازۂ تحمیل وفا

مذکورۂ بالا اور مذکورۂ ذیل دو مصرع ایک ہی شعر کے ہیں۔ ایک احباب کی اسی غزل کی فرمائش تھی۔ جیسا کہ آپ کو پہلے لفظ "اسی" سے معلوم ہوگا۔ آدمی نہایت سخی اور متین ہیں۔ "الف" کی نیچے کی جانب کشش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ سخاوت کے خودداری بھی ہے۔ اونکے اخلاق کا کسی قدر ناقص پہلو یہ ہے کہ وہ خطرات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ حفاظت کی خواہش بزدلی کی حد تک ہے۔ مصرع کا آخری نصف حصہ ابتدائی حصہ سے کسیقدر نیست ہے۔ یہ اونکی پست ہمتی کی دلیل ہے۔ پہلے لفظ کی آویزش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اونکے تخیل کی ابتدا۔ مرتب ہوتی ہے لیکن آگے چلکر یہ ترتیب قائم نہیں رہتی۔

〰〰〰

میں نے نام محبت نے خدا العالمین

اس تحریر کو اگر آپ خوردبین سے دیکھیں تو اس میں تموج معلوم ہوگا۔ "نام" کی میم "اللہ" "خدا" کے الف میں یہ تموج صاف نمایاں ہے۔ ایسی تحریر کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اونکے اخلاق سے کامل واقفیت نہیں ہے۔ تحریر سے میں یہ معلوم کرسکا ہوں کہ اسکے کاتب سے جعل و تخریب کا سرزد ہونا اگر قطعی نہیں تو ممکن ضرور ہے۔ آدمی نہایت چالاک ہیں۔ "نے" "میں" "ی" کی لمبنی انکی پستی خیال ظاہر کرتی ہے۔ مصرع کے ابتدائی الفاظ کا انتشار اونکی غیر مرتب ذہنیت پر دال ہے۔ "نام" کی غیر معمولی ترکیب اونکی ذریعہ کاریوں کی جدت ظاہر کرتی ہے۔

〰〰〰

ضمیمہ نمبر (۴)

دستخط - اوسکے علامات و اثرات

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱ -	اصل متن یا بقیہ تحریر سے بڑا دستخط	خودستائی - دوسروں کی رائے کو حقیر جاننا (ملاحظہ ہو دستخط امان اللہ خاں صفحہ ۲۰)
۲ -	اصل متن یا بقیہ تحریر سے چھوٹا دستخط	دنیاوی اعزاز سے بے نیازی - اور اگر کسی معمولی شخص کا دستخط ہو تو مصنوعی انکسار -
۳ -	دستخط جس میں پورا نام واضح ہو -	فنون لطیفہ سے دلچسپی - اعلیٰ تخیل (ملاحظہ ہو دستخط ڈاکٹر اقبال صفحہ ۲۲)
۴ -	دستخط جس میں نام کا اختصار ہو -	معمولی ذہنیت - قوت عمل کی کمی
۵ -	پیچیدہ دستخط جو مشکل سے پڑھا جائے	ہر کس و ناکس سے مشتبہ رہنا - حکومت و طاقت کا شوق - خطرات کا خوف مگر دوسروں کو مرعوب رکھنے کا خیال (دستخط نمبر ۱۱)
۶ -	دستخط کا ابتدائی حصہ بالائے خط	نسب و نسل پر نازاں -
۷ -	پورا دستخط بالائے خط	اظہار شخصیت کا شوق - حوصلہ مندی -
۸ -	دستخط کے تحت میں ناہموار خط	لہو و لعب کا شوق -
۹ -	دستخط کے بعد نقطہ یا باریک خط	دور اندیشی
۱۰ -	دستخط کے بعد نقطہ اور کشیدہ خط	جارحانہ طرز عمل سے نفرت اور دوسروں سے بے اعتمادی -
۱۱ -	دستخط کے بعد نقطہ اور کشیدہ خط جو گھومتا ہوا دستخط کے نیچے آجائے -	موقع کا منتظر
۱۲ -	دستخط کے بعد نقطہ اور کشیدہ خط جو گھومتا ہوا دستخط کے اوپر آجائے -	ہوشیار - خودغرض - جارح - خطرات میں مبتلا ہونے کے لئے آمادہ مگر زندگی میں ناکامیاب -

نمبر شمار	علامات	اثرات
۱۳	دستخط کے بعد نقطہ اور کشیدہ خط جب نیچے سے داہنی طرف آکر بائیں جانب چلا جائے۔	انتہائی خودغرض و ناقابل اعتبار و مغلوب الغضب۔
۱۴۔	دستخط جس کے آخری حرف کی کشش پیچکش کی مانند ہو	نازک دماغی و ہنرمندی
۱۵۔	سادہ دستخط جسکے تحت میں کوئی لکیر و خط نہو	سادگی و خودداری (اگر معمولی شخص ہو تو) عمومیت۔
۱۶۔	ایک ہی کاتب کے مختلف نوعیت کے دستخط	ناقابل عمل تخیل۔
۱۷۔	اگر دستخط کی شان خط متن سے مختلف ہو۔	کاتب کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری و باطنی۔ موخرالذکر عموماً تاریک۔ ایسی صورت میں متعلم کو چاہیئے کہ وہ زیادہ تر دستخط سے نتائج اخذ کرے۔
۱۸۔	مدور دستخط	شقاوت۔ ذہانت۔ خودغرضی
۱۹۔	لانبا دستخط	ایسے شخص کا اصول عمل "خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت" ہوتا ہے (ملاحظہ ہو دستخط نمبر ۹)
۲۰۔	چوڑا دستخط	تجربہ، ثقاہت، مگر ضعف قلب (ملاحظہ ہو دستخط نمبر ۶)

دستخطوں کے نمونے

(۱)

یہ عام دستخط ہے۔ حروف کی آویزش سے ترتیب خیال کا پتہ چلتا ہے، لیکن حروف کا چھوٹا ہونا اور "ل" کی کشش خیالات کی پستی ظاہر کر رہے ہیں۔ ایسے اشخاص زندگی کی عام سطح پر ہیں۔ ان کے اخلاق کی پستی و بلندی دونوں قابل نظر انداز ہیں۔ مگر صاحب دستخط کا ایک کیرکٹر نہایت واضح ہے اور وہ اوس کی سخاوت جو آل اندیشی کی حدود سے متجاوز ہے۔ حروف کے بالائی حصوں کی مساوی بلندی نے اوس کے مستقبل پر مہر ثبت کر دی ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یا دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی بہت بلند نہیں جا سکتے۔

(۲)

یہ بھی عام دستخط ہے لیکن نمبر ۱ سے کسی قدر اخلاقاً ممتاز ہے۔ خیالات کی صفائی اوسکی خصوصیت ہے۔ "الف" کی بلندی اور نمود بلندی و آزاد خیالی پر دال ہے، لیکن یہ شخص اپنی بلند خیالی کو ایک سطح پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ "ن" کی کشش اور بالخصوص اوس کا آخری حصہ اور دستخط کے خط زیریں کی کشش سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص اگر آج نہیں تو کسی نہ کسی دن پست اخلاقی میں ضرور مبتلا ہوگا اور اس پر قائم رہے گا۔

(۳)

یہ دستخط نمبر ۲ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دستخط پانچ لفظوں سے مرکب ہے۔ پہلے تین الفاظ جدا جدا ہیں۔ اور آخری دو لفظ آویزاں ہیں۔ تحریر کی روانی خیالات کی روانی پر دال ہے۔ اس تحریر سے قوت عمل نمایاں ہے گو تخیل کی بلندی تقریباً مفقود ہے۔ اس شخص کی ابتدا معمولی ہوتی ہے لیکن انجام نہایت مرتب ہوتا ہے۔ عموماً ایسے لوگ صرف مقصود کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرائع کی خوبی و بدی سے انکو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ خلوت پسندی تحریر سے ہویدا ہے۔

(۴)

یہ دستخط نمبر ۳ سے کسی قدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بلندی تخیل کا شائبہ ہے گو قوت عمل کی اوسی حد تک کمزوری ہے۔ نقطوں کا کلیتاً فقدان غائت جزرسی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن افلاس کے ساتھ ساتھ۔

(۵)

یہ دستخط قابل لحاظ ہے۔ اس شخص کی زندگی کے ظاہر و باطن دونوں پہلو یکساں صاف ہیں حروف و الفاظ کی آویزش ترتیب عمل کا پتہ دیتی ہے۔ اس شخص کو فنون لطیفہ سے خاص شوق ہے۔ اگر یہ مصوری کرے تو نہایت کامیاب ہوگا۔ ایسے لوگ خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں گو آخری جز دلفظ سے بلندی ہمت ضرور مترشح ہے۔

---

(۶)

یہ دستخط مشکل پسند ذہنیت کا نمونہ ہے۔ اس شخص خاص کے متعلق مجھے کوئی ذاتی واقفیت نہیں لیکن میں نے ایسے لوگ اکثر جعل پسند پائے ہیں۔ وسط کی متحرک لکیریں فریب ظاہر کر رہی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دستخط کی بلندی سے اعلےٰ تخیل ظاہر ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جو بلندی ہے اوس سے ذہنیت کا بدترین استعمال نمایاں ہے۔ تحت لفظ میں نقطوں کی غیر موجودگی دناءت کی دلیل ہے

---

(۷)

یہ دستخط بھی معمولی عقل و فہم ظاہر کرتا ہے۔ ابتدائی جزو "جمیل احمد" کا اختصار ہے، یہ اختصار قوت عمل کی کمزوری پر دال ہے، ایسا شخص دنیا میں کم کامیاب رہتا ہے۔ آخری لفظ کی وضاحت صاف خیالی ضرور ظاہر کرتی ہے اور "ی" کی بالائی کشش پرواز خیال پر دال ہے۔ ایسے دستخط اُردو میں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

---

(۸)

یہ بلند دستخط اعلے تخیل و مرتب اصول عمل کی علامت ہے۔ خوردبین سے مجھے اس دستخط میں لہریں نظر آئیں۔ جو ممکن ہے کہ وقتی ہوں۔ دستخط کا درمیانی خط غور طلب ہے۔ یہ خط نیچے سے اوپر کو جاتا ہے اور تقریباً کل دستخط سے ہوکر گذرتا ہے۔ یہ علامت ایثار و قربانی کی ہے۔ ایسا شخص دوسروں کے اغراض و مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اگر دستخط اس کے برعکس ہوتا تو اوس سے خودغرضی نمایاں ہوتی۔

---

(۹)

یہ لانبا دستخط قوت عمل کی کمزوری پر دال ہے، ایسا شخص دوسروں کے لئے "ناصح مشفق" اچھا بنتا ہے۔ کشش کی بلندی اور پھر اوس کے بعد رجحان پستی اوسکی تخیل کی دنائت پر دال ہیں۔

(۱۰)

یہ دستخط ممتاز اصول عمل کا پتہ دیتا ہے۔ ایسا شخص بعید دور اندیش اور چالاک ہوتا ہے۔ حروف و الفاظ کی آویزش سے اوسکی مرتب ذہنیت معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ دستخط بلند نہیں ہے۔ اس لئے خیالات ہمیشہ پستی کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کی زندگی بھلی ہو یا بُری نہایت درجہ تناسب و ترتیب رکھتی ہے۔ مگر اوسکی زندگی کا ہر پہلو دوسرے پر اس درجہ منحصر رہتا ہے کہ اگر اوس کی زندگی کی زنجیر کی ایک کڑی بھی نکل گئی تو سارا شیرازہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس دستخط میں نقطوں کا فقدان دنائت کی دلیل ہے۔

(۱۱)

یہ دستخط عجیب و غریب ذہنیت کا آئینہ ہے۔ ایسا شخص ہر کس و ناکس سے مشتبہ رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی قوت عمل پر اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔ دوسروں کو مرعوب رکھنے کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ لیکن اخلاقی جرات کی کمزوری خود کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی ہمیشہ کوشاں رہتی ہے۔ تحریر کا داہنی جانب جھکنا خیالات کی بلندی ضرور ظاہر کرتا ہے۔ نقطوں کی کلیتاً غیر موجودگی دنائت کی دلیل ہے۔

(۱۲)

یہ دستخط تحریر نمبر۱۶ سے مشابہ ہے، اور میری جو رائے تحریر نمبر۱۶ کی بابت ہے وہی اس دستخط کے متعلق بھی ہے۔

داستانِ حسن و عشق کا ورق خونیں

اور

جلوۂ بے محابا کی ایک قاتل رات

اب سے تقریباً دو ہزار سال قبل، ایک خوبصورت بجرا جس پر حد درجہ نزاکت کے ساتھ بہ رنگ طلا کا کام کیا گیا تھا، وسیائے نیل میں تیزی سے جا رہا تھا۔ اس قدر تیزی سے جتنی کہ پچاس بڑے بڑے چپوؤں کی جنبش سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ ان لمبے لمبے چپوؤں سے جو دونوں طرف جلدی جلدی متحرک تھے، بجرا بالکل ایسا نظر آتا تھا، جیسے کوئی عفریت پیکر کھنکھجورا سطح آب پر اپنی رفتار کے نشان چھوڑتا جا رہا ہے۔

یہ بجرا بہت سبک ساخت کا تھا اور اس کے دونوں سرے اوپر کی طرف اس طرح اُٹھے ہوئے تھے کہ کشتی نے بالکل ہلال کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کے اگلے سرے پر مینڈھے کا سر اور اس پر ایک طلائی کرہ بنا ہوا تھا۔ جو اس امر کا پتہ دیتا تھا کہ اس کا مالک شاہی خاندان کا کوئی فرد ہے۔ بجرے کے وسط میں ایک مسقف شہ نشین تھی، جس پر نہایت خوبصورت زرکار، نقاشی کی گئی تھی، اور پہلو میں چار چھوٹے چھوٹے جھروکے روشنی کیلئے بنے تھے۔ بجرے کے دونوں سروں پر دو آراستہ کمرے تھے جو قدیم مصری تحریر کے نقوش رنگیں سے آراستہ تھے ان میں سے ایک کمرہ جو نسبتاً کچھ وسیع تھا ایک اور چھوٹا کمرہ تھا جس پر ایک مثلثی جلوخانہ تعمیر تھا۔

سُکان کی جگہ دو بڑے بڑے چپو میخوں پر نصب تھے، جن پر مختلف قسم کی رنگین دھاریاں بنی ہوئی تھیں یہ سُکان بجرے کے پچھلے حصہ میں پانی کے اندر اس طرح بڑھتا چلا گیا تھا جیسے ہنس کے جھلی دار پاؤں۔ ان دونوں چپوؤں کے دستوں پر جو سر اور چہرے بنے ہوئے تھے ان کی ٹھوڑیوں پر سینگ نکلے ہوئے تھے ۔۔ اور ۔ ناخدا

اور عرشہ پر کھڑا ہوا اس سُکّان سے کام لے رہا تھا یہ ایک سیاہ فام شخص تھا اور اس کا رنگ بالکل ایسا تھا جیسے سانچہ میں ڈھلے ہوئے نئے پیتل کا ہوتا ہے۔ اسکے چہرہ کی سیاہ جلد پر نیلی نیلی چمکدار دھاریاں نظر آرہی تھیں، آنکھیں بڑی بڑی مگر حد درجہ بھیانک تھیں، بال موٹے اور سیاہ تھے جن کی مینڈھیاں گوندھ کر ادھر ادھر ڈالدی گئی تھیں، ہونٹ موٹے موٹے تھے اور رخساروں کی ہڈی ابھری ہوئی۔ کان اس طرح نمایاں تھے جیسے کی تعمیر کے بعد انھیں علحدہ لگا دیا گیا ہو۔ گلے میں چھوٹے موتیوں کا ایک پچلڑا ہار پڑا ہوا تھا اور ستر پوشی کے لئے ایک چھوٹا سا موتی تہمد اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ دور سے اسوقت یہی ایک انسان کشتی پر نظر آتا تھا، کیونکہ ملاحوں کی جماعت چپوؤں پر جھکی ہوئی تھی اور انکے جسم بجرے کے اطراف سے اس طرح چھپے ہوئے تھے کہ ان کی موجودگی کا پتہ صرف ان چپوؤں کی حرکت سے چلتا تھا جو پنکھے کی تیلیوں کی طرح بجرے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے باقاعدگی کے ساتھ پانی سے ابھر ابھر کر پھر اُس میں جا پڑتے تھے

ہوا بالکل بند تھی اور بجرے کا بڑا مثلثی بادبان لپیٹ کر ریشمی ڈور سے کچھ بلندی پر مستول کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اہل کشتی کو اب ہوا چلنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

دوپہر کا آفتاب اوپر سے شعاعیں نہیں بلکہ سروں پر تیر برسا رہا تھا اور ساحل کی ریت آفتاب کی آتشبار کرنوں کو اس طرح منعکس کر رہی تھی گویا زمین سے آگ کی لپٹ نکل رہی ہے۔ افق پر گرم اور دھندلے گرد وغبار کی چادر دھوئیں کی طرح تنی ہوئی تھی، بادل کا کوسوں پتہ نہ تھا اور فضا اداس تھی۔ دریائے نیل کا آہستہ خرام پانی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سو رہا ہے۔ سطح آب ایسی نظر آتی تھی گویا اُس پر رانگ پگھلا کر بچھا دیا گیا ہے اور کنول کے پھول ایسے ساکن تھے گویا کسی چابکدست سنگتراش نے سنگ مرمر کی سطح پر تراش کر انھیں چھوڑ دیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی چمکدار مچھلی دریا میں اُچھل کر مہار کے اندر ایک نقرئی چمک پیدا کر دیتی تھی اور اس طرح پانی کے اس سکون میں کچھ اضطراب پیدا ہو جاتا تھا، دریا کے کنارے سنسان پڑے تھے اور تمام ماحول پر ایسی ہولناک افسردگی، ایسی بھیانک اُداسی چھائی ہوئی تھی گویا کہ وہ ایک وسیع قبرستان ہے۔ یہ اُداسی اُس ابوالہول کی سی اُداسی تھی، جس کی آنکھیں ریگزار صحرا کی طرف تکتے تکتے پتھرا گئی ہیں، اور جو آجتک اس قابل بھی نہیں رہا کہ وہ اس پشتۂ سنگیں سے الگ ہو سکے جس پر وہ مسلسل بیس صدی سے اپنے ناخن تیز کر رہا ہے۔

ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا، گویا تمام کائنات گونگی ہو گئی ہے، اگر کسی قسم کی آواز کبھی سنائی بھی دیتی تھی۔ تو وہ گھڑیالوں کی "چیخ پکار" تھی جو گرمی کی شدت سے گھبرا کر دریا کے کنارے لمبی لمبی گھاسوں میں لوٹ رہے تھے یا اُن کلنگوں کی جو کسی آہٹ سے چونک کر اپنی پیٹ سے لگی ہوئی ٹانگیں اور پروں میں چھپے ہوئے سر باہر نکال کر چیختے چلاتے، فضا کو چیرتے ہوئے کسی کھجور کے درخت پر جا بیٹھتے تھے۔

دریائے نیل کے ہموار اور صاف پانی میں، بجرا ایک خوبصورت ابابیل کی طرح اڑتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے ایک کف آلود نقرئی لہر پیدا ہوتی جاتی تھی جو مٹنے کے بعد بھی کہیں کہیں بلبلے چھوڑ جاتی تھی۔ زرد ساحل، نیلے آسمان اور نیلے دریا کے درمیان تیز رفتار کشتی کے اندر سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی لپٹا ہوا کاغذ جلد جلد کھل رہا ہے۔ اس وقت آسمان اور دریائے نیل دونوں اس درجہ ہم رنگ تھے کہ یہ تمیز کرنا دشوار تھا کہ آسمان کا عکس پانی پر پڑ رہا ہے یا پانی کا آسمان پر۔

ساحل کا منظر برابر بدلتا جا رہا تھا، کبھی مصری فن تعمیر کے عظیم الشان کارنامے سامنے آجاتے تھے اور کبھی وہی ویلان وسنسان میدان، کہیں آثار قدیمہ کے وہ عبرت خیز کھنڈر نظر آنے لگتے تھے جو ہزاروں سال سے زمانہ کا گرم و سرد دیکھتے آ رہے ہیں۔ اور کہیں خشک جھلسے ہوئے پہاڑ جن کے عمیق شگاف دور سے سیاہ دھاریوں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ پہاڑیاں دکھائی دیتیں جو بالکل قبروں کے گنبدوں کی طرح بلند چلی گئی تھیں۔ اور کبھی بھورے رنگ کے وسیع میدان جن میں پتھر کی کانیں اپنا سیاہ منھ کھولے ہوئے جا بجا نظر آتی تھیں۔

الغرض منظر جو بھی ہو، اس سرزمین کی خشکی و بے رونقی ہر جگہ وہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت یہاں کے نقوش میں سبز رنگ سے کام لینا بھول ہی گئی ہے۔ البتہ البتہ کہیں افق میں کھجور کا کوئی حقیر سا درخت کیکڑے کے پاؤں کی طرح اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ضرور نظر آجاتا تھا یا کوئی خاردار درخت جس کے جھلسے ہوئے زرد پتے تلوار کے برنجی پھلوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

بجرہ کے اندر باریک گھاس کی بنی ہوئی چٹائی کا نہایت نفیس فرش بچھا ہوا تھا اور کنارے ایک نازک سی مسہری تھی، جس کے پائے پنجۂ شیر کی وضع کے تھے۔ اسوقت اس مسہری کے تکیہ پر ایک نہایت ہی خوبصورت سر سہارا لئے ہوئے تھا۔ یہ وہ سر تھا جس کی صرف ایک جھلک کے عوض ایک بار آدھی دنیا ہاتھ سے کھوئی جا چکی تھی، یہ اُس عورت کا سر تھا جسکا مثل اسوقت تک پیدا نہ ہوا تھا اور یہ وہ عورت تھی جسے اگر پیکر حسن و جمال کہا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ اس کا حسن اس قسم کا تھا جو کبھی خواب ہی میں نظر آجاتا ہے اور جو اتفاق سے یوں نظر آجائے تو پھر نیند حرام کر دیتا ہے۔ یہ مجسمۂ جمال و رعنائی، یہ پیکر شباب خوش ادائی۔ مصر کی مشہور ملکہ قلوپطرہ تھی جو اسوقت بجرے کے اندر تکیہ کے سہارے سے مسہری پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی محبوب کنیز شارمین [illegible] جھل رہی تھی اور دوسری نوجوان کنیز گھاس کے پردوں کو جو کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تھے پانی میں خوشبو ملا کر تر کر رہی تھی تاکہ ہوا کا جھونکا آئے تو معطر ہو کر آئے۔

مسہری کے قریب ایک سفید مخروطی شکل کا مرمری گلدان رکھا ہوا تھا، جس کی گردن ہنس کی طرح لانبی پتلی اور سڈول تھی۔ اس میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جس میں چند آبی رنگ کے نیلوفر تھے اور چند سرخ کنول کے پھول، جن کی پنکھڑیاں بالکل ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے دمِ رقص حسین دیوی آئسز کی انگلیاں۔

قلوبطرہ، یونانی لباس میں ملبوس نہ تھی۔ وہ پرستش گاہ سے واپس آرہی تھی اس لئے مصری لباس پہنے ہوئے تھی اور اب اپنے گرمائی محل کو واپس جارہی تھی۔ اس کے سر پر ایک ہلکا سا طلائی خود تھا، جس کی صورت گِدھ کی طرح تھی، اس کے دونوں بازو پنکھے کی طرح نیچے کی طرف لٹکتے ہوئے تھے اور کنپٹی کو ڈھکتے ہوئے گردن تک پہونچ رہے تھے۔ ان میں دونوں طرف دو سوراخ تھے جن سے ملکہ کے دونوں کان خوبصورت چھوٹی سیپیوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ خود کے مقدس گِدھ کی دُم پُشتِ سر کے اُس حصہ پر تھی، جہاں عورتیں جوڑا باندھتی ہیں۔ اور اس کے جالدار جسم میں جس پر مختلف رنگ کی مینا کاری کی گئی تھی۔ ملکہ کے سر کا بالائی حصہ چھپا ہوا تھا۔ اس گِدھ کی خوبصورت مرصع گردن خم کھائی ہوئی ملکہ کی پیشانی تک پہونچ رہی تھی جہاں وہ اس کے حسین چہرہ کے لئے زینت کا بھی کام دیتی تھی۔ ملکہ کے بال جوناگن کی طرح سیاہ اور چمکدار تھے خود سے باہر نکلے ہوئے تھے اور بل کھاتی ہوئی لٹیں اُس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ شانہ و گردن پر سبک سی زرہ پڑی ہوئی تھی جس میں مختلف رنگ کے جواہر جڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت باریک کتاں کے لباس میں ملبوس تھی۔ جس کے اندر سے اس کا جسم دور سے ایسا جھلکتا تھا۔ جیسے وہ بالکل عریاں ہو اور قریب سے اس طرح نظر آتا تھا جیسے نگاہ پردۂ حجاب سے گزر کر وہاں تک پہونچ رہی ہو۔ اس ملبوس کی آستینیں شانہ پر چُست تھیں، لیکن کہنیوں پر اس قدر فراخ کہ ملکہ کے سڈول بازو اور مرمریں نازک ہاتھ اس کے اندر سے صاف نظر آتے تھے، بانہوں سے متعدد طلائی کڑے لپٹے ہوئے تھے اور ہاتھ کی ایک اونگلی میں خوبصورت انگوٹھی تھی جس پر کوئی مقدس تصویر منقوش تھی۔ اس لباس پر ایک کمربند بھی تھا جس کی ہڑیں آگے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ پاؤں میں سبک سی زرپائیاں تھیں۔ جن کی نوکیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں اور پچھلا حصہ دوال کے ذریعہ سے ٹخنہ سے بندھا ہوا تھا۔

اس وقت ملکہ قلوبطرہ کے چہرہ سے وہ اطمینانِ قلب ظاہر نہیں ہوتا تھا جو ایسی جاہ و حشم والی ملکہ میں پایا جانا چاہیے اور وہ اس وقت مسہری پر لیٹی ہوئی بے قراری سے کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے جسم سے کبھی کبھی لباس بے ترتیب ہوجاتا تھا اور جسے شارمیون بار بار درست کرتی جاتی تھی۔

قلوبطرہ:- "اس کمرہ میں تو دم گھٹا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے تنور میں ڈال دیا ہے۔"

یہ کہکر اس نے اپنی زبان سے ہونٹوں کو تر کیا جو پھول کی پتی کی طرح خشک ہوگئے تھے۔ اور ہاتھ بڑھا کر ایک تپ زدہ مریض کی طرح کوئی پیالہ ڈھونڈھنے لگی جو وہاں نہیں تھا۔

شارمیون نے جو ہر وقت اپنی ملکہ کی طرف متوجہ رہتی تھی۔ فوراً تالی بجائی اور فوراً ایک حبشی غلام حاضر ہوا جو ایک چھوٹا سا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے ڈھیلے ڈھالے دامن البانوی وضع کی عبا کی طرح ادھر ادھر لٹکے ہوئے تھے اور چیتے کی ایک کھال اس کے شانوں پر پڑی ہوئی تھی۔ اُسکے بائیں ہاتھ میں ایک کشتی تھی۔ جس میں چند پیالے اور تربوز کی قاشیں رکھی ہوئی تھیں اور داہنے ہاتھ میں چائے دانی کی وضع کا ایک آفتابہ تھا۔

غلام نے نہایت سلیقہ کے ساتھ ہاتھ اونچا کرکے ایک پیالہ میں شربت ڈالا اور ملکہ کے حضور میں پیش کیا۔ قلوبطرہ نے اپنے نازک لبوں سے اس پیالہ کو مس کیا اور پھر ہٹا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ شارمیون کی طرف متوجہ ہوئی۔ اپنی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے جن میں حیات افروز نور چمک رہا تھا کنیز کی طرف دیکھا اور بولی :-

"آہ شارمیون! میں تو اس زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔"

شارمیون نے جو فوراً سمجھ گئی تھی کہ ملکہ کوئی راز کی بات کہنے والی ہے، بہت ملال انگیز ہمدردانہ صورت بنالی اور اپنی ملکہ سے اور زیادہ قریب ہوگئی۔

قلوبطرہ۔ میں سخت عاجز آگئی ہوں۔ یہ مصر مجھے پیسے ڈالتا ہے۔ مجھے ہلاک کئے دیتا ہے۔ یہ آسمان جس کے نیلگوں رنگ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مجھے یقیناً تباہ کردے گا کیا ممکن جو کبھی کوئی لکۂ ابر آجائے۔ جب دیکھو یہ خونیں رنگ آفتاب اوپر سے ایک خونخوار دیو کی طرح گھورتا رہتا ہے۔ ہائے شارمیون! اگر کوئی پانی برسادے تو میں ایک ایک قطرہ کے عوض ایک ایک دُرِ شاہوار بخشنے کے لئے طیار ہوں۔ اس بے رحم آسمان کی متورم آنکھوں سے کبھی کوئی ایک آنسو بھی نہیں ٹپکتا، جس سے یہ خشک و ویران سرزمین اپنی پیاس بجھا سکتی۔ آسمان کیا ہے کسی مقبرہ کا گنبد ہے آسمان! مردہ آسمان! حنوط شدہ لاشوں کی طرح خشک ہے۔ یہ مجھے ایسا ناگوار معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے شانوں پر ضرورت سے زیادہ وزنی چیز ڈال دی ہے۔ یہ مجھے گھبرائے دیتا ہے سہمائے دیتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ سر ٹکرا کر اسے پھوڑ دوں۔ یہ ملک بھی کیسا بھیانک ملک ہے۔ یہاں کی ہر چیز افسردہ۔ ہر چیز رمز آمیز اور ہر چیز بعید از فہم ہے۔ خدا جانے اس کے اندر اتنی خوفناک چیزیں اور عجیب الخلقت یادگاریں کہاں سے آگئیں۔ یہ دیوزاد سنگین بت جو غالباً ازل سے یونہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ہاں میں ان کے اس جمود سے تنگ آگئی ہوں۔ ان سے میری آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ نہ معلوم وہ شخص کون ہوگا جو ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیگا۔ اور ان کی وہ پاسبانی جو صدیوں سے مسلسل قائم ہے۔ ختم ہو جائے گی۔ پتھر اگرچہ پتھر ہے لیکن اس کو بھی ایسی

حالت سے تنگ آجانا چاہیئے۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہ لس آقا کے منتظر ہیں کہ وہ تشریف لائے اور یہ اُس کے استقبال و اعزاز کے لئے اپنی کوہستانی کرسیاں کو چھوڑیں۔ یہ عظیم الشان ابوالہول آخر کس گلہ کا پاسبان ہے جو کتے کی طرح زانو توڑے ہوئے نگرانی کر رہا ہے، اسکی سنگین آنکھیں کیوں اس طرح ابدیت اور لانہایت کیطرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں، وہ کون سا راز ہے جو اس کے سنگین پیکر میں بند کرکے اس کے لبوں کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ جس طرف دیکھئے خوفناک اور عجیب الخلقت چیزوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہاں کے جانور، یہاں کے درخت، یہاں کے آثار، الغرض یہاں جو کچھ ہے ویران ہے یا مہیب ہولناک ہے یا عجیب۔

دیواروں پر، ستونوں پر، چھتوں پر، فرشوں پر، مندروں میں قبرستانوں کی عمیق ترین قبروں پر، حتے کہ زمین کی ایسی گہرائیوں میں جہاں روشنی بھی تاریک نظر آتی ہے، الغرض ہمیشہ اور ہر جگہ بدنما مصری خط کی لاانتہا قطاریں ہیں، جو ایک لامعلوم زبان میں ان باتوں کا حال بیان کرتی ہیں جن کا اب کسی کو علم تک نہیں ہے اور جو یقیناً زمانۂ ماضی کی مفقود و نابود شدہ مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں یا وہ عظیم الشان مدفون شدہ عمارتیں ہیں۔ جن میں ایک پوری قوم صرف ایک بادشاہ کا کتبۂ مزار لکھنے کے لئے ذبح کر ڈالی گئی تھی، الغرض جدھر دیکھو ازدھا اور پتھر، پتھر ہے اور راز۔

جہاں نباتات دیکھنے کو جی چاہتا ہے وہاں سنگریزے نظر آتے ہیں۔ جس جگہ شجر دار راہیں ہونا چاہئے وہاں سنگین ستونوں کی قطاریں ہیں۔ نرم زمین کی بجائے پتھر کا فرش ہے اور آسمان کی جگہ سقف سنگی، گویا ابدیت کو اس طرح قید کر دیا گیا ہے۔ انسان کی مختصر اور فانی زندگی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ زینے بنائے ہیں کہ ان پر دیوزاد ہی چڑھیں تو چڑھ سکیں۔ ورنہ انسان کا قدم تو ان پر سیڑھی کی مدد کے بغیر پہونچ نہیں سکتا۔ ستون تعمیر کئے ہیں کہ سو آدمیوں کے بازو بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ بھول بھلیاں بنائی ہیں کہ ان میں انسان برسوں سرگرداں رہے لیکن ان کے پیچ و خم ختم نہ ہوں۔ جہاں دیکھو دہشت و ہیبت کی فراوانی، تکبر و افتخار کی نمائشیں!!

اے شارمیون دیکھ تو۔ دنیا کے تمام ملکوں میں مردوں کی لاشیں جلا دی جاتی ہیں۔ اور ان کی خاک خاک سے ملجاتی ہے۔ لیکن یہاں زندہ آدمیوں کو سوائے اسکے کوئی کام نہیں کہ مُردوں کی حفاظت کیا کریں۔ عجیب عجیب مسالے ان لاشوں کو محفوظ رکھنے کے لئے طیار کئے جاتے ہیں تا کہ روح رہے یا نہ رہے لیکن جسم ضرور باقی رہے۔ موجودہ مصری قوم کے زیر قدم بیسیوں قومیں دبی پڑی ہیں۔ اس شہر کے نیچے نہ جانے کتنے شہر اور موجود ہیں۔ ہر نسل جو گذر جاتی ہے وہ اپنے بعد حنوط شدہ لاشوں کی ایک پوری آبادی چھوڑ جاتی ہے۔ باپ کے نیچے دادا اور دادا کے نیچے پڑدادا اپنے طلاکار اور منقش تابوتوں میں اسی طرح پڑے ہیں گویا سو رہے ہیں۔ حتے کہ اگر کوئی شخص تمام عمر زمین کی تہیں ادھیڑتا

چلا جائے۔ تب بھی ان نیچے دبے ہوئے مردوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

جب میں ان کپڑے کی پٹیوں سے لپٹی ہوئی خشک لاشوں کا خیال کرتی ہوں جو غاروں کے اندر ہزارہا سال سے بے حس و حرکت پڑی ہیں اور جو شاید ابد الاباد تک اسی طرح پڑی رہیں گی۔ تو میں لرزہ براندام ہو جاتی ہوں۔

شارمیون! سلطنت مصر بھی عجیب سنسان سلطنت ہے۔ اور میرے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ یہاں جس چیز کو دیکھئے اس کے اندر ایک ممی ضرور موجود ہوتی ہے۔ ہر چیز کا دل ممی اور ہر سینہ کا مغز ممی ہے۔ ہزار ہا چکر لگاؤ مگر ہر جگہ ممیوں سے شروع ہو کر ممیوں ہی پر ختم ہوگا۔ ان کمبخت اہرام کو دیکھو ان کے اندر بھی تو ممیوں کے تابوت کے سوا اور کچھ نہیں، توبہ، توبہ، یہ بھی کیا حماقت و وحشت ہے۔ غور کرو کہ اگر یہ مخروطی اہرام آسمان سے گر جائیں، تو بھی لاش کو ایک انچ نہیں بڑھا سکتے۔ پھر بتا اے شارمیون! کہ کوئی شخص ایسے ملک میں کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ جہاں کوئی بُو اگر ہے تو صرف روغن نفط اور رال کی ناگوار بدبُو۔ جہاں تمہارے ایوان کا فرش بھی چلتے وقت اس طرح بولتا ہے جیسے کوئی کھوکھلی چیز۔ کیونکہ اس کے نیچے بھی لاشوں کے غار پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر تو ہی بتا کہ صرف ممیوں کی ملکہ بننا اور بتوں کے سوائے جو سختی کے ساتھ مختلف وضع کے آسن جمائے بحالت جمود بیٹھے ہوئے ہیں کوئی متنفس بات کرنے کے لئے نہ ہونا آخر یہ کیا تماشہ ہے؟ کاش اس افسردگی کو مٹانے کے لئے دل میں کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا۔ زندگی سے کچھ دلچسپی ہوتی۔ کاش میں کسی شخص سے محبت کر سکتی...... کوئی اور مجھ سے محبت کرتا۔

بس شارمیون! یہ ہیں وہ باتیں جن کے باعث میں ملول و افسردہ خاطر ہوں۔ اگر کہیں اس سرزمین میں عشق و محبت کی بھی پرورش ہو سکتی تو یہ بھیانک اور خشک مصر بھی مجھے یونان سے زیادہ پیارا معلوم ہوتا۔ جہاں۔ ہاتھی دانت کے بت ہیں۔ برف کی طرح سفید سنگ مرمر کے مندر ہیں۔ سدا بہار اور خزاں نادیدہ چمنستان ہیں۔ خوبصورت و دلکش فوارے ہیں"

ملکہ کی یہ شاعرانہ و حکیمانہ باتیں سُن کر شارمیون جو یونانی النسل کنیز تھی مسکرا دی اور بولی:۔

" ملکۂ عالم! میرے خیال میں تو یہ بات اس قدر باعث رنج و ملال نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ملکۂ عالم کی ایک ایک نگاہ دنیا کے لئے مستقل دعوت عشق و محبت ہے"

قلوبطرہ۔ کیا کوئی ملکہ کبھی یہ معلوم کر سکتی ہے کہ ایک شخص اس کی صورت سے محبت کرتا ہے یا اس کے تخت و تاج سے؟ اگر میں اورنگ عظمت و جلال کی رفعت سے نیچے اتر جاؤں تو کیا اس وقت بھی میری دلکشی اسی طرح قائم رہیگی کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس بدتمیز دنیا میں ملکہ عورت نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی سمجھی جاتی ہے جو جنسی علائق کی اہل نہیں۔ لوگ اس ہستی کی دور دور زانو ہو کر پرستاری کرتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں اس کی محبت نہیں ہوتی۔ شارمیون! تم ہی بتاؤ کیا کوئی شخص آج تک برف جیسے سفید ہاتھوں والی دیوی ہیرا یا ازرق چشم دیوی

پلاس پر حقیقتاً فریفتہ ہوا ہے؟ کون ہے وہ جس نے علی قیس نے چاندی جیسے پاؤں چومنے کی کوشش کی ہو؟ کون ہے وہ جس نے آج تک اردرا کی گلابی انگلیوں کو اپنے لبوں سے مس کرنے کی خواہش نہ کی ہو؟ بتاؤ کیا ان حسین و جمیل دیویوں کا کوئی عاشق ایسا ہوا ہے جو پر لگا کر بہشت کے مطلا و مذہب محلات و قصور تک پہونچ گیا ہو، اے شارمیون! عزت و احترام خوف و دہشت کا جذبہ میرے حضور میں لوگوں کے دلوں کو سرد کر دیتا ہے۔ اور میں اس جذبہ کے التفات سے محروم رہتی ہوں جس کے لئے میں ایک معمولی عورت ہونے کے لحاظ سے تڑپ رہی ہوں"

اگرچہ شارمیون نے اپنی ملکہ کے دلائل کے خلاف کوئی حجت پیش نہیں کی لیکن ایک ہلکی سی مسکراہٹ اوس جمیل یونانی کنیز کے لبوں پر پیدا ہو گئی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاہی ہستیوں کے بے عیب اور ناقابل تسخیر ہونے پر اس کو بہت کم ایمان ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے قلوبطرہ نے کہا۔

"کاش میرے لئے کوئی نئی بات پیدا ہوتی۔ کوئی عجیب اور غیر متوقع واقعہ ظہور میں آتا۔ اب میرے لئے شعراء کی غزلیں، ملک شام کی حسین ناچنے والیوں کا رقص و سرود۔ صبح تک رہنے والی ضیافتیں۔ ذنگل کی کشتیاں۔ ایشیاء کے عطریات۔ یہ شاہانہ شوکت و جلال، یہ ملوکانہ اسباب راحت و آسائش، الغرض میرا تمام ماحول، میرے لئے بالکل بے معنی سی چیز ہے اور اب میں ان میں سے کسی کی برداشت نہیں کر سکتی"

اس قدر طویل تقریر سے تھک کر قلوبطرہ نے پھر وہ پیالہ اُٹھایا جو اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا اور لب تر کئے۔ اس کے بعد جس طرح ایک خوبصورت قمری اپنا سر پروں میں چھپا کر سو جاتی ہے، قلوبطرہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ چہرہ پر رکھ لیا اور کسی قدر سکون کے ساتھ قیلولہ میں مصروف ہو گئی۔ شارمیون نے آہستہ آہستہ اوس کے پاؤں کی چپلیاں کھول کر اتار لیں۔ اور مور کے پر سے اس کے پاؤں کے تلوے آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ یہاں تک کہ نیند نے اوسکی دلفریب آنکھوں میں اپنا زریں غبار بھر دیا۔ اور بطلیموس مصری کی بہن قلوبطرہ سو گئی۔

شام ہو گئی ہے، بنفشئی رنگ کی ایک چوڑی سڑک جس میں کہیں کہیں شفق کی سُرخی بھی دکھائی دیتی ہے، افق مغرب میں نظر آ رہی ہے۔ اوس کے اوپر آسمان کا نیلگوں منطقہ شروع ہوتا ہے۔ اور ان دونوں کے مقام اتصال پر بنفشئی رنگ لاکھی ہو کر نظر آ رہا ہے۔ دور فاصلہ پر آفتاب جو ایسا سُرخ معلوم ہوتا ہے۔ گویا ملکن کی بھٹی میں سے کوئی تپتی ہوئی ڈھال گر پڑی ہے۔ اپنا آتشیں سایہ ہر طرف ڈال رہا ہے۔ آسمان کے گہرے رنگ ہلکے ہو کر نارنجی ہوتے جاتے ہیں۔ دریا کا پانی ایسا چمک رہا ہے جیسے قلعی کیا ہوا آئینہ یا صیقل کی ہوئی جوہردار تلوار۔ اسی روشنی میں دور فاصلہ پر دریا کی چمکدار لہروں کے جال میں ایک چھوٹا سا خاکی دھبا کانپتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا یہ ریت کا کوئی ذرّہ ہے جو سطح سیماب پر تیر رہا ہے۔ کیا یہ کوئی چھوٹی سی مرغابی ہے جو غوطے کھا رہی ہے؟ یا کوئی کچھوا ہے جو آہستہ آہستہ دھار پر بہا جا رہا ہے؟ یا کوئی نہنگ ہے جو شام کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کے لئے اپنی بھوتھنی پانی سے

باہر نکالے ہوئے ہے؟ یا کسی دریائی گھوڑے کا پیٹ ہے جو منجدھار میں چمک رہا ہے؟ یا کوئی چٹان ہے جو دریا کا پانی اتر جانے سے نمایاں ہو گئی ہے۔

نہیں یہ ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ کوئی آدمی ہے جو ایک حقیر سی ڈونگی میں بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ یہ آدمی کشتی پر سیدھا کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چپو ہے۔ جس سے وہ کشتی کو چلا رہا ہے۔ اور اگرچہ شاہی بجرا پچاس چپوؤں کی مدد سے بہت تیز جا رہا ہے۔ لیکن یہ سیاہی مائل حقیر ڈونگی رفتہ رفتہ اس کے قریب ہوتی جاتی ہے۔

یہ ایک بیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔ اوس کے بال عنبریں تھے اور اس کا رنگ کندن کی طرح نکھرا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت اور ایک بُت کی طرح سڈول جسم میں ہر ہر عضو سے شباب کی پوری کیفیت نمایاں تھی اور ہر چند یہ دیر سے کشتی کھیتا آ رہا تھا۔ مگر اس پر تکان کی کوئی علامت ظاہر نہیں تھی۔ نہ اس کی پیشانی پر پسینہ کا کوئی قطرہ پایا جاتا تھا۔

آفتاب افق کے نیچے نصف غروب ہو چکا ہے۔ اور اس کی ضعیف روشنی کے سامنے ایک دور دراز شہر کا تاریک منظر دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ نور آفتاب غائب ہو گیا اور آسمان پر ستارے، چاندی کے پھولوں کی طرح ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آنے لگے۔ شاہی بجرا جس سے اب وہ چھوٹی کشتی بہت قریب پہونچ گئی تھی، ایک عظیم الشان مرمریں زینہ کے سامنے رُکا یہ ملکہ کا قصر گرما تھا۔ سیڑھیوں پر دونوں طرف غلام کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں روشن قندیلیں تھیں۔ ملکہ قلوبطرہ بجرے سے اتر کر شاہ میون کا سہارا لیتی ہوئی اس طرح سبک خرامی کے ساتھ غلاموں کی قطاروں سے گذر گئی گویا کہ وہ ایک خواب رنگیں تھا جو صبح کے وقت دیکھا گیا اور آنکھ کھلتے ہی محو ہو گیا۔

نوجوان نے اپنی کشتی میں سے شیر کی ایک کھال نکالی اور اس کو شانوں پر ڈالکر کشتی کو کنارہ لگا لیا اور قصر شاہی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

اس نوجوان کا نام میمون تھا اور اپنی سیرت کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھا۔ اس کی پتلیوں میں عقاب کی سی چمک تھی اور اس کی پیشانی سے وہی عظمت و جلال ظاہر تھا جو کسی مرمریں بُت میں پایا جاتا ہے۔ اسکے ہونٹوں کی ساخت سے خوددارانہ شرافت ظاہر ہوتی تھی اور اس کے نتھنے اس طرح پھڑکتے تھے جیسے کسی تیز رہوار کے۔ ہر چند اس کے خوبصورت جسم میں نزاکت کے ساتھ تھوڑی سی نسائیت بھی موجود تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے اسی نازک جسم کے اندر بجائے رگوں کے فولادی تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور ہرقلس کی سی قوت

اس میں پنہاں تھی۔

اس کے رنگ میں ہلکی سی کندن کی سی زردی پائی جاتی تھی جو اس کے عاشق مزاج ہونے کی اہلیت کو ظاہر کر رہی تھی اور جس کو دیکھ کر جمیل ترین لڑکی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس کی زندگی یکسر عصمت وعفت تھی اور اس کی پارسائی ایک ایسا سنگین حصار تھی جسے اسوقت تک ملک کی کوئی جمیل لڑکی منتوح نہیں کر سکتی تھی۔

وہ صبح سویرے اُٹھتا۔ دریائی گھوڑے کی کھال کی سپر لشپت پر ڈالتا، ہاتھ میں اپنا تبر سنبھالتا، شنشی کمان اور اژدھے کی کھال کا بنا ہوا ترکش جس میں خانہ وار تیر بھرے ہوتے شانے پر ڈالتا اور اپنی نازک اندام صبا رفتار، لمبی ایال رکھنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر ریگستان کی طرف چلا جاتا، یہاں تک کہ اُسے جنگل میں کسی شیر کا سراغ ملجاتا اور وہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کرلے آتا۔ کیونکہ خطرہ میں پڑنا محال کو ممکن بنانے میں جان لڑا دینا اس کا بہترین مشغلہ تھا، وہ طوفان اور غضبناک دریا میں غسل کرنا اور تیرنا بہت پسند کرتا اور یہی وجہ تھی کہ دریائے نیل میں آبشاروں کے قریب وہ غسل کرنے جایا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے اس کا مزاج اور زیادہ مجنونانہ ہو چلا تھا۔ وہ مہینوں ریگستان ہی میں گزار دیتا اور بہت کم گھر جاتا۔ اس کی بیقرار ماں ہفتوں فکر وتشویش سے اس کا انتظار کرتی رہتی اور پھر مایوس ہو جاتی تھی کہ ناگہاں ایک روز افق سے ایک چھوٹا سا تیرہ گرد وغبار کا نمودار ہوتا۔ اور گرد کے اس بادل سے میمون کی صورت نظر آجاتی۔ سر سے پانوں تک گرد آلود اور گھوڑی کی سرخ سرخ آنکھیں باہر کی طرف ابلی ہوئی نتھنے پھولے اور کانپتے ہوئے اور پہلوؤں میں بڑے بڑے زخم جو درندوں کے پنجوں کے ہوتے تھے۔

واپس آکر وہ کسی نئے شکار کئے ہوئے شیر کی کھال اپنے کمرہ میں لٹکاتا اور پھر جنگل کی طرف چلا جاتا۔ یہ تھا اس کی زندگی کا معمول جس میں اس کی زندگی کی مسرت پنہاں تھی۔ ملک کے کاہن اعظم آنوموتھیس کی حسین لڑکی نیفتہ جو آرسنوئی قوم کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ اس نوجوان پر عاشق تھی۔ لیکن میمون اس سے بالکل بیخبر تھا کہ نیفتہ کی ساحر آنکھیں کس قدر فتنہ انگیز ہیں۔ اور اس کے رنگین رخسار پھول کے مشابہ ہیں۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ نیفتہ کے سفید دانت موتیوں سے زیادہ چمک رکھتے ہیں اور اُس کے حسن وجمال میں کس بلا کا افسوں ہے۔

تمام مصر میں نہ اس سے زیادہ خوبصورت اور نازک ہاتھ کسی اور لڑکی کے تھے اور نہ ایسے لمبے چمکدار بال کہیں اور نظر آسکتے تھے۔ نفتہ کے حسن وجمال اور ناز وادا پر اگر کوئی غالب ہو سکتا تھا تو وہ صرف قلوپطرہ تھی اور میمون اُسی کی دلربائی ورعنائی کا فریفتہ تھا۔

اول اول تو اُس نے اس مہلک جذبہ کو مغلوب کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ بہت

زیادہ شجاع و دلیر ہوتے ہیں۔ وہی زیادہ اس جنگ میں ناکام رہتے ہیں، چنانچہ میموَن کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور قلو پطرہ کی تصویر معہ اس کے طلائی تاج اور شاہی لباس کے رات بھر اس کے خواب میں اور دن بھر اسکے خیال میں رہنے لگی اور آخر کار میموَن نے قصر شاہی کا طواف شروع کر دیا تاکہ کم از کم وہ اس فضا میں سانس ہی لے سکے جہاں ملکہ قلو پطرہ رہتی ہے، اور اگر کبھی موقعہ مل جائے تو اس کے نقش قدم کا سجدہ ہی کر سکے۔ وہ مقدس تہواروں میں شریک ہوتا محض اس امید پر کہ شاید اس کی کوئی جھلک دیکھنا نصیب ہو جائے۔ بعض اوقات جب اسے اپنی اس مجنونانہ زندگی کا احساس ہوتا تو پھر وہ دو چند سرگرمی سے سیر و شکار میں معروف ہو جاتا تھا کہ اس جوش کو فرو کر سکے۔

وہ ہرمون دیوی کی پوجا میں اسی لئے شریک ہوا تھا کہ جس وقت ملکہ کی سواری گرمائی قصر کے سامنے پہونچے گی تو وہ اس پر ایک نگاہ ڈال سکے گا اور اسی امید پر وہ اپنی حقیر ڈونگی میں شاہی بجرے کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔

وہ ریگ زار صحرا میں ہتیلی پر سر رکھے کچھ سوچ رہا تھا، ہزاروں خیال دل میں آتے تھے لاکھوں تدبیر بنا بنا کر بگاڑ رہا تھا، لیکن کوئی صورت اطمینان کی نہ پیدا ہوتی تھی۔ اس نے گھبرا کر آتور دیوی سے خطاب کیا کہ:-

"اے صاحب عظمت و جلال دیوی!! میں نے ایسا تیرا کیا قصور کیا ہے کہ تو نے مجھے اس مصیبت میں پھنسایا؟ کیا تو مجھ سے اس بات کا انتقام لے رہی ہے کہ میں نے نیفتہ سے بے اعتنائی کی۔ کیا تو نے مجھے اس لئے اس عذاب میں مبتلا کیا ہے کہ میں نے لامیہ کی محبت کو ٹھکرا دیا؟ اور دربار رومہ کی حسین مغنیہ فلورا کی طرف توجہ نہیں کی۔ یا میری یہ خطا ہے کہ میں قلو پطرہ کی طرف مائل ہوں جو حسن و جمال میں تیری حریف ہے؟ اے دیوی! جو عشق کبھی سر سبز نہیں ہو سکتا۔ اس کے تیروں سے تو نے میری روح کو کیوں مجروح کیا؟ اچھا بتا کہ میں تجھے کیا نذر دوں؟ کیا تیرے اعزاز میں گلابی سنگ مرمر کا ایک ایسا مندر بناؤں، جس کے ستونوں کی چوٹیوں پر سونے کے پتر چڑھے ہوں۔ جس کی چھت ایک ڈال پتھر کی ہو۔ اور جس پر ممفس اور تھیبس کے بہترین کاریگروں نے بہترین نقوش کندہ کئے ہوں؟ بول! اے دیوی بول!! کچھ تو جواب دے!"

جس طرح اور دیویاں ایسی فریادوں اور التجاؤں کا کوئی جواب نہیں دیا کرتیں اسی طرح میموَن کی فریاد کا بھی آتور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مجبور ہو کر اس نے ایک خطرناک تدبیر سوچی۔

اُدھر قلو پطرہ بھی آتور دیوی سے دعا کر چکی تھی کہ اُس کے لئے کوئی نئی مسرت، کوئی تازہ جذبہ پیدا ہو کیونکہ وہ اب تمام سامان عیش و نشاط سے بیزار ہو چکی تھی۔ غلاموں اور کنیزوں پر نئے نئے زہروں کا امتحان کرنا آدمیوں کو شیروں سے لڑانا۔ تیغ زنوں کی لڑائی دیکھنا۔ شراب میں مروارید حل کر کے پی جانا یہ تمام مشغلے اسکے

نزدیک اب بے لطف ہو گئے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ روز تفریح کے لئے نئے نئے مشاغل پیدا کرنا ایک ملکہ کے لئے بھی آسان کام نہیں ہے۔

اس وقت شارمیون بھی گھبرائی ہوئی تھی کہ کیا کیے اور ملکہ کی فکر کیونکر رفع ہوں۔ کہ اتنے میں اچانک سَن سَن کی آواز کانوں میں آئی اور ایک کاغذ لپٹا ہوا تیر دیوار کے تختوں پر آ کر گر گیا۔ شارمیون دوڑتی ہوئی دریچہ میں گئی اور سر باہر نکال کر دیکھا۔ لیکن وہاں بجز جھاگ کے جو سطح دریا پر نمایاں تھا اور کچھ نہ نظر آیا۔ اس میں ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا جس پر فینیقی زبان میں لکھا ہوا تھا کہ :-

"میں تجھ سے محبت کرتا ہوں"

قلوپطرہ نے کاغذ کا وہ پرزہ جو تیر کے گرد لپٹا ہوا تھا اپنی نازک اور سفید انگلیوں سے کھولا اور جس وقت اس کی نگاہ اس کے پیام پر پڑی تو اس کے جسم میں خفیف سی لرزش پیدا ہوئی اور بے اختیارانہ کہہ اٹھی کہ "ہاں یہی وہ الفاظ ہیں جن کی میں متمنی تھی" وہ فوراً اٹھ بیٹھی اور اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پاؤں کا مدار سلیپر دہنیں ڈالے۔ زرد وزرلشمی پیراہن گلے میں پہنا اور دوڑ کر اسی غرفہ میں پہونچی جہاں شارمیون بیٹھی ہوئی ابھی تک باہر جھانک رہی تھی۔

رات صاف اور پُرسکون تھی۔ اور دریائے نیل کا پانی جس میں قلوپطرہ کا عکس ایک منور و طویل ستون کی طرح پڑ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی نقرئی لہروں کی وجہ سے جال کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا، جس کی نسبت یہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید وہ ابوالہول کی سانس ہے، ساحل کے نرسلوں میں سے لرزتی ہوئی نکل کر کنول کے گلابی اور آبی رنگ کے پھولوں کو کبھی کبھی کپکپا دیتی تھی۔ اور وہ رسّے جن سے کشتیاں اور بجرے ساحل پر بندھے ہوئے تھے۔ ہوا کے زور سے آہستہ آہستہ چرچرا رہے تھے۔ لہریں لیتے ہوئے پانی کے تھپیڑے جو ساحل سے لگتے تھے تو ان سے کچھ ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے قمری کراہ رہی ہو۔

قلوپطرہ۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا۔ وہ دیکھو وہ منجدھار میں ایک تیرنے والے آدمی کا سر ہے؟ وہ دیکھو اب وہ اُس روشنی کی شعاعوں سے بھی گذر گیا جو سطح دریا پر پڑ رہی ہیں۔ اب وہ دور کے سایہ میں پہونچ گیا ہے۔ اے لو وہ نظروں سے بھی غائب ہو گیا"

شارمیون کے شانہ کا سہارا لیکر قلوپطرہ نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور تقریباً سینہ تک باہر نکل کر دریا کی طرف دیکھنے لگی کہ شاید اُس پُر اسرار تیرنے والے کی کوئی اور جھلک نظر آ جائے۔ لیکن چونکہ اس طرف دریائی پھولوں اور کھجوروں کا گہرا سایہ پانی پر پڑ رہا تھا، اس لئے دوبارہ اس کی جھلک نہ دکھائی دی۔ قلوپطرہ نے حکم دیا کہ فوراً اس شخص کا تعاقب کیا جائے۔ اور ملاحوں کے سردار کو بلایا جائے۔

اس وقت قلوپطرہ کا جوشِ اشتیاق حد درجہ کو پہونچا ہوا تھا۔ ملاحوں کا سردار حاضر ہوا۔ یہ قوم نحاسی کا ایک تنومند آدمی تھا جس کے ہاتھ لمبے لمبے اور بازو بھرے بھرے تھے۔ سر پہ ایک سرخ ٹوپی تھی۔ جو خود سے ملتی جلتی تھی۔ اوپر کا جسم برہنہ تھا۔ کیس ٹانگوں میں نیلی دھاری کی شلوار پہنے تھا۔ اس کا آبنوسی جسم جو پالش شدہ سیاہ کندہ کی طرح تھا۔ قندیل کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے ملکہ کا فرمان سنا۔ اور فوراً تعمیل کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ نہایت تنگ، لمبی لمبی کشتیاں فوراً دریا میں ڈالی گئیں۔ اور بیس طاقتور ملاحوں کے زور سے دریا کا سینہ چیرتی ہوئی روانہ ہو گئیں۔ لیکن یہ تعاقب بے سود ثابت ہوا۔ نرسلوں کا تنکا تنکا اور ساحل کا چپہ چپہ ڈھونڈھنے کے بعد ملاحوں کا سردار قصرِ شاہی کو واپس آیا۔ اسے اگر کچھ کامیابی ہوئی بھی تو صرف اس قدر کہ یا تو اس نے کسی سارس کو جو نرسلوں میں دریا کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا ہوا مصروف مراقبہ تھا اڑا دیا یا کسی خوف زدہ گھڑیال کا ہاضمہ خراب کر دیا۔

اس ناکامی پر قلوپطرہ اس قدر برافروختہ ہوئی کہ اس کا ارادہ ہوا اس ملاح کو کسی جنگلی درندہ کے پنجرہ میں ڈلوا دے۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت اس بدنصیب لرزہ براندام شخص کی شارمیون نے سفارش کی۔ ورنہ اس کا تو خوف سے یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کا آبنوسی رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ تمام عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ قلوپطرہ کی ایک دلی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ اور یہی باعث تھا کہ وہ اس وقت ایک اضطراب آمیز تحیر میں گرفتار تھی۔ کیونکہ اس واقعہ سے اس کو اپنے قادر مطلق ہونے میں شبہ ہونے لگا تھا۔

وہ قلوپطرہ جو بطلیموس شاہ مصر کی بہن اور بیوی تھی۔ وہ قلوپطرہ جس کی نسبت اعلان کیا گیا تھا کہ وہ ایورجیتیس کی ہمسر تھی وہی قلوپطرہ اپنے ارادہ میں ناکام رہے! کسی بات کی خواہش دل میں پیدا ہو اور وہ پوری نہ ہو۔ اس کی زبان سے کوئی فرمان صادر ہو اور اس کی تعمیل نہ ہو سکے! اس سے تو بہتر تھا کہ وہ کسی ذلیل سنگ تراش کی بیوی ہوتی یا ریگستان میں لاشوں کے حنوط کرنے کا مسالہ پکایا کرتی۔

وہ قلوپطرہ جس کے دل میں کسی خواہش کا پیدا ہونا اس کے پورا ہونے کا مترادف تھا، وہ قلوپطرہ جس کے اشارہ ابرو پر نقرئی رتھیں۔ زرنگار طاؤسی پیراہن۔ مصقل فولاد کے آئینے۔ ملک سرکیہ کے باریک ریشمی تھان۔ مشرقی سمندروں کے دُرہائے شاہوار۔ مائرون اور لاسی کس ایسے ماہرین بت تراشی کے بنائے ہوئے ساغر۔ فراہم ہو جائیں۔ وہ ایک معمولی انسان کے گرفتار کرنے سے قاصر رہے! حقیقت یہ ہے کہ یہ صدمہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اور اس کی زندگی کا سب سے پہلا تلخ تجربہ،

تھوڑی دیر سوچتے رہنے کے بعد بولی "کیوں شارمیون! تیرا کیا خیال ہے جس شخص نے تیر کے ذریعہ سے

اپنا پیغام محبت یہاں پہونچانیکی جرات کی ہے یہ کون ہو سکتا ہے؟ کیا یہ نوفرخ آمون کی حرکت ہے جو خود کو یونانیوں کے دیوتا اپالو سے بھی زیادہ خوبصورت سمجھتا ہے؟ یا ہر موتھیبیا کا سردار خیاپ سیرو ہے جو ملک کشی میں اپنے فاتحانہ کارناموں کی شیخی بگھارا کرتا ہے؟ یا بہت ممکن ہے وہ رومی عیاش سکیتس ہو جو اپنے چہرہ پر غازہ ملا کرتا ہے بات کرتے ہوئے لکنت کرتا ہے۔ اور ایرانی وضع کی آستینیں اپنے ملبوس میں لگاتا ہے"

شارمیون۔ نہیں ملکۂ عالم! ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا۔ نوفرخ آمون نے تو اپنے سامنے ایک الیاسُت رکھ چھوڑا ہے جس کی پرستش وہ زندگی بھر وفاداری کے ساتھ کرتا رہے گا۔ اور وہ بُت خود اُس کی ذات ہے، الیسا خود بین و خود پسند شخص جذبۂ محبت سے کب آشنا ہو سکتا ہے؟ جنگ آزما خیاپ سیرو کو اپنے فاتحانہ کارناموں سے اور پھر فخر کرنے سے کہاں فرصت کہ اور کسی طرف متوجہ ہو؟ اب رہا سکیتس! سو وہ آج کل چہرہ کا ایک نیا غازہ بنانے کی فکر میں مبتلا ہے۔ علاوہ اس کے اس نے چند ایشیائی لڑکے خریدے ہیں۔ جن کے لئے وہ زر کار سبتی پیراہن تیار کرا رہا ہے ان باتوں سے اُسے کہاں فرصت؟ الغرض ان امراء میں سے کوئی ایسا جری اور بہادر نہیں ہے جو ایسی جانبازی کا کام کر سکے۔ کل جب ملکۂ عالم شاہی بجرے میں سوار تھیں تو ارشاد ہوا تھا کہ کوئی مرد ملکۂ عالم کے جمیل چہرہ پر نگاہ نہیں ڈال سکتا اور حضور میں آتے ہی اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور وہ قدموں پر گر کر آنکھیں رگڑتا ہے۔ اور رحم و کرم کی التجا کرتا ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ اب ملکۂ عالم کے لئے صرف یہی چارہ کار رہ گیا ہے کہ دل بہلانے کے لئے رال اور مسالہ میں بسے ہوئے قدیم زمانہ کے کسی فرعون کو طلائی تابوت سے نکلوایا جائے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں ابھی تک کوئی ایسا جوشیلا اور نوجوان دل موجود ہے۔ جو ملکۂ عالم کا دل بہلانیکے لئے ہر خطرہ کو برداشت کر سکتا ہو۔

اُس روز قلوبطرہ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ میں سب سے زیادہ بدنصیب ملکہ ہوں۔ ہر شخص مجھے ستانے کی کوشش کرتا ہے اور اب میں اپنی جان سے عاجز آگئی ہوں۔

اپنی گستاخانہ جسارت سے خود بخود خائف ہو کر میمون دریائے نیل میں کود پڑا تھا اور تیرتے تیرتے دربار کا لشکر تعاقب شروع ہونے سے پیشتر ساحل کے درختوں میں پہونچ گیا تھا۔

جب اس قدر سخت محنت کے بعد اس کا دم درست ہوا تو اس نے اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں کو نچوڑا اور جب دریا کا تمام پانی اور جھاگ کنپٹی سے ہو کر بہ گیا تو اُسے کسی قدر تسکین ہوئی۔ وہ اس خیال سے بھی مسرور تھا کہ قلوبطرہ کے پاس اس کی بھیجی ہوئی کوئی چیز پہونچ گئی ہے اور اب گویا دونوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق قائم ہو گیا ہے۔

جب میمون کو یقین ہو گیا کہ تعاقب کرنیوالے واپس گئے تو وہ پھر دریا میں کودا اور تیرتا ہوا قلوبطرہ کے قصر شاہی کی طرف روانہ ہوا جس کے فانوس کھڑکی کے پردوں میں سے ایسے جھلک رہے تھے جیسے رنگین ستارے،

وہ تیرتا ہوا قصر شاہی کے نیچے پہونچا اور ایک سُرنگ کے سامنے ٹھہرا جس کے اندر دریا کا پانی بل کھاتا ہوا داخل ہو رہا تھا وہ اس بھنور میں دو تین مرتبہ کوداتا کہ سُرنگ کے اندر داخل ہو جائے لیکن ناکام رہا لیکن چوتھی مرتبہ راستہ اس کو مل گیا۔ اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔

یہ محرابدار سُرنگ ایک مسقف نہر تھی جس سے دریائے نیل کا پانی داخل ہو کر ملکہ قلوپطرہ کے غسل خانوں میں پہونچتا تھا۔

(۳)

قلوپطرہ کو صبح تک چین نہ آیا اور بار بار اُچاٹ ہو جانیوالی نیند سے وقتاً فوقتاً بیدار ہو کر وہ بے خیالی اپنا نازک پاؤں شارمیون کے سینہ پر مارتی رہی جو ملکہ کے پائینتی لیٹی ہوئی اس کے پاؤں کے لئے نرم گدے کا کام دے رہی تھی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو غرفہ کے پردہ سے چھنکر شعاعیں اندر کھیل رہی تھیں۔ اور پردہ کے تار و پود سے ہزاروں نقطہ ہائے نور چھنکر ملکہ کے بستر پر پڑ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی سنہری تیتری قلوپطرہ کے حسین مرمری شانوں پر لہرا رہی ہے اور نرم نرم بوسے لے رہی ہے۔ جس طرح کوئی نحیف و زار علیل و مضمحل شخص نرم آواز سے بولتا ہے۔ اسی طرح قلوپطرہ نے آواز دی تاکہ کنیزیں آکر اُسے بستر سے اُٹھائیں۔ فوراً دو کنیزیں دوڑتی آئیں جنھوں نے گود میں لے کر ملکہ کو اُٹھایا اور آہستہ آہستہ شیر کی ایک کھال پر بٹھا دیا جو فرش پر بچھی ہوئی تھی اسی شیر کا چہرہ بھی کھال میں لگا ہوا تھا۔ جس کی آنکھیں لعل شب چراغ کی اور ناخون سونے کے تھے۔ شارمیون نے ملکہ کو برف سے زیادہ سفید کتانی ردا میں لپیٹ دیا۔ اور سر پر کلابتوں کے تاروں کی بُنی ہوئی جالی باندھ دی۔ اسکے بعد شارمیون نے اسے زرکار چپلیاں پہنا دیں۔

یہ وقت چونکہ غسل کا تھا اس لئے قلوپطرہ اپنی کنیزوں کو ساتھ لئے ہوئے غسل خانہ کی طرف چلی۔ ملکہ کے غسل خانے اور اُن کے حوض وسیع باغوں کے اندر بنے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف قسم کے میوہ دار درخت اور اور خوشبودار پودے نصب تھے۔ ان باغوں میں جا بجا چمن بندی کی گئی تھی۔ اور گلابی پتھر کے اونچے اونچے زینے تعمیر کئے گئے تھے۔ جن پر خوبصورت اور نازک پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ زینہ کی ہر سیڑھی پر خوبصورت سنگ مرمر کے گملے رکھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے گویا بڑے بڑے کنول رکھے ہوئے ہیں۔ جا بجا تختۂ چمن پر مرمری بُت ایسے معلوم ہوتے تھے گویا ملاقات کے کمرے میں پھولدار قالینوں کے حاشیہ پر خوبصورت اور سفید میز فرش رکھے ہوئے ہیں۔ یہ خوبصورت زنانہ بُت تھے۔ جن کے نقشے نازک۔ پیشانیاں ہموار۔ دہانے تنگ،

بازو گول، اور سینے سڈول، تھے۔ کانوں میں آویزے۔ گردنوں میں گلوبند اور جسم پر مختلف وضع کے زیور جو زیب تن تھے۔ ان میں بعض کا حصۂ زیریں جل پری کی طرح تھا اور مچھلی کی طرح دو شاخہ دُم پر ختم ہوتا تھا۔ بعض کا جسم زیریں کسی مرغ کا سا بنا دیا گیا تھا۔ جیسے بازو پھیلے ہوئے تھے۔ بعض کا دھڑ چار زانو بیٹھے ہوئے شیر کا سا بنا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا نباتاتی بنایا گیا تھا گویا ایک پری کسی پھول یا پودے میں سے جنم لے رہی ہے۔ الغرض کاریگروں نے موقعہ و محل دیکھ کر مناسب وضع کے مجسمے قائم کئے تھے۔ اور ان کی دو قطاریں اُس راستہ کے ادھر اُدھر قائم تھیں جو قصرِ شاہی سے حمام تک جاتا تھا۔

راستہ کے سرے پر ایک فوارہ دار حوض تھا۔ جس کے چاروں طرف چار سنگین زینے بنے ہوئے تھے۔ اور اس حوض کا پانی اس قدر صاف اور شفاف تھا کہ حوض کی تہ تک ہر چیز صاف نظر آتی تھی۔ حوض کی تہ میں بجائے ریگ کے سونے کے ذرے بچھائے گئے تھے۔ حوضوں میں جو نسوانی مجسمے نصب کئے گئے تھے ان کی چھاتیوں سے خوشبودار پانی کی ایک باریک دھار نکل کر حوض میں گرتی تھی۔ اور صاف پانی کے آئینہ میں پڑ کر خفیف سی جھریاں اس میں پیدا کر دیتی تھی۔

ملکہ قلوپطرہ شارمیون کے شانہ کا سہارا لئے ہوئے اس مقام تک پہونچی اُس نے بہ مشکل چند قدم اُٹھائے ہوں گے کہ اُس کے رخسار کی شفاف جلد سے گلابی عرق نمودار ہونے لگا۔ کنپٹیوں پر جو کہ بائے شمعی کی طرح رنگین تھی باریک نیلی رگوں کا ایک جال نمایاں ہو گیا۔ اور ناک کے گلابی نتھنے جلدی جلدی اُبھرنے لگے۔ اوس کے لبوں میں ایک متکبرانہ خم تھا۔ مگر لب زیریں کی درخشاں سرخی میں غیر محتاط عیاشی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں پر ہموار پلکوں اور خوبصورت محرابدار ابروؤں کا سایہ تھا۔ اوسکی آنکھیں دو سیاہ شعلے تھے یا شراب کے دو چھلکتے ہوئے جام۔

وہ نہایت کبر و غرور کے ساتھ حوض کے بالائی زینہ پر کھڑی ہو گئی۔ اوس کا جسم کسی قدر پیچھے کو جھکا ہوا تھا۔ ایک پاؤں معلق آگے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ایک حسین آسمانی دیوی معلوم ہوتی تھی جو ابھی اپنی مسندِ ناز سے اُٹھ کر آئی ہے۔

حمام میں داخل ہونے سے قبل قلوپطرہ نے شارمیون کو حکم دیا کہ سر سے روپہری کلابتوں کی جال کھول لی جائے اور اس کے بجائے آبی گھاس اور گلہائے نیلوفر کے پھولوں کا تاج رکھا جائے۔ کیونکہ اس وقت وہ "جل پری" بننا چاہتی تھی۔ شارمیون نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور قلوپطرہ کے سیاہ عنبریں بالوں کی لٹیں کھل کر شانوں پر اس طرح پھیل گئیں جیسے سطحِ رودِ نیل پر آبشاریں۔ ان سیاہ بالوں کا جب اُس کے رخساروں پر سایہ پڑتا تھا تو وہ پختہ انگوروں کے خوشے معلوم ہوتے تھے۔

اس کے بعد کتانی پیراہن کھولا گیا جو اُس کے مرمریں جسم سے پھسل کر سفید لکۂ ابر کی طرح اسکے

قدموں میں آپڑا۔

قلوپطرہ نے اپنی گلابی ایڑی پانی میں ڈبوئی اور چند سیڑھیاں نیچے اُتر گئی۔ جھلاتے پانی نے اس کی کمر کے گرد ایک نقرئی پیٹی کس دی اور کلائیوں میں چاندی کے کڑے پہنا دیئے۔ اور اس کے شفاف سینہ و شانہ پر ٹوٹے ہوئے ہار کی طرح موتی نچھاور کر دئیے۔ اوس کے لمبے لمبے بال جنھیں پانی نے اُبھار کر اس کی پشت پر بکھیر دیئے تھے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے سیاہ کتاں کی چادر۔ الغرض قلوپطرہ کے حمام کے اندر بھی ملکہ ہی تھی۔ وہ حوض میں ادھر ادھر تیرتی۔ غوطے لگاتے۔ اور مٹھی بھر کر ریگ زر نکال لائی جو اُس نے ہنس کر کنیزوں پر پھینک ماری۔ کبھی وہ حوض کا جنگلہ تھام کر لٹک جاتی۔ اور اپنے حسن و جمال کی دولت بے پایاں دکھاتی۔ کبھی اپنی خوبصورت پشت کا جلوہ دکھاتی اور کبھی اپنا پورا سراپا سامنے کر دیتی۔

دفعتاً قلوپطرہ کے منھ سے ایک بلند چیخ نکلی۔ اس نے قریب کے پودوں میں ایک سرخ نہنگ یا شیر کی زردی مائل شعلہ بار آنکھ کی طرح چمکتی ہوئی ایک آنکھ دیکھ لی تھی۔

یہ میمون کی آنکھ تھی جو جھاڑیوں کے اندر چھپا ہوا کانپ رہا تھا۔ اس وقت وہ ملکہ کو غسل کرتے ہوئے دیکھنے کی لذت میں محو تھا۔ اگرچہ وہ اس قدر بہادر تھا کہ موت سے بھی نہ ڈرتا تھا۔ لیکن قلوپطرہ کی چیخ اُس کے دل سے اس طرح پار ہو گئی جیسے کسی برچھے کی ٹھنڈی انی جگر سے پار ہو جاتی ہے۔ اس کو موت کا پسینہ آگیا کنپٹی کی رگیں پھول گئیں اور دہک کرنے لگیں۔

خواجہ سرا نیزے لیکر بڑھے۔ قلوپطرہ نے ہاتھ کے اشارہ سے وہ جگہ بتائی۔ جہاں میمون چھپا ہوا تھا۔ اب مزاحمت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میمون نے اپنے آپ کو گرفتار کرا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بیدردی اور سفاکی سے اُسے قتل کر ڈالیں۔ لیکن قلوپطرہ نے جو اس وقت تنگ چادر لپیٹ چکی تھی ان کو منع کیا۔

اس وقت میمون کے پاس عذر ہی کیا تھا۔ بجز اس کے کہ وہ ملکہ کے سامنے دوزانو ہو جائے اور ہاتھ جوڑ کر رحم و کرم کی التجا کرے۔ قلوپطرہ نے ایک مخصوص انداز سے سوال کیا:۔

"کیا تم کوئی خونخوار جلاد ہو جسے روما سے رشوت دیکر یہاں بھیجا گیا ہے۔ تم کیوں اس محل میں داخل ہوئے۔ جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

میمون۔ میری روح المیناتی کی میزان عمل میں سُبک ہو جائے۔ اور مٹی جو حق و صداقت کی دیوی ہے مجھے سخت سے سخت سزا دے اگر میرے دل میں ملکۂ عالم کو ضرر پہنچانے کا خیال بھی آیا ہو۔

میمون کے چہرہ پر شفاف حروف میں خلوص اور وفاداری اس قدر جلی قلم سے لکھی ہوئی تھی کہ قلوپطرہ کے دل سے شک دور ہو گیا۔ اور اس نے اس مصری نوجوان کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں سختی اور غیظ و غضب

کی گئی تھی۔ کیونکہ اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ نوجوان صرف جوان ہی نہیں بلکہ خوبصورت بھی ہے۔
قلوبطرہ - پھر بتا کہ کس مقصد نے تجھے ایسے مقام میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ جہاں سزائے موت کے سوائے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہو سکتی؟

یہ سن کر میمون نے آہستہ مگر صاف الفاظ میں جواب دیا کہ:

"میں تجھ سے محبت کرتا ہوں"

میمون کا یہ فقرہ سن کر قلوبطرہ آگے کو جھکی اور اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:-

"تو کیا تو ہی وہ شخص ہے جس نے تیر میں لپیٹ کر پیغام عشق بھیجا تھا۔ ہاں، میں تجھے جان گئی۔ میں تجھے پہچان گئی۔ میں بہت دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ تو چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح میرے قصر کے اردگرد پھرا کرتا ہے۔ تو آئسیز کے جلوس میں بھی شریک ہوا تھا۔ ہرموتھیس کی پوجا میں بھی شامل تھا۔ تونے شاہی بجرے کا بھی تعاقب کیا۔ میں دیکھتی ہوں کہ تیرے حوصلہ میں دنائت نہیں ہے۔ اور تجھ کو اس ہمت و حوصلہ کا صلہ ضرور ملیگا.......
یقیناً میں بھی تجھ سے محبت کروں گی.......اور.......کیوں نہ کروں؟

میمون - ملکۂ عالم! میں ایک رنجور۔ عقل و دانش سے دور۔ پاگل آدمی ہوں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ میں قتل کا سزا دار ہوں۔ لہذا میرے دل پر۔ میری گردن پر۔ بلکہ میری روح پر انتہائی احسان ہوگا اگر مجھے قتل کردیا جائے۔
قلوبطرہ - نہیں ہرگز نہیں۔ آج کا دن رحم و کرم سے کام لینے کا ہے۔ میں تیری جاں بخشی کرتی ہوں۔
میمون - میں جان لیکر کیا کروں - میرے لئے مرنا ہی بہتر ہے۔
قلوبطرہ - ٹھہر جا، ضبط سے کام لے۔ میں جانتی ہوں تو مجھ سے محبت کئے جانیکی تمنا میں مر رہا ہے۔ اپنے مجنونانہ تصور میں تو خیال کرتا تھا کہ ممکن ہے۔ بعض حالات کے ماتحت جن کا دورہ ہزار سال بعد کبھی ہو جاتا ہے، قلوبطرہ بھی مجھ سے محبت کرے۔ اچھا تو سُن لے! جو بات محال ہے وہ ممکن ہونیوالی ہے اور تیرے دل خوش کن خواب کی تعبیر بہت جلد ملنے والی ہے۔ میں رضا مند ہوں کہ تجھ پر لطف و اکرام۔ عظمت و جلال اور جاہ و حشم کی بارش کردوں۔ میں نے قصد کرلیا ہے کہ تیری خوش قسمتی کو چار چاند لگادوں کہ لوگوں کی نظریں خیرہ ہو جائیں۔ تو زینہ کی آخری سیڑھی پر تھا لیکن اب میں تجھے فلک الافلاک پر پہونچائے دیتی ہوں۔ میں تجھے لاشیئت سے نکالتی ہوں اور تحت اجلال پر بٹھا کر دیوتاؤں کے برابر کئے دیتی ہوں۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ تجھے پھر اسی قعر عمیق میں پھینک دوں گی جہاں سے نکال رہی ہوں۔ لیکن یہ جسارت ہرگز نہ کرنا کہ اس کے بعد بھی تو مجھے ظلم و ستم کا مجرم گردانے یا رحم و کرم کی التجا کرے۔ جب وقت آئے تو تیرا قدم لغزش نہ کرے۔ میں تجھ پر مہربان ہو گئی ہوں۔ اور میں اپنے نفس کو عارضی طور پر تیری حماقتوں کے حوالہ کرتی ہوں۔ لیکن مجھے اختیار اور حق حاصل ہے کہ تجھے قتل کردئے جانیکا حکم دیدوں۔ لیکن چونکہ تو مجھ سے محبت کرنیکا

دعی ہے۔ اس لئے آج کے بجائے تو کل قتل کیا جائے گا۔ تیری زندگی ایک شب کے لئے میری ہے۔ لیکن میں یہ زندگی تجھ سے قیمتاً خرید دوں گی۔ اُٹھ! ہاتھ لا۔ تاکہ قصر شاہی کو واپس چلیں۔

(۴)

ایوان نشاط نہایت عظیم الشان اور وسیع ایوان تھا۔ اس کے ستون ان پایوں پر قائم کئے گئے تھے۔ جن پر قدیم مصری حروف کندہ تھے۔ اور ان کے سروں پر سنگین محرابوں کا عظیم الشان سلسلہ چلا گیا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تو بتو محرابیں نہیں ہیں۔ بلکہ علٰحدہ سنگین زینے بنا کر نصب کر دیئے گئے ہیں۔ ان دونوں ستونوں کے درمیان ایک ابوالہول تعمیر تھا۔ جس کے سر پر تاج نما ٹوپی تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر سینگ سا نکلا ہوا تھا اور چہرہ آگے کو بڑھا ہوا ٹکٹکی باندھے پُر اسرار آنکھوں سے ایوان نشاط کو تک رہا تھا۔ دوسری منزل کے ستون جو کسی قدر پیچھے کو ہٹے ہوئے تھے زیادہ خوبصورت اور نازک بنائے گئے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر تاج کے بجائے چار زنانہ سر بنائے گئے تھے۔ جو مصری کلاہ کی تمام خوبیوں اور رعنائیوں سے آراستہ تھے۔

ان محراب خانوں کی تیسری منزل اور نمونہ پر تعمیر کی گئی تھی۔ یہاں برنجی نیل نصب تھے جن کی سونڈوں سے عطر کے فوارے چھوٹتے تھے اور سب سے اوپر آسمانی رنگ کی چھت بنائی گئی تھی۔ جس میں ستاروں کی طرح عجیب و غریب قمقمے آویزاں تھے۔ بے داغ سنگ یشب کے زینے جن پر اس قدر پالش کی گئی تھی کہ آئینہ کی طرح ان میں انسان کا عکس نظر آتا تھا۔ دونوں طرف عمارت کے ان حصوں کو مربوط کئے ہوئے تھے۔

میمون اس وقت کتان کے ملبوس میں تھا۔ جس پر ستارے جڑے ہوئے تھے۔ شانہ پر طاؤسی رنگ کی عبا پڑی ہوئی تھی۔ اور شاہان مشرق کی طرح بالوں پر ایک زرکار سربند تھا۔ قلو پطرہ کی زریں پوشاک دھانی رنگ کی تھی۔ دونوں طرف سے کھلی ہوئی۔ جس میں شہد کی مکھیوں کی وضع کے طلائی تکمے لگے ہوئے تھے۔ بازو برہنہ تھے۔ اور کلائیوں میں جواہر نگار کنگن جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ سر پر مخروطی شکل کا طلائی تاج چمک رہا تھا۔ باوجودیکہ وہ مسکرا سی رہی تھی۔ لیکن اس کی پیشانی پر کسی آئندہ ہونیوالی بات کے خیال کی جھلک نظر آتی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً ابرو پر بل پڑ جاتے تھے۔

قلو پطرہ آ کر ایک طلائی مسند پر متمکن ہوئی اور میمون کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اور تالی بجائی۔ فوراً ہر طرف اس قدر روشنی نمودار ہو گئی کہ محل بقعۂ نور بن گیا۔ اور تمام مجسموں کی جواہر نگار آنکھوں سے بجلیاں سی برسنے لگیں۔ اور وہ برنجی ہاتھی جنکے سونڈوں سے گلاب اور کیوڑہ کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ دفعتاً شعلے اگلنے لگے۔ در و دیوار میں برنجی ہاتھ پیدا ہو گئے۔ جن میں سے ہر ایک شمع لئے ہوئے تھا۔ در و دیوار پر جو کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے کٹوروں سے

روشنی باہر نکلنے لگی۔ برنجی تپائیوں پر بڑے بڑے نیلگوں شعلے جھلانے لگے۔ الغرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو چمکتی نہ ہو اور روشنی نہ پیدا کر رہی ہو۔ بلوری شلثی ٹکڑوں کی رنگین شعاعیں قوس قزح کی طرح ہر طرف فضا میں پھیل رہی تھیں۔ اور عجیب غریب سمان پیدا کر رہی تھیں۔ سنگ مرمر و سنگ سماق کے زینوں کی سیڑھیوں پر روشنی کی شعاعیں اس طرح کھیل رہی تھیں گویا نور سیال کی آبشاریں جاری ہیں۔

اس وقت یہ بزم نشاط شباب پر تھی۔ اور ہر قسم کا "نعمت خانہ" ادھر سے ادھر تک چُنا ہوا تھا۔ جزیرہ کریٹ کی شرابیں۔ فارتوس کے بادۂ ناب کی صراحیاں جن کی گردنوں میں گلاب کے گجرے پڑے ہوئے تھے۔ ایشیا نژاد غلام جن کے ریشم جیسے ملائم لمبے لمبے عنبریں بالوں سے شراب پینے والے اپنے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔ اور عجیب غریب قسم کے ساز۔ جو فضا میں ایک روح پرور ترنم پیدا کر رہے تھے۔ یہ تھا ایوان نشاط جہاں میموَن اپنا سر قلوپطرہ کے حسین مرمریں شانہ پر رکھے ہوئے یہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید یہ سارا ایوان اپنی تمام تعمیری وسعتوں اور ہولناک خوبیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں گردش کر رہا ہے اور چونکہ مستی کے عالم میں نظریں ایک جگہ قائم نہ ہو سکتی تھیں اس لئے ہر چیز مسلسل دور تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جتنے نئے ایوان نئے نئے محل تعمیر ہو رہے تھے وہ اس قدر بلند تھے کہ مینار بابل کو بھی اتنی بلندی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اگر اس وقت وہ اپنے ہاتھ میں قلوپطرہ کا نرم و گرم ہاتھ نہ پاتا تو وہ یہ سمجھتا کہ اسے عجم کے کسی بزرگ مجوسی نے چشم زدن میں پرستان کے کسی طلسم کے اندر پہونچا دیا ہے۔

خاصہ کے بعد کوزہ پشت بونے اور نقال نکل کر نقلیں کرنے لگے۔ مصری اور یونانی اچھوتیوں نے جو "لیل و نہار" کی مظہر تھیں یونانی طرز کا ایسا ولولہ انگیز اور ہیجان آفریں رقص شروع کیا کہ ہر شخص بیچین ہو گیا۔

اسکے بعد قلوپطرہ اپنے تخت جاہ و جلال سے اٹھی۔ لباس شاہی اُتار دیا، تاج کو، جس میں جواہرات ستاروں کی طرح درخشاں تھے اتارا اور اس کے بجائے پھولوں کا ایک ہار پہن لیا۔ اپنے مرمریں ہاتھوں میں قدیم وضع کی چھ چھتی لی اور میموَن کے سامنے رقص کرنا شروع کیا۔ اس کے خوبصورت سڈول ہاتھوں نے جو گویا بہترین بلور کے بنے ہوئے تھے چھ چھتی سے دلربا تال بجانی شروع کی اور یہ تال رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ ناچتی ناچتی اور بھاؤ بتاتی ہوئی وہ اپنے حسین پاؤں کی گلابی انگلیوں کے بل بجلی کی طرح میموَن کے پاس پہونچی۔ پیشانی کو چوما اور پھر اپنے حیرت انگیز فن میں مصروف ہو گئی۔ وہ کبھی آگے کو جھکتی۔ کبھی نیم وا آنکھوں کے ساتھ پیچھے کو ہو جاتی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال عنبریں پرچم کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ کبھی ہنستی۔ کبھی مسکراتی۔ کبھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اور کبھی بجلی کی طرح دور تک کوند جاتی۔ الغرض وہ جگہ جگہ اس طرح پھر رہی تھی جیسے ایک پھول سے دوسرے پھول تک کوئی رنگین تیتری پہونچ جاتی ہے۔

قلو پطرہ پھر ایک بار میموَن کے پاس آکر بیٹھی ۔ رات گذر چکی تھی ۔ ان سیہ مستیوں کا آخری گھنٹہ بھی گذر جانیوالا تھا ۔ ایک خفیف سی نیلی بزم نشاط کی شعلہ بار سرخ روشنی میں اس طرح داخل ہوئی گویا نورِ ماہتاب کی ایک کرن کسی بھٹی کے اندر داخل ہو گئی ہے ۔ محرا بحانوں کی بالائی منزل پر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونے لگی ۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا ۔ اتنے میں ایک حبشی غلام جس کے چہرہ پر اُداسی برس رہی تھی ۔ سینگ کی وضع کا ایک جام لے کر میموَن کے سامنے حاضر ہوا ۔ اس میں زہر تھا ۔ اس قدر تیز کہ اگر سینگ کے علاوہ وہ کسی اور ظرف میں ہوتا تو فوراً شق ہو جاتا ۔ میموَن نے اپنی معشوقہ کی طرف ایک نگاہ اُٹھائی گویا اپنی تمام جان اسی ایک نگاہ کے ذریعہ سے نذر کر دینا چاہتا تھا اور زہر ہلاہل کا وہ مہلک جام ہاتھ میں لیکر لبوں سے لگا لیا ۔

یہ دیکھ کر قلو پطرہ کا رنگ زرد ہو گیا ۔ اُس نے میموَن کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا کہ رُک جائے ۔ اسکی جراُت اور جاں نثاری نے اس کے دل پر بیحد اثر کیا ۔ اور وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دفعتاً قرنا و بوق کی آواز سُنائی دی ۔ چار مسلح نقیب از سر تا پا آہن غرق گھوڑوں پر سوار ایوان نشاط میں داخل ہوئے ۔ یہ لوگ انطونی کی فوج کے افسر تھے ۔ جو اپنے آقا سے تھوڑی دور آگے بڑھ آئے تھے ۔ یہ بات دیکھکر قلو پطرہ نے آہستہ سے میموَن کا ہاتھ چھوڑ دیا ۔ دفعتاً روشنی کی ایک شعاع اُس کی پیشانی پر نمودار ہوئی ۔ گویا خورشید تاباں کا ہاتھ سر پر تاج پہنانے آیا ہے ۔

میموَن ۔ ملکۂ عالم دیکھئے ۔ آفتاب طلوع ہو گیا ۔ وقت آگیا ہے کہ رات کے اس کھیل کو ختم کر دیا جائے "۔ اُس نے یہ کہا اور جام لبوں سے لگا لیا ۔ زہر کا حلق سے نیچے اُترنا تھا کہ میموَن پر موت کی بجلی گری اور وہ چشم زدن میں سرد ہو گیا ۔

قلو پطرہ نے اپنا سر جھکا کر دیکھا اور ایک گرم آنسو (جو اس کی زندگی میں پہلا آنسو تھا) اُس جام میں ٹپکا دیا جس کے اندر شراب کے ساتھ موتی حل کئے گئے تھے ۔

انطونی ۔ (ایوان میں داخل ہو کر) قسم ہے ہرقلیس کی اے حسین ملکہ ! میں نے آپ تک پہونچنے میں بہت جلدی کی ۔ لیکن وقت پر نہ پہونچ سکا ۔ میرے خیال میں اب یہ بزم نشاط ختم ہو گئی ہے ۔ مگر یہ فرش پر لاش کیسی پڑی ہے ؟

قلو پطرہ ۔ (مسکراتے ہوئے) کچھ نہیں ۔ صرف ذرا سا زہر تھا جس کا میں نے بایں خیال امتحان کیا تھا کہ اگر میں خدانخواستہ قیصر آگسٹس کے ہاتھوں پڑ گئی تو یہ زہر پوری طرح کام دیگا یا نہیں ۔ آیئے میرے پہلو میں بیٹھ کر یونانی بھانڈوں کا تماشہ دیکھئے ۔

ہمارے علمائے کرام کا عجیب و غریب نظریۂ دینی

اخلاق حسنہ سے نجات یقینی نہیں!

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو میں نے ایک استفتاء مرتب کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

استفتاء

" ایک شخص خاندانی مسلمان ہے اور خود بھی نہایت پابند صوم و صلوٰۃ شخص ہے، تہجد گزار ہے، ذکر و شغل کا بھی عادی ہے، وضع ظاہری بھی بالکل شریعت اسلام کے مطابق رکھتا ہے، لیکن زندگی اُسکی مکر و فریب، کذب و افترا، ایذا رسانی و قطع رحم میں بسر ہوتی ہے۔

دوسرا شخص قوم کا برہمن پشتینی کافر و مشرک ہے، اس کے گلے میں بتوں کی ہیکل پڑی رہتی ہے، رات دن پوجا پاٹ کرتا رہتا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی زندگی ابنائے جنس کی خدمت، یتامیٰ کی پرورش، بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوتی ہے اور اس کی ذات یکسر امن و سکون ہے،

براہ کرم مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے بتائیے کہ ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری یا دونوں ناجی ہیں یا دونوں ناری، اگر آپ چاہیں تو استناداً قرآن، حدیث، و اقوال اکابر کا حوالہ دیدیں ورنہ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف جناب کی رائے بحیثیت ایک عالم دین ہونیکے درکار ہے۔ میں پندرہ دن تک جناب کے فتوے کا انتظار کروں گا۔"

اس کی مطبوعہ نقلیں بغرض حصول جواب حسب ذیل علمائے کرام کے نام روانہ کی گئیں :۔

مولانا کفایت اللہ صاحب دہلی — مولانا محمد عرفان صاحب دہلی

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی — مولانا احمد سعید صاحب دہلی

مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب لکھنؤ
مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ لکھنؤ
مولانا سید سلیمان ندوی اعظم گڈھ
مفتی صاحب ریاست رام پور
مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی ندوۃ العلماء لکھنؤ
مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت پھلواری
مولانا عبد الماجد صاحب بدایونی
مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی
مولانا حسین احمد صاحب دیوبند
مولانا محی الدین صاحب امیر شریعت پھلواروی
صدر مدرس صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ
مولانا لطف اللہ صاحب رحمانی مونگیر
مولانا عبد العزیز صاحب صاحب گنج
مولانا احمد - احمدیہ - بلڈنگ لاہور

مولانا عنایت اللہ صاحب لکھنؤ
مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شیروانی
مولوی قاضی محمد یحییٰ صاحب بھوپال
مفتی صاحب حیدر آباد دکن
مفتی مولانا شبلی صاحب ندوۃ العلماء لکھنؤ
مولانا صبیح الحق صاحب پٹنہ
مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی
مولانا نثار احمد صاحب کانپور
مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسر
مولانا شاہ سید سلیمان صاحب پھلواری
صدر مدرس صاحب مدرسہ امدادیہ دربھنگا
مولانا محمد اسحاق صاحب بھاگلپور
مولانا ابو الکلام آزاد کلکتہ
مولانا عبد الستار صاحب لاہور

ان ۳۲ حضرات میں سے صرف ۱۶ نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی جنکے نام یہ ہیں:-

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
مولانا احمد احمدی - قادیان
مولانا حسین احمد صاحب مدنی
مولانا عبد القادر صاحب مفتی رام پور
مولانا محمد سجاد صاحب بہار
مولانا احمد سعید صاحب دہلی
مولانا سید سلیمان ندوی اعظم گڈھ
مفتی صاحب بلدہ و صدارت عالیہ حیدرآباد دکن

قاضی محمد یحییٰ صاحب بھوپال
مولانا عبد الستار صاحب لاہور
مولانا عبد العزیز صاحب ڈسکا
مولانا نثار احمد صاحب آگرہ
مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلی
مولانا عنایت اللہ صاحب لکھنؤ
مولانا غلام حسین از طرف شاہ سید سلیمان پھلواری
مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ

اب میں اسی ترتیب سے ان حضرات کے جوابات پیش کرتا ہوں :-

مولوی اشرف علی - تھانہ بھون - $\frac{14}{12}$ ۲۶

"سوال متقضی طلب ہے - جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں - ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا محمد یحییٰ صاحب قاضی بھوپال - ۱۲ر دسمبر ۲۹ء

الجواب

" یہ مسلمان ناجی ہے - مکر، فریب، کذب، افترا، ایذا رسانی، قطع رحم کی سزا کا مستوجب یہ مشرک ناری ہے - خدمت ابنائے جنس - پرورش یتامے - ہمدردی بیوگان - یک سر امن ہونا اور سکون اسی کی ذات کا بکار - جواب ہذا کے نتائج قابل انتظار ہیں - جبتک سوال میں استناد کی ضرورت نہیں تو جواب میں بھی نہیں - جب ضرورت ہو تو بہت کچھ موجود ہے۔"

مولانا احمد لاہور - نمبر ۷۲۱۳ - ۱۴ دسمبر ۲۹ء

"اخویم مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بجواب استفتا گذارش ہو کہ مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے جو کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے اسکا ثمرہ اسکو ملتا ہے اور جو کوئی برا کام کرتا ہے اسکی سزا بھگتتا ہے۔

من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ط ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ط ایک جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے - لیس بامانیکم ولا امانی اہل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ ط

نہ تمہاری جھوٹی خواہشیں کچھ کام آتی ہیں نہ اہل کتاب کی جو بھی برا کام کرے گا اسکی سزا اس کو دیجائیگی - اور ایک جگہ فرمایا ہے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین - اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

پس کوئی مسلمان ہو یا اہل کتاب یا مشرک بت پرست ہر ایک کے اچھے اور برے عمل کا بدلہ اچھا یا برا اسکو ملتا ہے - ناری یا ناجی ہونا توازن اعمال پر منحصر ہے جس کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہو وہ آرام اور خوشی کی زندگی پائیگا جس کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہو وہ تکلیف کی زندگی پائیگا -

قارعہ

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ الراضیۃ - واما من خفت موازینہ فامہ ہاویہ ط پارہ ۳۰ سورہ

اور اس کا علم اللہ تعالےٰ ہی کو ہے کہ کس کا پلہ اعمال نیک کا بھاری ہے اور کس کا ہلکا۔ کسی عالم کا یہ کام نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرسکے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔ اس کا علم اللہ تعالےٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔"

مولانا عبدالستار صاحب لاہور۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

الحمد للہ محمد الکون ومنہ استمد التوفیق والعون

انک لعلیٰ خلق عظیم ۔

فقالت خدیجہ

کلا واللہ ما یخزیک ابدا انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق ط (بخاری)

نماز، روزہ، جو کہ مذہب اسلام کے شعائر ہیں، وہ تب ہی منتج نتائج حسنہ ہوتے ہیں، جبکہ ان کی ادائگی ضابطۂ اخلاق فاضلہ کے ماتحت ہو، ورنہ نہیں، ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر ۲۹/۴۵

پس جس نماز کا یہ اثر نہیں، وہ فی الحقیقت نماز ہی نہیں، بلکہ وہ ایک رسمی فعل ہے، اللہ تعالےٰ اس قسم کی رسمی عبادت کو قبولیت کی عزت نہیں بخشتا۔ انما یتقبل اللہ من المتقین ۵/۲۷

اسی طرح ہندو مذہب کے شعائر تب ہی مستوجب نتائج سیئہ بکر اخلاق فاضلہ پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، جبکہ اُنکا ظہور ضابطۂ اخلاق ذمیمہ کے ماتحت ہو، ورنہ وہ صرف ایک لغو رسمی فعل ہے، وبس۔

اخلاق خواہ حمیدہ ہوں، خواہ ذمیمہ، چونکہ یہ نفس انسانی کے وہ افعال ہیں، جن میں فطرت کے نیک پہلو یا بد پہلو کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر حالت میں موثر ہیں، لیس للانسان الا ما سعیٰ ۵۳/۳۹ کل نفس بما کسبت رہینۃ ۷۴/۳۸ کل امرء بما کسب رہین ۵۲/۲۱ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ط ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۹۹/۷،۸ لیکن اخلاق حمیدہ منتج نتائج حسنہ ہیں، لہا ما کسبت ۲/۲۸۶ اور اخلاق ذمیمہ مستوجب نتائج سیئہ وعلیہا ما اکتسبت ۲/۲۸۶

اللہ تعالےٰ مکر، فریب، کذب وافترا، ایذا رسانی، قطع رحم، سے جو اخلاق ذمیمہ ہیں، انسان کو روکتا ہے، اور ابنائے جنس کی خدمت، یتامےٰ کی پرورش، بیواؤں کی ہمدردی، امن وسکون، جو اخلاق حمیدہ ہیں، ان کے کرنیکا ارشاد فرماتا ہے، اور اسکے متعلق ذیل کے قرآنی ارشادات

بغور ملاحظہ فرمائیں۔

یخادعون اللّٰہ والذین اٰمنوا، لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین، وقد خاب من افتریٰ، و من الذین اشرکوا اذًی کثیرا، ویقطعون ما امر اللّٰہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولٰئک ھم الخٰسرون، ولا تعثوا فی الارض مفسدین، وابتغ فیما اٰتاک اللّٰہ الدار الاٰخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللّٰہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللّٰہ لا یحب المفسدین، ان یدعون من دونہ الا شیطانا مریدا، ومن یشرک باللّٰہ فقد افتریٰ اثما عظیما، ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی، واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب، واحسنوا ان اللّٰہ یحب المحسنین ط

والصلح خیر

اب رہا یہ امر کہ میں فیصلہ کروں، کہ ان دو شخصوں میں سے کون ناری ہے، اور کون ناجی، یا دونوں ناری ہیں، یا دونوں ناجی، سو اس پر میں لب کشائی نہیں کر سکتا، کیونکہ میں جنت اور دوزخ کی کنجی کا مالک نہیں ہوں، اس کا مالک مالک الملک لا شریک لہٗ ہے وبس،

ہاں اس قدر ضرور کہوں گا کہ اسلام ہر قسم کے توحید، اعتقادی، عبادتی، عملی، کا خواہاں ہے، اگر ایک طرف عملی توحید مسلوب نظر آرہی ہے۔ تو دوسری طرف عبادتی و اعتقادی توحید کا فقدان ہے، نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

مولانا حسین احمد صاحب۔

الجواب

اول الذکر کا خاتمہ اگر ایمان پر ہوا اور اسکی بد اعمالیوں نے حسن خاتم میں کھنڈت نہ ڈالی تو ضرور ناجی ہے پھر اگر گناہوں سے قبول ہونیوالی توبہ کرنیکے بعد مرا ہے، یا اُسکی تکالیف و مصائب گناہوں کے لئے کفارہ ہونے میں ہم پلہ ہیں تو ابتدا ہی سے نجات پا جائے گا۔ ورنہ سزا پانے یا شفاعت یا لحوق رحمت تعالیٰ کے بعد۔ ثانی الذکر کا خاتمہ اگر شرک و کفر پر ہوا اور اوسکے اچھے اعمال نے حسن خاتمہ اور ایمان تک نہ پہونچایا تو وہ ناری اور مخلد فی النار ہے۔ واللّٰہ اعلم۔ ۱۶ رجب سنہ ۱۳۴۸ھ

مولانا عبدالعزیز صاحب گیلانی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۹ء

الجواب بعون اللہ العزیز الوہاب ط

کسی محکم قانونی نظام کی تحت میں عمل پیرا ہونے پر اعمال کے نتائج مترتب ہوا کرتے ہیں۔ جیسے عمل ہوں گے ویسے ہی ثمرات۔ خیر ہوئے تو خیر۔ شر ہوئے تو شر ہوں گے۔ لیکن جہاں کسی قانونی نظام کی تحت میں عمل نہیں ہوتے بلکہ صرف کورانہ تقلید۔ یا آباو اجداد کے نقش قدم کی اتباع تو وہاں من حیث عمل اچھے بُرے ہونیکی رائے انسانی عقل چاہے کچھ بھی دیاکرے ہر نظام قانونی کے نقطۂ نظر سے وہ ایک غیر منتج عمل ہی تصور کیا جائے گا۔

یا بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ بار آوری کے لئے زمین اور تخم کی صلاحیت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر زمین صالح تھی۔ پھر خراب تخم ڈالے گئے تو خراب ہی ثمر برآئیں گے۔ اور اگر تخم اچھے ہیں پر زمین میں صلاحیت نہیں۔ تو کچھ بھی ثمر نہیں دیگی۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

زمین شور سنبل بر نیارد — درو تخم عمل ضائع مگرداں

رحمت عالم سید العرب صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے التوحید راس الطاعات کے مبارک ارشاد میں بصیرت افروز اشارہ ارباب بصیرت کے لئے اسی کی طرف فرمادیا ہے فتدبر۔

اس تمہید کے بعد جواباً گذارش ہے

کہ ایک طرف تو مسلم موحد ہے جسکے بھلے بُرے اعمال عباداتاً و اخلاقاً نظام قانونی کی تحت میں ہو رہے ہیں اسلامی نقطہ نگاہ سے اُسکے اچھے بُرے اعمال کے ثمرات کا ترتب عالم آخرۃ میں یقینی ہوگا۔ خیر۔ خیر شر۔ شر ہوں گے۔ اگر خیر محض ہیں تو ناجی اور شر محض ہوئے تو پس از عقوبت ناجی ہوگا۔ اور مختلط فی العمل بالعفو والکرم یا بعد از سزا و نعم نجات پانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔

دوسری طرف مشرک و کافر ہے۔ اس کے اعمال گو ملک و قوم۔ ابنائے جنس کی خدمت اہل وطن کے حق میں تو بہت ہی مستحسن نظر آتے ہیں۔ اور اُس کی ذات سراپا امن و سکون بنی ہوئی ہے پر قرآنی نقطۂ نظر ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وہو فی الاخرۃ من الخاسرین سے اجمالاً اور مثل الذین کفروا بربہم اعمالہم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا علیٰ شئی سے صراحتاً ناجی ہونے کے خلاف میں شہادت ملتی ہے۔ ھذا ما عندی رلی من الکتاب واللہ اعلم بالصواب ط

مولانا عبدالقادر صاحب مفتی رام پور۔

الجواب باللہ تعالیٰ التوفیق

بصورت مسئولہ اسلامی نقطۂ نظر سے کافر و مشرک بوجہ شرک ناری ہے جس پر قرآن مجید شاہد ہے، ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء الآیۃ اعمال خیر مصرحہ سوال باعث نجات نار نہیں۔ بلکہ ان کا ثمرہ دنیا میں حاصل ہونا ممکن۔ آخرت میں کفار کا کوئی حصہ خیر نہیں جس پر نصوص قرآنی شاہد ہیں۔ مسلمان اگرچہ کیسا ہی گنہگار ہو۔ اُسکی مغفرت کی یقینی امید ہے لقولہ تعالیٰ یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء الآیۃ، خواہ مغفرت فرما کر اللہ تعالیٰ بلا عذاب نجات فرماوے یا بقدر گناہ عذاب دیکر نجات بخشے یہ مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ بہر حال مسلمان ناجی ہے، واللہ اعلم یہ نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ جسکے سوال کی حاجت نہ تھی، اللہ ایسے شبہات آپکے دل سے نکالدے۔

مولانا نثار احمد صاحب آگرہ۔

الجواب وہو الموفق للصواب

سائل نے وہ سوال فرمایا جس سے ہم جیسے کم فہم اپنے آپ کو مفتی ہوتے ہوئے خدا کے ٹھیکہ دار اور ناری ناجی ہونے کا فیصلہ کرنیوالا سمجھنے لگیں۔ قرآن فرماتا ہے۔ یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء یوں پوچھا جانا چاہئیے کہ ازروئے شرع شریف کون اچھا ہے اور کون مستحق مدح ہے، بہر حال اہلسنت والجماعت کا مذہب ہے کہ مرتکب کبائر گناہ کا فاسق ہوتا ہے کافر نہیں ہوتا ہے، یہ تو پہلے شخص کی نسبت حکم شرعی ہے کہ وہ فاسق ہے مگر کافر نہیں اب اللہ کے اختیار میں ہے جو چاہے کرے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ جو مسلمان شرک اور کفر خالص سے محفوظ رہے اور اللہ کے حوالہ چاہے تو بخشدے یا بقدر گناہ سزا بھگت کر جنت میں داخل ہووے۔

دوسرے صاحب کی نسبت قرآنی فیصلہ ہے کہ بغیر ایمان واسلام کے بڑی سی بڑی نیکی بیکار ہے، عمر بھر نیکی کرے تمام عمر شب بیداری کرکے اللہ کو یاد کرے لاکھوں روپے خیرات کرے۔ بے ایمان واسلام کے تو معتبر نہیں۔ قرآن میں ہے۔ من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وہو مومن الخ والذین کفروا اعمالہم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتیٰ اذا جاءہ لم یجدہ شیئاً ط واللہ اعلم بالصواب ط

مولانا محمد سجاد صاحب ۔ پھلواری ۔

الجواب ہو الموفق للصواب

پہلا شخص اپنی بداعمالی اور محرمات قطعیہ کے ارتکاب کی وجہ سے مستحق عذاب ہے ۔ لیکن ایمان و اسلام کی وجہ سے غفران کی امید ہے اور بعد تعذیب آخری نجات کا تحقق بشرطیکہ ایمان و اسلام پر اوسکا خاتمہ ہو ۔
دوسرا شخص اپنے عقائد و اعمال شرکیہ کی وجہ سے مستحق عذاب ہے اور یہ کہ ہمیشہ عذاب الٰہی میں مبتلا رہے بشرطیکہ اوسکا خاتمہ بھی اسی کفر و شرک پر ہو ۔ (العیاذ باللہ)
ظاہری اعمال بر اور تبرعات، ایمان باللہ و بما جاء الرسل علیھم الصلوٰۃ والسلام کے بعد آخرت میں مفید ہو سکتے ہیں ۔"

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و مولانا احمد سعید صاحب دہلی

الجواب

اسلامی اصول کے موافق نجات کے لئے ایمان لازم ہے ۔ مشرک کے لئے نجات نہیں ہے ۔ قرآن مجید میں ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء (نساء) اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دیگا ۔ یعنی مشرک کی مغفرت کے ساتھ مشیت ایزدی متعلق ہی نہ ہوگی ۔
خازن میں ہے ۔ و معنی الآیۃ ان اللہ لا یغفر لمشرک مات علی شرکہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء یعنی و یغفر مادون الشرک لمن یشاء من اصحاب الذنوب والآثام (خازن ص ۴۵۳ مطبوعہ مصر جلد اول)
یعنی آیت کریمہ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرک کو جو مشرک ہونے کی حالت میں مرجائے نہیں بخشے گا اور شرک کے علاوہ دوسرے گناہ اور جرائم والوں میں سے جسے چاہے گا بخش دیگا ۔ اور حدیث میں ہے ۔ ثم امر بلالا فنادی فی الناس انہ لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ (بخاری جلد اول ص ۴۳۱) یعنی پھر حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے بلال کو حکم دیا تو انھوں نے لوگوں میں پکار کر کہدیا کہ جنت میں صرف نفوس مسلمہ داخل ہونگے ۔

ہاں جو مسلمان کہ ایمان و اسلام کے ساتھ گناہوں کا مرتکب بھی ہوگا۔ اگر توبہ کرکے نہ مرے تو اس کو گناہوں کے بدلے جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔ یعنی وہ عذاب نہ دئے جانے کا مستحق ہے اگر حق تعالےٰ چاہے تو اُس کو بغیر عذاب دئے بخش دے اور چاہے عذاب دیکر بالآخر نجات دے۔

کافر اور مشرک کے پاس نجات کی اساسی شرط اور رضاء حق تعالےٰ کی کلید یعنی ایمان نہیں اسلئے وہ نجات جسکو رضاء مولےٰ کے حصول یا وصول الی اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے نہیں پاسکتا۔ نہ نجات کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

انسانی روح کی منزل مقصود رضاء مولیٰ یا بلفظ دیگر وصول الی اللہ ہے۔ اس منزل مقصود تک سفر کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ ایمان کی قوت (سٹیم) ہے۔ اعمال حسنہ اس قوت کی معین ہو سکتے ہیں لیکن اصل قوت کا کام نہیں دے سکتے۔

مثلاً ایک مقام پر دو ٹرینیں کھڑی ہیں۔ ایک ٹرین کے ڈبے نہایت نفیس صاف و شفاف اعلےٰ درجہ کے ہیں۔ ڈبوں میں ہر قسم کے راحت کے سامان خواکہ الوان طعام سب موجود ہیں۔ اس میں بیٹھنے والے نہایت راحت و آرام پاتے ہیں۔ کھانا کھاتے۔ مٹھائیوں اور میووں سے لذت حاصل کر رہے ہیں۔

دوسری ٹرین کے ڈبے نہایت میلے کچیلے خراب خستہ ٹوٹے پھوٹے۔ نہ کسی قسم کی راحت کا سامان نہ کھانے پینے کا آرام۔ اس کے پرزے بھی پرانے گھسے ہوئے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی ٹرین میں سٹیم کا انجن نہیں ہے اور دوسری میں سٹیم والا انجن لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری خراب خستہ ٹرین باوجود اپنی تمام قباحتوں اور خرابیوں کے واصل الے المقصود (ناجی) ہوگی۔ اور پہلی نفیس اور صاف و شفاف ٹرین باوجود اپنی تمام خوبیوں بلکہ راحت پاشیوں اور فائدہ رسانیوں کے غیر واصل الے المقصود (غیر ناجی) ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس ٹرین میں سٹیم کا انجن لگا دیا جائے۔ تو اس کی سیر الی المقصود اعلیٰ و اکمل ہوگی۔ لیکن جب تک اصل قوت یعنی سٹیم کا انجن نہ ہو اس کی تمام خوبیاں فائدہ رسانیاں زر پاشیاں۔ ڈبوں کی صفائی پرزوں کی خوبی اور مضبوطی سب بیکار ہے۔

یہی مطلب ہے اس آیہ کریمہ کا۔ ان الذین کفروا وماتو وھم کفار فلن یقبل من احدھم ملٔ الارض ذھباً ولو افتدیٰ بہٖ (آل عمران) یعنی جو لوگ کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں مرگئے تو انمیں سے کسیکی طرف سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ سونا اُسنے فدیۂ خسران یعنی عدم نجات کے طور پر پیش کیا ہو مراد یہ ہے کہ چونکہ اس نے وصول الے اللہ کے لئے اصل قوت محرکہ و موصلہ حاصل نہیں کی (یعنی ایمان) تو اگرچہ دنیا میں اُسنے زمین بھر سونا بھی خرچ کیا ہو مگر یہ اُسکے لئے ایمان (یعنی اصلی قوت موصلہ) کے قائم مقام نہ ہوگا۔

جس طرح کہ مثال مذکور میں ریل ٹرین کی خوبصورتی صفائی مضبوطی فائدہ و راحت رسانی وصول الی المقصود کے لئے کام نہ آئی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی قوت موصلہ کا کام نہیں دے سکتی اور جب تک قوت موصلہ نہ ہو ہر ایک کا وجود بیکار ہے۔

جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اسکی صفات مالکیت، ربوبیت، رزاقیت وغیرہا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے لئے تو اس امر کا سمجھ لینا کچھ مشکل ہی نہیں کہ اسلام نے نجات کے لئے ایمان باللہ کو کیوں لازم قرار دیا ہے۔

بادشاہ سے بغاوت ایسا جرم ہے کہ اسکے ہوتے ہوئے مجرم کی تمام صفات حسنہ اُسکے بچانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ بالخصوص جبکہ بادشاہ نے یہ اعلان بھی کر دیا ہو کہ باغی کا جرم معاف نہیں کرونگا۔ باقی جرائم کو چاہوں گا تو معاف کر دوں گا۔

یہ شبہ کہ جس شخص کی زندگی ابنائے جنس کی خدمت۔ یتامےٰ کی پرورش۔ بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوئی ہے اس کا ناجی نہ ہونا اس امر کو مقتضی ہے کہ یہ اعمال حسنہ بےکار اور ضائع ہو جائیں اور یہ بات غیر معقول ہے۔ اس امر پر مبنی ہے کہ اعمال حسنہ کو نجات کے لئے موجب بالذات مانا جائے اور یہ غلط ہے کیونکہ نجات بہ معنے وصول الی اللہ کا تصور بغیر اللہ تعالیٰ کے اعتراف اور ایمان باللہ کے نہیں ہو سکتا۔ اور کافر جبکہ بت پرست عابد صنم ہے۔ مومن باللہ اور مصدق بالصفات موحد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تو اس کے افعال حسنہ بہ نیت تقرب الی اللہ (یعنی سیر الی اللہ) ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اُن کو حقیقۃً افعال حسنہ ہی کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے یہ لازم ہی نہیں آیا کہ افعال حسنہ بیکار ہو جائیں۔

دوم یہ کہ ایسا شخص جو نیک کام کرتا ہے اُس کی منزل مقصود حصول نیک نامی ہوتی ہے اور یہ مقصد اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ من سمع سمع اللہ بہٖ۔ پس اس کے اعمال کا بطلان اور ضیاع لازم نہیں آیا۔

تیسرے یہ کہ اگر باوجود کفر اور شرک کے اس کے اعمال صالحہ میں اگر ادنےٰ سے ادنےٰ شائبہ بھی اعتراف و ایمان باللہ کا ہوگا اور کسی درجہ میں بھی وہ حصول رضاء مولےٰ تعالیٰ کا قصد رکھتا ہوگا تو حضرت حق تعالیٰ اس کے انھیں اعمال صالحہ کو اُس کے لئے وسیلۂ ایمان باللہ بنا دیگا اور اس کیلئے سیر الی اللہ کی اصل قوت (سٹیم) مہیا و میسر فرما دے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اسلمت علیٰ ما سلف لک من خیر سے مفہوم ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اسلام لانے سے پہلے میں نے جو اعمال صالحہ (مثلاً صدقہ غلام آزاد کرنا صلہ رحمی وغیرہ) کئے ہیں۔ کیا مجھے اُن کا بھی کچھ ثواب ملے گا۔ تو

حضور نے ارشاد فرمایا تھا کہ انھیں اعمال کے صلے اور نتیجے میں تو تمکو ایمان اسلام کی توفیق نصیب ہوئی۔
اس مختصر تشریح کے بعد آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ مومن عاصی آخرکار ضرور ناجی یعنی واصل الی اللہ ہے۔ اُس کے ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مولیٰ تعالےٰ اس کو اطاعت و انقیاد کے صلے میں آخرکار ضرور رضامندی کا تمغہ عطا فرمائے۔ اگرچہ وصول الی اللہ کے سفر میں اس کو اپنی خستگی خرابی کمزوری (جرائم و معاصی کی وجہ سے کتنی ہی دیر لگے اور کتنی ہی تکلیف اور مصائب برداشت کرنی پڑیں۔ مگر چونکہ قوت موصلہ (ایمان کی سٹیم) موجود ہے اسلئے ایک نہ ایک دن ضرور منزل تک پہنچ کر رہیگا۔
اور کافر نیکو کار ناجی نہیں یعنی واصل الی اللہ و فائز برضاء اللہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں دُنیا میں اس کے اعمال صالحہ کا بدلہ یعنی نیک نامی منقبت۔ مقبولیت۔ شہرت یا دولت و ثروت مل جائے لیکن ما لھم فی الاخرۃ من خلاق۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محل لکھنؤ۔

ہوالمصوب

ولعبد مومن خیر من مشرک۔ مسلمان مشرک سے بحیثیت اسلام بہرحال بہتر ہے اور ہر مسلمان ناجی ہے گو بعد عذاب ہو اور ہر مشرک مخلد فی النار ہے والعبرۃ بالخواتیم واللہ اعلم

مولانا سید سلیمان ندوی۔

الجواب

۱۔ دونوں ناری ہیں۔ کیونکہ نجات کامل موقوف ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے۔ الذین اٰمنوا وعملوا الصلحٰت سندخلھم جنٰت تجری من تحتھا الانھار (نساء) قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون، والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون والذین ہم لاماناتھم و ھم ماعون والذین ھم علی صلواتھم یحافظون ط (المومنون)
لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین واٰتی المال علی حبہ ذوی القربٰی والیتٰمٰی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون ھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس

اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون (بقرہ-۲۲)

۲- لیکن ممکن ہے کہ پہلا بخشا جائے، اور دوسرا نہیں،

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتریٰ اثماً عظیما (النساء ۷)

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد ضل ضلالاً بعیداً (النساء ۱۸)

مولانا غلام حسنین پھلواروی۔

اس امر میں اختلاف رہا ہے کہ ایمان بغیر عمل اور عمل بغیر ایمان آیا برابر ہیں۔ یا دونوں کے مدارج میں فرق ہے۔ لیکن جمہور اُمت اس بات کی قائل ہے کہ ایمان کا مرتبہ عمل سے افضل ہے۔ لہذا عمل بغیر ایمان۔ ایمان بغیر عمل کے برابر نہیں ہو سکتا۔ عمل کا فقدان موجب عذاب ہے لیکن ایمان کا فقدان زیادہ عذاب کا موجب ہے۔ اس امر پر جمہور کا اتفاق ہے کہ عمل کا فقدان ابدی عذاب کا موجب نہیں ہے مگر فقدان ایمان کی صورت میں اکثریت ابدی عذاب کی قائل ہے اور ایک گروہ ابد سے مراد طول مکث لیتا ہے اور قائل ہے کہ آخری انجام سبھوں کا نجات ہے۔

ہماری ذاتی رائے جمہور کی موافقت میں ہے کہ مومن عاصی کا آخری انجام نجات ہے اور غیر مومن کا عذاب ابدی ہے۔ مگر اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ غیر مومن کا حسنِ عمل تخفیف عذاب کا باعث ہوگا یا نہیں۔

مفتی صاحب حیدر آباد دکن۔

الجواب حامداً و مصلیاً

مسلمان کیسا ہی عاصی کیوں نہ ہو اپنے اعمال کے سبب مستوجب سزا ہوگا۔ لیکن ناری نہیں اس لئے کہ محض اسلام خلود فی الجہنم کو مانع ہے۔ واہل الکبائر من المؤمنین لا یخلدون فی النار وان ماتو من غیر توبۃ ط ص۳۲ شرح عقائد نسفی۔

اگر توبہ کر کے مریں تو مغفرت کی امید ہے۔ کافر و مشرک خواہ اُسکی تمام زندگی نیکیوں ہی میں کیوں نہ گذر

جائے۔ ناجی نہیں اس لئے کہ شرک ناقابل بخشش و مانع حصول بہشت ہے۔ واللہ تعالےٰ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء من الصغائر والکبائر صفحہ ۲ شرح عقائد نسفی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۵ رشعبان المعظم سنہ ۱۳۴۹ھ

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔

جواب استفتاء

اسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

تمہید۔ دفتر رسالۂ نگار سے مطبوعہ استفتاء کی ایک کاپی میرے پاس بھی پہونچی۔ مجھکو تعجب ہوا کیونکہ افتاء منصب دینیہ میں ایک جلیل الشان منصب ہے۔ اس کے مخصوص آداب و شرائط ہیں۔ جن پر عالم دین کی ذات میں جمع ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ ہر جامع شرائط بزرگ پر یہ لازمی ہے کہ بغیر کسی خاص داعیہ دینی کے اس جانب اقدام کرے۔ میں نے اپنی گذشتہ زندگی کے کسی لمحہ میں بھی خود کو نہ منصب افتاء کا اہل سمجھا اور نہ مفتی فی الفروع کی حیثیت سے ملک و ملت کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت مطہرہ کے شعبۂ سیاسیات یا تعلقات بین الملل کے علاوہ کسی استفتاء کا نہ جواب لکھتا ہوں۔ اور نہ حتی الوسع تہیہ کرتا۔ مخصوص شعبہ سیاست میں دوسرے مقدس پیشوایان مذہب کے مقابلہ میں مجھکو بعض حضرات سے نسبتاً زیادہ غور و فکر کا موقع ملا ہے۔ اس لئے بحول اللہ و قوتہ اپنی بصیرت کے موافق سیاسی استفتاءات کا جواب تحریر کرنے میں تامل و تردد نہیں ہوتا۔ میری حیثیت اس سے زائد نہیں کہ مسلمانوں کا قومی خدمت گذار ہوں اور ان میں اپنی بساط کے مطابق اسلاف صالحین کے اسلام کا داعی۔ مذکورہ بالا استفتاء میرے حدود عمل سے بظاہر خارج تھا۔ اس لئے مجھکو تعجب بھی ہوا اور تحریر جواب میں کسی قدر متامل رہا۔ بالآخر اس خیال سے کہ شاید عنوان استفتاء اپنے مشہور و متعارف اصطلاح میں مستعمل نہ ہوا ہو۔ مختصراً جواب لکھنے کا تہیہ کیا اگر ضرورت پیش آئی تو مناسب شرح و بسط کے ساتھ دوبارہ عرض کر دیا جائے گا۔

غالباً یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ جوابات پر اظہار خیال کے سلسلے میں جب میری تحریر کا نمبر آئے تو نقد و تبصرہ کی ایک کاپی مجھکو بھی بھیجدی جائے۔

ہوالہادی

جواب۔ کسی کے ناجی یا ناری ہونے کا علم حقیقی نہ کسی عالم دین کو ہو سکتا ہے نہ عالم دنیا کو۔ حقیقت

انسانی عقل و ادراک کی سطح سے بالاتر ہے۔ اس میں انجام کا اعتبار ہے۔ جو بندوں سے مخفی ہے۔ علیم و خبیر کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان ربک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وہو اعلم بمن اہتدیٰ
جس شے کا ہم کو علم نہیں۔ اس پر ہم حکم نہیں لگا سکتے۔ کسی شخص کی نجات اُخروی یا ہلاکت کا فیصلہ صرف احکم الحاکمین کا کام ہے۔ ان ربک یفصل بینہم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون۔ لہٰذا اس اہم مسئلہ میں قطعی رائے کا اظہار اور کسی مخصوص شخص کے ناجی یا ناری ہونے کا حکم لگانا اعمال الوہیت میں دخل در اندازی کے مترادف ہوگا۔ ہاں البتہ بے شک حق تعالےٰ کے نازل فرمائے ہوئے قانون قرآن کریم کی روشنی میں ظاہری علائم و آثار کی بناء پر جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ استفتاء کے تنقیح طلب فقرات پر اظہار خیال کے بعد آخر میں خلاصہ لکھدیا جائے گا۔

نمبر ۱- خاندانی اسلام کی قید بے اثر اور غیر ضروری ہے۔ کیونکہ کسی شخص کا محض خاندانی مسلمان ہونا اُس کی نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ جب تک کہ وہ خود عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ کا پابند نہ ہو۔ من قعد بہ عملہ لم یسرعہ نسبہ۔ جس کے ذاتی اعمال اُس کو پستی میں گرادیں اس کو عالی نسبی بلند نہیں کرسکتی۔ اور مشرف باسلام ہونے کے وقت کسی نومسلم کا درجہ ایک باعمل خاندانی مسلمان سے اعلےٰ و ارفع ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام قبول کرتے ہی اس کے سارے پچھلے گناہ یہاں تک کہ کفر و شرک سب معاف ہوگئے۔ الاسلام یہدم ما قبلہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونیوالے معصوم بچہ کی طرح تمام آلودگیوں سے پاک و صاف ہوجاتا ہے۔

نمبر ۲- پابند صوم و صلوٰۃ ہونا خاندانی مسلمان کے لئے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح اسلام میں کسی نئے داخل ہونیوالے کے لئے۔ تہجد و ذکر و شغل قلب کی سختی اور سیاہی کو دور کرکے ایمان و معرفت کے نور سے منور کرتا ہے۔ اعمال بر وئے تقویٰ بتدریج ایسے شخص کی زندگی کا جزو لاینفک ہوجاتے ہیں۔ اور معاصی سے سخت نفرت و وحشت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسے نفوس قدسیہ سے بتقاضائے بشریت احیاناً گناہ سرزد تو ہوتا ہے۔ لیکن معصیت آلود زندگی گذارنا اُسکے حق میں محال ہوجاتا ہے۔ غلطی کے بعد فوراً اس کا احساس ہوتا ہے۔ اور جب تک توبہ و استغفار کرکے اس کا اثر زائل نہ کردے اس وقت تک اس کے قلب مضطرب کو چین نہیں آتا۔ ان الذین اتقوا اذا مسہم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ہم مبصرون
والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبہم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وہم یعلمون ط

نمبر ۳ یعنی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے جو کچھ بتایا جس وضع کو مسلمانوں کے

لئے بالخصوص مردوں یا عورتوں کے لئے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس سے محترز رہتا ہے لباس میں غیر مسلموں کی وہ مخصوص وضع اختیار نہیں کرتا جو اسلامی امتیاز کو اٹھادے کہ اگر کسی اجنبی مقام پر اس وضع میں مرجائے تو مسلمان اس کو اپنے طریقہ پر تجہیز و تکفین کرکے اپنے قبرستان میں دفن کرنے سے قاصر رہیں۔ حق تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی وضع و قطع اختیار کرنا بھی پاک و مدنی کی علامت ہے۔

جو اعمال و احوال استفتاء کی ابتدائی دو سطروں میں از فقرہ نمبر ۱ تا نمبر ۹ تحریر ہوئے ہیں جس کسی شخص کے ایسے اعمال و احوال ہوں محال عادی ہے کہ اس کی زندگی ان کمزوریوں سے آلودہ رہ سکے۔ جن کا شمار "لیکن" کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس غریب کی پابندی صوم و صلوٰۃ کسی شخص یا جماعت کو مکر و فریب نظر آئے۔ اس کی نصیحت آمیز تلقین مذہب کذب و افتراء کا لقب پائے۔ اس کی اسلامی وضع و قطع کسی کو پسند نہ آئے۔ یہ فرض محال ہی نہیں واقعات ہیں۔ مخالفین حق و اہل حق کی نسل منقطع نہیں ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے استفتاء کی صورت مفروضہ فرض محال کے درجہ میں ہے۔ بہرحال اگر کسی نیک عمل مسلمان کی زندگی بھی مکر و فریب کذب و افترا ایذا رسانی و قطع رحم جیسے سنگین جرائم سے محفوظ نہیں رہی اور اخیر دم تک تلافی مافات اور سچی توبہ و انابہ کی توفیق بھی نہیں ہوئی اور ایمان و توحید پر قائم دنیا سے رخصت ہوگیا تو ایسے شخص کی نجات یقینی ہے۔ لیکن گناہوں کی پاداش میں معذب ہونا یا نہ ہونا حق تعالیٰ کی مشیئت پر محول ہے۔ حقوق العباد کے سوا بقیہ معاصی کو خواہ ابتدا ہی سے معاف فرما کر جنت میں داخل فرمادے خواہ ان گناہوں کی سزا میں جہنم میں ڈالے اور سزا بھگتنے کے بعد اس کو جہنم سے نکال کر جنت نصیب فرمائے۔

نمبر ۵۔ جواب کا دار و مدار عقیدہ و شرک و کفر پر ہے۔ اسلام نے نہ اپنے ماننے والوں کے لئے ذات کی اونچ نیچ اور نسلی امتیاز کا کوئی حق تسلیم کیا ہے اور نہ کفار و مشرکین اور تمام غیر مسلموں کے لئے، اس کا صاف صاف اور غیر مشتبہ فیصلہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اس نے مشرک و کافر برہمن ہو یا چمار دونوں کی حالت یکساں ہے۔ بشرطیکہ اپنی جماعت کا سرغنہ اور کفر کا علمبردار نہ ہو اسی طرح پشتینی کی قید بھی بالکل بیکار ہے۔ نفس مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ باپ دادا کے کفر کا یہ حصہ دار نہیں۔ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔

نمبر ۶۔ علیٰ ہذا بتوں کے ہیکل ڈالنے یا نہ ڈالنے کا بھی کوئی خاص اثر نہیں۔ اور نہ پوجا پاٹ کرنے یا نہ کرنیکا۔

نمبر ۷۔ کوئی مشرک و کافر ابنائے جنس کی خدمت یتیموں کی پرورش بیواؤں کی ہمدردی۔ غرض اس قسم کی بے شمار نیکیاں کرتا ہوا شرک و کفر کی حالت میں مرجائے تو ناری ہوگا۔ انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماواہ النار۔ رہا اس کی نیکیوں کا معاملہ تو اس کا صلہ اسکو دنیا ہی

میں مل جائے گا۔ کشائش رزق۔ کثرت مال و اولاد۔ نیک شہرت۔ ہر دلعزیزی۔ روحانی کلفتوں اور جسمانی آفتوں سے تحفظ۔ اس طرح دنیاوی صلہ کی ہزارہا شکلیں ہوسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں آخرت میں ایسے رحمدل مشرک کا عذاب کسی سفاک بے رحم کافر کے مقابلہ میں یقیناً ہلکا ہوگا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ عالم آخرت میں کوئی نیکی اس وقت تک معتبر نہ ہوگی۔ جب تک توحید و رسالت کے اعتقاد و اقرار کے ساتھ پیش نہ ہو۔ ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ جہاں تک نجات اخروی کا تعلق ہے۔ کسی مشرک و کافر کی نیکیاں رائگاں اور ضائع ہیں۔ اور اس کا کوئی وزن نہیں لا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا۔ ان کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہوگا۔ وما ھم بخارجین من النار البتہ دوسرے سنگدل کفار کے مقابلہ میں نیک خصلت مشرکوں کو عذاب ہلکا ہوگا۔ ان فی الجنۃ درجات وفی النار درجات ولکل درجات مما عملوا

دین الٰہی میں کفر و شرک کا وہی درجہ ہے جو دنیاوی حکومتوں کے خود ساختہ قوانین میں بغاوت کا ہے۔ اگر بغاوت کا محض شبہ اور کسی ظالم حکومت کے خلاف سازش کا صرف الزام کسی نیک دل پاک طینت نوجوان کی جانب سے خدا و ندان امن و آزادی کے تمام اعلےٰ جذبات انسانیت وہمدردی منقطع کرکے ان مدعیان تہذیب و شائستگی کو سنگدلی و بے رحمی کے جامہ میں پیش کرسکتا ہے۔ اور یہ سنگدلی اور بے رحمی نام نہاد انصاف و قانون کی نظر میں جائز قرار پاتی ہے۔ اور مذہب اور ہذہبیت کے خلاف کسی مجاہد اعظم کی زبان یا قلم کو حرکت نہیں ہوتی۔ تو پھر عقل و دانش کی رب العالمین جسکی شان الذی یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور ہے۔ اس کے اس عادلانہ فیصلہ پر کہ وہ کسی اقراری باغی کو ہمیشہ کے لئے جہنمی قرار دیتا ہے کس کی مجال ہے جو زبان اعتراض کھولے اور جبکہ جزا و سزا اور قانون مجازاۃ عام ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ اور اس قانون کی رو سے ہر نیکی یا بدی کی جزا یا سزا ملتی ہے۔ تو ایمان و کفر جو اساس عمل ہیں۔ کیونکہ مستثنےٰ قرار پاسکتے ہیں۔ اور اعتقاد کفر و ایمان کو کس بنیاد پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا۔ ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام وہ مسلمان جن کا خاتمہ زندگی عقیدۂ توحید پر ہوا ہے ان کا مآل نجات ہے۔ خواہ ابتداً ہو یا اپنے گناہوں کی سزا کاٹنے کے بعد۔ اور سارے کافر ناری ہیں۔ اگرچہ ایک پرہیزگار مسلمان کا درجہ

کسی گناہگار مسلمان سے اعلیٰ و ارفع ہوگا اور اسی طرح ایک رحمدل نیک طبیعت مشرک کا عذاب بے رحم ظالم کافر کے مقابلہ میں ہلکا ہوگا۔ ھذا

نسال اللّٰہ سبحانہ و تعالےٰ ان یجعلنا وایاکم من اتبع ھداہ و یوفقنا لما یحبہ و یرضاہ
و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا محمد و اٰلہ و صحبہ اجمعین۔

(نگار) ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے، تو ان کو چار علیحدہ علیحدہ تقسیموں میں جدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی، دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہے اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اعتراف کرتی ہے۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف ایک مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئیگی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے، کیونکہ نہ اُنھوں نے جواب میں اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا جس سے کچھ سراغ چل سکتا۔ لیکن شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ لفافہ کے اوپر ڈاک خانہ ایک مہر بھی ثبت کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پتہ چلنا مشکل تھا کہ یہ کس بزرگ کی تحریر ہے، کب لکھی گئی اور کہاں سے آئی؟

اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ:-

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا نے گویا غالب کے انداز میں کوئی ادق شعر تصنیف فرمایا ہے۔ جس کے بعض درمیانی حصے متروک و محذوف ہیں۔ اور اپنے نزدیک ایسا مُسکت جواب دیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی بلیغ جواب فریق ثانی کو اس درجہ تکمیل کے ساتھ ساکت کر سکتا ہو۔

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ:" اس استفسار یا استفتاء پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قائم ہونا چاہیئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انھیں تکلف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے" کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جائیگی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ وہ "ناوک فرمائی" ہے، جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی، لیکن اب "حطیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائل روزہ و نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے۔ جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو کی طرح ڈالنے والا ہو۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے:۔

"قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور۔ مفتی صاحب حیدر آباد۔ مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند۔ مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ۔ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب دہلی۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔ مولانا محمد عبدالعزیز صاحب۔ مولانا محمد سجاد صاحب"

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے بہرحال اُسے ناجی ہونا ہے۔ بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔

غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنیوالی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ لب کشائی نہیں کر سکتے اس کا علم مالک الملک کو ہے۔ اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھدیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی۔

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ:۔

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اُس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو "علماء کرام" کے جوابات پر کیا گیا ہے، لیکن میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی یا فطرت انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ان جوابات میں سے کس جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں۔

مولانا ثناء احمد صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب احمدی کے جوابات تو قطعاً لائق اعتناء نہیں کیونکہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ انھیں علم نہیں کون ناری ہے اور کون ناجی اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین رسوخ کی پیدا نہیں کرتا۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیوں مذہب اسلام کو صحیح مذہب مانتے ہیں تو اصولاً وہ یہی جواب دینگے کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بہتر مسلک ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ کیا اسلام کا بہترین مسلک ہونا ان کے نزدیک اس لئے نہیں ہے کہ اسی پر انسان کی نجات منحصر ہے تو ان کو یہی جواب دینا چاہیئے کہ اس کا علم ان کو نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ وہ اس عالم ریب و شک میں کس طرح اپنے آپ کو حقیقی معنے میں اسلام کا متبع کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو دعوت اسلام کیونکر دے سکتے ہیں۔ جبکہ خود انھیں اس امر کا یقین نہیں کہ اسلام نجات کا ضامن ہے۔ مجھے مولانا احمد احمدی کے اس جواب پر بہت زیادہ حیرت ہے۔ کیونکہ احمدی جماعت بالکل تبلیغی جماعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کسی کو بھی اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب بھی زیادہ توجہ طلب نہیں، کیونکہ اُنھوں نے کوئی یقینی صورت پیدا نہیں کی۔ اگر وہ صرف دونوں کے ناری ہونے پر حکم لگاتے، تو علیحدہ گفتگو ہو سکتی تھی، لیکن چونکہ اخیر میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ "ممکن ہے پہلا بخشا جائے اور دوسرا نہیں" اس لئے جو گفتگو راسخون کے جوابات کے سلسلہ میں ہوگی، وہی مولانا ندوی کے فتوے کے خلاف پیش کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے۔ منجملہ سولہ حضرات کے بارہ نے پورے وثوق کے ساتھ مسلمان کے ناجی ہونے پر حکم لگایا ہے خواہ وہ کتنی ہی معصیت کرے اور برہمن کے ناری ہونے کا فتوے دیا ہے۔ خواہ اسکے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے بقول مولانا اشرف علی صاحب پہلے چند تنقیحوں کا قائم کر لینا ضروری ہے۔

۱۔ مذہب کا مقصد صحیح کیا ہے؟

۲۔ اخلاق حسنہ کی غایت کیا ہو سکتی ہے؟

۳۔ ناری و ناجی ہونا کسے کہتے ہیں؟

۴۔ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟

اگر ہم ان چاروں باتوں کا فیصلہ کر سکے تو ان علماء کرام کے جوابات پر بھی تنقید کر سکیں گے۔ اور خو

نگار

نِگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد (۱۹) ماہ مئی ۱۹۳۱ء شمار (۵)

ملاحظات

پھر مجھے لے چلا ادہر، دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

۱۰ر مارچ کو تار ملا اور ۱۲ر کو ایک غیر معلوم زمانہ کے لئے لکھنؤ و فضائے لکھنؤ کو خیر باد کہکر تیسرے دن دولت آصفیہ کے پایۂ تخت میں پہونچگیا۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن کے بعد واپس آجاؤں گا، لیکن جس طرح بقول غالب "عشق پر زور نہیں" اسی طرح حیدر آباد سے واپس آنے پر بھی انسان کا زور نہیں۔ چنانچہ باوجود انتہائی سعی و اضطراب کے ۱۸ر اپریل سے پہلے لکھنؤ نہ آسکا۔

ہر چند یہ روانگی و واپسی اصطلاح حکومت میں نہایت ہی "پرائیویٹ" تھی، اور مجھے اس کا ذکر صفحات نگار میں بھی نہ کرنا چاہیئے تھا، لیکن بعض اُن بدعنوانیوں اور بے پروائیوں کی بنا پر جو میرے زمانۂ غیر حاضری میں کارکنان دفتر و پریس کی طرف سے ظاہر ہوئیں اور جن سے یقیناً ناظرین نگار کو تکلیف پہونچی ہوگی، اس کا اظہار ضروری ہو گیا۔

اپریل کا نگار میری غیبت میں لکھا گیا اور چھاپا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاتب نے حرف بحرف "ڈیڈر

اور مصلح سنگ تینوں نے ملکر غلط نگاری اور غلط بینی کا پورا حوصلہ نکال لیا۔ ہرچند جب میں یہاں موجود ہوتا ہوں، اُس وقت بھی صحت کتابت وطباعت کا کوئی معقول انتظام نہیں کرسکتا، کیونکہ طباعت سنگی کی اس خصوصیت کو محو کرنا کسی انسانی طاقت کا کام نہیں۔ تاہم غلطیوں کا اتنا انبار یقیناً نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو کم ازکم مجھے تو یہ اطمینان رہتا ہے کہ میں نے اپنی پوری کوشش صرف کردی تھی۔

دوسری غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ اپریل کا رسالہ نہ پہونچنے کی شکایتیں کثرت سے موصول ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ میں اب اُن حضرات کو کیا کہوں جو باوصف تکرار اعلان کبھی ۲۰ سے پہلے رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع نہیں دیتے، اور نہ نمبر خریداری تحریر فرماتے ہیں۔ میں تو صرف اپنے ہی دفتر والوں کو مورد الزام قرار دونگا کہ کیوں نہ انھوں نے زیادہ احتیاط سے کام لیا اور افسوس کرتا ہوں کہ کیوں نہ میں جلد واپس آگیا کہ خود فہرست کے خریداران کا مقابلہ لکھے ہوئے پتوں سے کرکے نگار کو روانہ کرتا

تیسری غلطی یہ ہوئی کہ اپریل کا نگار کم تعداد میں چھپوایا گیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تبادلہ کے اکثر اخبارات اور رسالوں کو نہ پہونچ سکا، اور نہ اعزازی فہرست والوں کو۔ الغرض مجھے سخت افسوس و ندامت ہے اور وہ حضرات جن کو اب بھی اپریل کا نگار نہیں ملا ہے۔ اُن سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنا نمبر خریداری درج کرکے مجھے مکرر اطلاع دیں تاکہ میں کہیں سے جستجو کرکے رسالہ فراہم کردوں، اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوں تو نگار کی میعاد خریداری میں ایک ماہ کا اضافہ اور کردوں۔

اسی دوران سفر میں نہایت ہی مختصر زمانہ کے لئے بنگلور جانے کا بھی اتفاق ہوا جو جنوبی ہند کا بہترین مقام مانا جاتا ہے، یہاں یکشبانہ روز قیام کا نتیجہ وہ مضمون ہے "جو جنت کی حقیقت" یا "افسانۂ فردا" کے عنوان سے اس ماہ کے رسالہ میں شائع ہو رہا ہے۔ اس مضمون میں جس فردوس کا حال بیان کیا گیا ہے، وہ حقیقتاً نہ اسلام کی جنت ہے نہ قرآن کی، بلکہ وہ جنت ہے مولویوں کی واعظوں کی، واضعین احادیث کی۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس کو پڑھ کر برہم ہو تو اس راست یا دروغ کا عذاب برگردنِ مولوی ہے۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

میں اپنے قیام حیدرآباد کے حالات قصداً نہیں بیان کرتا کیونکہ اگر ان کا ذکر کروں بھی تو وہی چند مخصوص احباب کی داستانِ لطف و کرم ہوگی جو اس سے قبل سال گزشتہ بیان کرچکا ہوں۔ یا پھر یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدراعظم دولت آصفیہ کی مرحمت خسروانہ اور مکرمت بے پایاں کا افسانہ ہوگا جو نہ میرے لئے نئی بات ہے نہ اوروں کے لئے۔

میں کیوں گیا اور کس طرح واپس آیا۔ اس پر گفتگو کرنا تمناؤں کی طولانی داستان کا چھیڑ دینا ہے۔

دہوپ چھانوں کا فسانہ شروع کر دیتا ہے اور نفسیات انسانی کے بعض اُن عجائب وغرائب سے بحث کرتا ہے، جن کا احاطہ غالباً ایک فانی انسان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ناشکر گزاری ہو یا نہ ہو۔ دل کی مخالفت ضرور ہوگی، اگر میں اسی سلسلہ میں، بے اختیارانہ طور پر حبیب محترم جناب نواب قدرت نواز جنگ بہادر کی یکسر خلوص وصداقت عنایات کا ذکر نہ کروں اور اُن چند لطیف صحبتوں کو بھول جاؤں جن کی یاد کا ماحصل اب سوائے اس خلش کے اور کچھ نہیں کہ

نیم بسمل اُس نے گر چھوڑا تو کچھ پروا نہیں
پر یہ غم ہے اعتبار دست قاتل اُٹھ گیا

کیسے خوش نصیب و خوشکام ہیں وہ لوگ جو نیم بسمل بھی نہیں اور "دستِ قاتل" کا اعتبار بھی رکھتے ہیں! آپ کو معلوم ہے اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ وہ یہ کہ دستِ قاتل اپنے ہاتھ میں ہو، نازک کلائیاں اپنی گرفت میں کسمسا رہی ہوں، نگاہوں کا تصادم ہو اِدھر سے حریصانہ اور اُدھر سے محجوبانہ، غیر محسوس طور پر بُعد مکانی کم ہوتا جا رہا ہو اور آخر کار اس لمحۂ حیات پر نرمی سے اک "مہر دوام" ثبت کر دی جائے۔ ہے کوئی جو میری حسرت دیدار کے ساتھ یہ پیام بھی اُن تک پہونچا دے کہ

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ وچمن
ہمہ ز خویش بُریدند و با تو پیوستند

آہ "پیوستند"!

نواب فخر یار جنگ بہادر اور نواب صمد یار جنگ بہادر کا ذکر میں اس دفعہ پھر کرونگا کہ اُنھو نے پھر اپنے الطاف وکرم سے زیر بار کیا اور وہ بھی ایک سے زائد مرتبہ! اسی طرح مخلص صادق راجہ بھوانی پرشاد صاحب کا بھی شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ اُنھوں نے میری زندگی کی چند تاریک ساعتوں کو رنگین ومنور بنانے میں پوری کوشش سے کام لیا۔ لیکن دبی زبان سے یہ بھی عرض کرونگا کہ

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں

اس سلسلہ میں، اُس شاعر مدہوش اور اس رند معصیت کوش کا بھی ذکر ضروری ہے جسنے اپنی پست بادہ خواریوں کے ساتھ اپنی بلند شاعری سے بارہا لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا اور جناب ساحل بلگرامی اور حضرت اختر کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ ان میں ایک کی "دل پرسیاں" اور دوسرے کی "نیاز نوازیاں" کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں

جناب ہوش بلگرامی کا ذکر کیا کروں کہ اُن کی حیثیت تو ایک مرکز دیا نواۃ (NUCLEUS) کی سی ہے جس کے طواف میں مجھ ایسے بہت سے برقیارے (ELECTRONS) ہر وقت مصروف نیایش نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے ایک مہمان عزیز سید منظور صاحب کے ذکر سے ہیں نگار کے صفحات کو خالی نہیں رکھ سکتا جو میرے نزدیک کثرت عبادت و ریاضت سے بالکل ولی کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی وقت اُن کو "سنگ اسود" کی جگہ ملنے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ سچ ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

میرے قیام حیدرآباد کے زمانہ کو اُنھوں نے اپنی اُن نمازوں سے جو قیام و قعود سے لیکر صاحب فراش ہونے تک کی تمام حالتوں میں ہر وقت ادا ہوتی رہتی تھیں اور ان دعاؤں، تسبیح خوانیوں اور گریہ زاریوں سے جو "گر تو قرآں بدیں نمط خوانی" کی بہترین تفسیر ہوسکتی ہیں۔ اس قدر معمور کر رکھا تھا کہ لبا اوقات مجھے اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ کہیں یہی مرض مجھے بھی نہ لاحق ہو جائے۔ اور لکھنؤ پہونچکر "خلع و طلاق" کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے۔ یوں تو جنون کی بہت سی قسمیں ہیں، اور ہر جنون اپنی جگہ بُرا ہے، لیکن اللہ محفوظ رکھے اس جنوں سے جو وہ اپنے متعلق نماز و وظیفہ کی صورت میں انسان پر طاری کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا عذاب انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ ثواب آخرۃ کی امید میں اتنا سر کھپائے، در آنحالیکہ

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

میں منظور صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ روزانہ ہر نماز و تسبیح کے بعد ایک بار آئینہ میں اپنے خط و خال کا بھی مطالعہ کر لیا کریں کہ باچھیں پھاڑ پھاڑ کر گڑگڑانے اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر زبردستی آنسو نکالنے سے چہرہ کے اعصاب پر کیا اثر پڑتا ہے اور اگر اُن کے اعتقاد کے مطابق واقعی جنت میں کوئی بدنصیب حور اُن کو ملنے والی ہے تو ان کی یہ "عبادت زدہ" صورت دیکھ کر اُس غریب کو کتنا اپنی قسمت پر ماتم کرنا پڑے گا۔ اور خدا کی اس غلط بخشی کو دنیا کیا کہے گی۔ میں منظور صاحب سے معافی چاہوں گا۔ اگر اُن کو برا معلوم ہوا ہو، کیونکہ میرا مقصود حقیقتاً سوائے اس کے کچھ نہیں کہ

کوئی تو بات ہنسی کی نکلے ،
خندۂ صبح قیامت ہی سہی ،

مجھ سے بعض حضرات دریافت فرماتے ہیں کہ کیا مسلمانانِ ہند کے سنبھل جانے کی کوئی امید ہے؟ کیا کوئی صورت ہے کہ وہ وقت حاضر کی نزاکت سے بچکر جان سلامت لیجائیں۔ یعنی اب ال یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت و جلال کو کیونکر واپس لاسکیں۔ بلکہ اسی کو غنیمت جان کر باصد ہزار عجز و تمنا" چاہا جاتا ہے کہ وہ کسی طرح دنیا میں زندہ تو رہیں۔ اُن سے سانس کی آمد و شد کا استحقاق تو نہ چھینا جائے، وہ اپنی عمر طبعی تک تو پہونچنے کے لئے آزاد چھوڑ دیے جائیں۔ خواہ وہ آزادی ایک غلام ہی کی سی کیوں نہ ہو اور وہ حیات وہی کیوں نہ ہو جو راہ میں پڑے رہنے والے ایک گدائے معذور کو حاصل ہے۔ اللہ اکبر! یہ سوال اُس مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، جس کے پرچم پر سوائے انتم الاعلون کے اور کچھ منقوش نہ تھا۔ جبکا گرم سیر میر کارواں تلووں میں چبھ جانیوالے کانٹوں کے نکالنے کی بھی مہلت نہ دیتا تھا اور جس نے کوئی تعین کسی منزل کی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ انسان کو گم سفر رکھنا چاہتا تھا تا آنکہ وہ خود اُس تنہا رازِ آفرینش کو پالے جو انسان کو خدا بنا دینے والا ہے۔ میں یہ سنتا ہوں اور اعماق قلب سے خون کا ایک فوارہ جست کر کے میرے دماغ کی قوت ادراک کو میرے اعصاب بینائی کے انفعال و احساس کو تھوڑی دیر کے لئے سلب کر لیتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے اور میں ایک بُت کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں۔

یقیناً مسلمانانِ ہند اس وقت اُسی منزل سے گزر رہے ہیں جب ترقی و انحطاط کا نہیں بلکہ صرف مادی عناصر حیات کے بقا و فنا کا سوال سامنے آتا ہو۔ اس لئے مجھے حیرت نہیں کہ وہ کیوں یہ سوال کرتے ہیں۔ بلکہ عبرت آتی ہے اس منظر پر کہ وہی قوم جس نے دنیا کو جینے کی نہیں بلکہ جلانے کی زندہ رہنے کی نہیں بلکہ زندہ کر دینے کی راہیں بتائیں۔ آج اسی کے افراد اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کوئی انھیں ہلاک نہ کر دے۔ اگر کوئی کہے کہ مسیح کا معجزہ جاں بخشی صرف شاعرانہ مبالغہ تھا، تو اسے باور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی دعوے کرے کہ موسے کے ید بیضا کی روشنی صرف ایک افسانہ تھی، تو اس کا بھی یقین ہو سکتا ہے اور اگر کوئی بتائے کہ سلیمان کی سطوت شاہانہ محض ایک داستان پارینہ ہے، تو اسکے باور کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدارا کوئی بتائے کہ اس کا یقین کیونکر آسکتا ہے کہ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد مسیحی جاں بخشیوں، موسوی نور افروزیوں اور سلیمانی سطوتوں سے بہت بلند دنیا کی حقیقتوں کو بروئے کار لاکر، محض انسانی عظمت و جلال پر مہر دوام ثبت کرنے کا دعوے رکھتا تھا وہ آج انحطاط کی اس منزل پر پہونچگئی ہے کہ اس دنیا میں غلامانہ سانس لیتے ہوئے بھی اس کا کلیجہ ایک مجرم کی طرح کانپ رہا ہے! حقیقت یہ ہے کہ

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

آج اگر بودھ اور زردشت کے ماننے والے رام و کرشن کی پوجا کرنیوالے موسیٰ و مسیح کے متبعین صفحۂ عالم سے محو ہو گئے ہوتے تو جائے حیرت نہ تھی کیونکہ وہ تعلیم مذہب اخلاق جو اب سے کئی ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس درجہ مکمل نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک ارتقاء انسانی کا ساتھ دے سکتی اور اسلئے اس کو یقیناً بے روح ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن پیروان اسلام کا زوال جسے ابھی صرف ۱۳۵۰ سال کا زمانہ گزرا ہے اور جس کی تعلیم کو تکمیل دیں اور اتمام نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یقیناً سخت حیرتناک واقعہ ہے اور ایک شخص کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اسباب کا سراغ کہاں اور کیونکر لگائے۔

اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب عالم میں گزرے ہیں، ان سب کی تعلیمات۔ دنیا کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر پیش کی گئی تھیں، یعنی وہ یہ تو چاہتے تھے کہ انسان حسن اخلاق سے اپنی اہلی و قبائلی زندگی کو خوشگوار بسر کرے، لیکن نہ ان کے سامنے انسان کا وہ مستقبل تھا جسے سیاست و تجارت یا دولت و ثروت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ وہ اس اصول ارتقاء کو جانتے تھے جو دماغ انسانی کو ایک جگہ قائم کر رکھنے والی چیز نہیں۔ اس راز کو صرف اسلام نے سمجھا اور دنیا کو سمجھایا کہ انسان نام گوشت پوست کا نہیں ہے جو فنا ہو جانیوالی چیزیں ہیں۔ بلکہ انسان نام ہے اسکی فراست و بصارت کا، اقدام عمل کا، ہمت وارتقاء کا اور تمام کائنات پر فرمانروایانہ انداز سے چھا جانے کا اور یہی وہ حقیقت تھی جسے مذہبی زبان میں تشبیہاً و استعارتاً جنت و فردوس، خلود و مسرت، جنات نعیم اور کوثر و سلسبیل سے تعبیر کیا گیا۔ آخرت و قیامت سے ہمیشہ ایک قوم کا انجام و نتیجہ مراد لیا گیا اور موت کے بعد بقاء کا مفہوم بھی انھیں روایات عروج کو بتایا گیا جو انسان کی حقیقی داستان حیات ہے۔ لیکن چونکہ ترقی و عروج حکومت و ثروت انسان میں ہمیشہ تمرد و سرکشی اور انحطاط اخلاق کا باعث ہوا۔ کرتی ہی، اس لئے اسی کے ساتھ اسلام نے وہ تعلیم بھی پیش کی۔ جو مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی صحت کو بھی قائم رکھنے والی تھی۔ اور وہ تعلیم عدل و مساوات تھی۔ عہد رسالت سے قبل اس نوع کی عملی تعلیم کا وجود کسی زمانہ میں نہیں پایا گیا اور عہد حاضر کی تمام ترقیاں اسی اصول پر استوار ہوئی ہیں۔

پھر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کی تمام ترقیاں اسلام ہی کے وضع کردہ اصول پر مستحکم ہو رہی ہیں تو خود مسلمان کیوں اس سے محروم رہے اور ہیں۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کے جواب میں تاریخ ماضی کو پیش کر کے مسلمانوں کی گذشتہ ترقی کو بطور ثبوت سامنے لائے، لیکن مجھے اس میں

کلام ہے کہ واقعی کبھی مسلمانوں نے کوئی ترقی ایسی کی جس کو ہم اسلامی اصول کی پابندی کا نتیجہ بتاسکیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا دور ترقی دو تین سو سال کسے زائد قائم نہ رہ سکا۔ حالانکہ اگر اصول ترقی وہی ہوتے جو اسلام نے بتائے تھے تو جو ترقی ہوئی تھی، وہ نہ صرف یہ کہ علی حالہا قائم رہتی بلکہ آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اس بے بہا تعلیم پر کسی نہ کسی حد تک صرف ۳۰ سال تک عمل ہوسکا اور امیر معاویہ کے تخت نشین ہوتے ہی عدل و مساوات کا قانون بالکل اُٹھ گیا اور اس کی جگہ استبداد و قہرمانیت نے لیلی۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ صحیح اسلامی ترقی نہ تھی۔ بلکہ ملوکانہ تسلط تھا۔ جو دنیا کے مختلف حصوں پر قائم ہوا اور چند دن میں اپنی عمر طبعی کو پہونچکر فنا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ جس تعلیم کو پورے تیس سال بھی پختہ ہونے کے لئے نصیب نہ ہوں، وہ کیونکر دنیا میں استوار ہوسکتی تھی اور کس طرح اُس کا اثر قوم کے تمام افراد پر پڑ سکتا تھا، علی الخصوص اُس وقت جبکہ سلاطین وقت اور شاہانِ عصر کی تمام ستمرانیوں اور بے اعتدالیوں کا ساتھ دینے کے لئے ہمارے علمائے کرام کی ساری جماعت موجود تھی اور جو جھوٹی حدیثیں وضع کر کرکے، لغو و مہمل فقہی مسائل گڑھ گڑھ کر استبداد کو تقویت پہونچا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب عہد نبوی سے قریب تر زمانہ میں ہمارے رہبروں کا یہ حال رہا ہو تو زمانۂ مابعد میں اس کی دنائت کس حد تک نہ پہونچ گئی ہوگی۔ چنانچہ آپ ہندوستان، ایران، مصر ترکی، اسپین کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا۔ کہ یہاں حکمرانی کا انداز کیا تھا اور کیا حقیقتاً ان میں اصول عدل و مساوات پر قانون جہانبانی کی بنیاد قائم کی گئی تھی جو اسلام نے بتائی تھی؟ انھوں نے اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھا، نہ انھوں نے قانون و شریعت کے اصول پر نگاہ کی، نہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ فطرت اور تمدن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور نہ انھوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے خود اپنے آپ میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا جو قدرتی نتیجہ پیدا ہونا چاہیئے تھا، وہی ظاہر ہوا، یعنی اسلام نام ہوگیا، صرف مخصوص لباس و وضع کا مقررہ مراسم و مناسک کا اور علمائے کرام نے اس سادہ فطری مذہب کو، اُس دور وحشت کا مذہب بنادیا، جب انسان مذہب کے نام سے صرف علم الاصنام پیدا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آج اگر کوئی غیر مذہب والا۔ اسلام کی ان کتابوں کو دیکھے جو ہمارے ہاں کے علماء فقہا اور محدثین نے تصنیف فرمائی ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ کیا انھیں روایات و مسائل کی بنا پر اسلام کو فطری مذہب اور محمد کو خاتم النبین ثابت کیا جاتا ہے۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۴۲ پر)

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں

(مسلسل)

اسرے یا معراج

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ[1] من اٰیٰتنا انہ ہو السمیع البصیر

قرآن کریم - بنی اسرائیل - آیت اول

بخاری و مسلم میں انس سے ایک عجیب و غریب روایت بیان کی گئی ہے جس کا میں یہاں لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتا ہوں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - میرے سامنے براق لایا گیا اور وہ ایک جانور ہے سفید رنگ کا گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا - سم دایاں رکھتا ہے - جہاں تک اس کی نگاہ پہونچتی ہے - میں اس پر سوار ہوا اور بیت المقدس تک آیا - اور وہاں اس جانور کو حلقے سے باندھ دیا جس سے اور پیغمبر اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے - پھر میں مسجد کے اندر گیا - اور دو رکعتیں نماز پڑھیں - بعد اس کے باہر نکلا تو جبرئیل دو برتن لیکر آئے - ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ، تو میں نے دودھ پسند کیا - جبرئیل نے کہا تم نے فطرت کو اختیار کیا - پھر جبرئیل ہمارے ساتھ آسمان پر چڑھے، تو فرشتوں نے کہا دروازہ کھولو - پوچھا کون ہے - جبرئیل نے کہا جبرئیل - انھوں نے کہا

---

[1] پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصےٰ تک لیگیا جسکے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ اسکو اپنی نشانیاں دکھلائے - اور وہ سمیع و بصیر ہے - اسرے کے معنی صرف چلانے چلنے کے ہیں جسطرح بات کے معنی گھر میں رہنے کے ہیں - مگر عرب میں ہمیشہ دونوں کے معنی سے رات کا چلنا اور رات کو گھر پر رہنا مراد لیا جاتا ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد اقصےٰ کا نشان باقی نہ تھا بلکہ وہ جگہ مزبلہ تھی - اس کا اشارہ بارکنا حولہ میں ہے کہ اگرچہ مسجد اقصےٰ کا نشان باقی نہ تھا مگر اس کا نواح مقدس و بابرکت تھا - اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصےٰ اصلی شان میں دکھلائی گئی - اسی کا اشارہ لنریہ عن اٰیٰتنا میں ہے - معراج کے معنی اوپر پہنچنے کے ہیں - اور اسلئے اسرے اور معراج میں بے انتہا فرق ہے - اسرے علحدہ چیز ہے اور معراج علحدہ - قرآن سے اسریٰ ثابت ہے مگر معراج ثابت نہیں - رسول اللہ صلعم کا بیت المقدس کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا اور وہاں آنا - یہ سب اسرار خداوندی ہیں - جن پر ایمان لانا پڑے گا۔

تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں نے پوچھا وہ بلائے گئے تھے، جبرئیل نے کہا ہاں بلائے گئے تھے پھر دروازہ کھولا گیا۔ ہمارے لئے اور ہم نے آدم علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعا کی بہتری کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ چڑھتے دوسرے آسمان پر اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے انھوں نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا شخص کون ہے انھوں نے کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ انکو حکم ہوا تھا بلانے کا جبرئیل نے کہا ہاں پھر دروازہ کھلا تو میں نے دو خالہ زاد بھائیوں کو دیکھا۔ عیسےٰ بن مریم اور یحییٰ بن ذکریا کو۔ اُنھوں نے کہا مرحبا اور میرے لئے بہتری کی دعا کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے کہا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے جبرئیل نے کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا ان کو پیغام دیا گیا تھا۔ بلانے کے لئے۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا۔ اللہ نے حسن کا آدھا حصہ انکو دیا تھا۔ انھوں نے مرحبا کہا مجھکو اور نیک دعا کی۔ پھر جبرئیل ہم کو لیکر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے ادریس علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دعا مجھکو دی۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہم نے اُٹھا لیا ادریس کو اونچی جگہ پر۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ پانچویں آسمان پر چڑھے۔ فرشتوں نے پوچھا کون۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا اور کون ہے تمہارے ساتھ۔ انھوں نے کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔ آنے کے لئے۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے ہارون علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور مجھکو نیک دعا دی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ چھٹے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے۔ کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے کہا مرحبا اور اچھی دعا دی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ ساتویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے کہا محمدؐ ہیں۔ فرشتوں نے پوچھا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ اپنی پیٹھ کا بیت المعمور کی طرف۔ اور اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے جاتے ہیں جو کبھی واپس نہیں آتے۔ پھر جبرئیل ہم کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تک لے گئے۔ اس کے پتے اتنے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اور اس کے پھل جیسے بڑا گھڑا۔ جس میں دو مشک سے زیادہ پانی آتا ہے۔ پھر جب اس درخت کو اللہ کے حکم نے ڈھانکا تو اس کا حال ایسا ہو گیا کہ کوئی مخلوق اسکی خوبصورتی کو بیان نہیں کر سکا۔ پھر اللہ نے ڈالا میرے دل میں جو کچھ ڈالا۔ اور پچاس نمازیں ہر رات اور دن میں فرض کیں۔ جب میں وہاں سے اترا اور

اور حضرت موسیٰ تک پہونچا تو انھوں نے پوچھا تمہارے پروردگار نے کیا فرض کیا تمہاری امت پر۔ میں نے کہا پچاس نمازیں فرض کیں۔ انھوں نے کہا پھر لوٹ جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ کیونکہ تمہاری امت کو اتنی طاقت نہ ہوگی۔ اور میں نے بنی اسرائیل کو آزمایا ہے اور انکا امتحان لیا ہے۔ میں لوٹ گیا اپنے پروردگار کے پاس اور عرض کیا اے پروردگار تخفیف کر میری امت پر اللہ تعالے نے پانچ نمازیں گھٹا دیں۔ میں لوٹ کر حضرت موسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ اللہ تعالے نے مجھے پانچ نمازیں معاف کر دیں۔ انھوں نے کہا تمہاری امت کو اتنی طاقت نہ ہوگی تم پھر جاؤ اپنے رب کے پاس۔ آپ نے فرمایا میں اسی طرح برابر اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ کے بیچ میں پھرا۔ یہانتک کہ اللہ تعالے نے فرمایا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن و رات میں اور ہر ایک نماز میں دس نمازوں کا ثواب ہے تو وہی پچاس نمازیں ہوئیں اور جو کوئی شخص نیت کرے نیک کام کرنے کی پھر اسکو نہ کرے تو اسکو ایک نیکی کا ثواب ملے گا اور جو کرے تو اس کو دس نیکیوں کا۔ اور جو شخص نیت کرے برائی کی پھر اس کو نہ کرے تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور اگر کر بیٹھے تو ایک ہی برائی لکھی جاوے گی۔ آپ نے فرمایا پھر میں اترا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ انھوں نے کہا پھر جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اپنے پروردگار کے پاس پھر پھر کر گیا۔ یہاں تک کہ میں شرما گیا اس سے۔" (مسلم۔ ابن ماجہ)

اس حدیث کے لکھنے کے بعد سب سے پہلے یہ اطمینان دلانا ضروری ہے کہ اس روایت کا ماننا شرطِ ایمان نہیں ہے۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا نہ کسی معتزلہ کا قول نقل کر رہا ہوں۔ بلکہ اشعریوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسرےٰ[۵] کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ اور کفر ہے۔ مگر معراج کا انکار کفر نہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اب اس حدیث پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالنا ہے۔

یہ روایت کن بزرگ سے چلی یہ تو حدیث سے ظاہر ہے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے انس ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ انس نے خود کس سے سنا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو یا تو اس کو معراج کی شب کے دوسرے روز سنا ہوگا جبکہ آنحضرت نے اسکا اظہار قریش کے سامنے کیا اور ایک فتنہ کا باعث ہوا۔ یعنی مسلمانوں میں تشکک و ضعف ایمان پیدا ہوا اور قریش کو آنحضرت پر مضحکہ کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ یا پھر آپ نے اس روایت کو آخر زمانہ میں بیان کیا۔ پہلی صورت میں انس کا سننا نا ممکن ہے۔ کیونکہ انس مع اپنی والدہ ام سلیم مدینہ میں آنحضرت کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو وہ ایک طفل صغیر السن تھے۔ یعنی ان کی عمر تقریباً سات سال کی تھی۔ کیونکہ آنحضرت کی رحلت کے وقت انکی عمر ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان تھی۔

---

[۵] اسرےٰ اور معراج کے فرق کے لئے میرا پہلا نوٹ دیکھو (صفحہ ۹ پر)

اگر انھوں نے اس کا تذکرہ بعد کو رسول اللہ صلعم کے زبانی مدینہ میں سُنا - تو سوال یہ ہے کہ اس روایت کو آنحضرت نے مجمع میں بیان کیا - یا انس کے کان میں کہا - قیاس یہ ہے کہ اگر آپ نے معراج کا واقعہ دہرایا ہوگا - تو اس کے سننے والوں میں سے کم سے کم حضرت عائشہ ضرور رہی ہوں گی - مگر ان کا سکوت کچھ معنی ضرور رکھتا ہے - حالانکہ وہ حدیث بیان کرنے میں انس اور ابو ہریرہ سے کم نہیں - واقعہ یہ ہے کہ انس نے اسکو آنحضرت سے نہیں سنا - بلکہ بخاری[۵] کی دو اور روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ یا تو انھوں نے ابو ذر سے سنا - اور یا مالک بن صعصعہ سے اور یا دونوں سے - افسوس کہ میرے پاس اسوقت صحیح بخاری نہیں - البتہ صحاح کی دوسری کتابیں بجز ترمذی اور نسائی کے ہیں - ابو ذر کی حدیثوں میں میں نے معراج کی حدیث تلاش کی تو مسلم میں صرف اس قدر روایت میرے ہاتھ آئی -

"میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کیا آپ نے پروردگار کو دیکھا ہے - آپ نے فرمایا وہ تو نور ہے میں اس کو کیسے دیکھتا - دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ایک نور دیکھا"

بہت ممکن ہے کہ یہ میری تلاش کا قصور ہو - مگر اس تلاش میں ابو ذر کی ایک حدیث میرے ہاتھ لگی ہے جو اپنی ندرت میں معراج کی اس حدیث کو بھی مات کرتی ہے وہ یہ ہے :-

"رسول اللہ صلعم نے اپنے صحابہ سے ایک دن فرمایا تم جانتے ہو کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے - انھوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے - آپ نے فرمایا یہ چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے ٹھہرنے کی جگہ پر عرش کے تلے آتا ہے اور سجدہ کرتا ہے - پھر اسی حال میں رہتا ہے - یہاں تک کہ اس سے کہا جاتا ہے اونچا ہو جا اور لوٹ جا جہاں سے آیا ہے - پس وہ نکلتا ہے اپنی جگہ سے - پھر ملتا ہے اسی طرح - ایک بار اسی طرح ملیگا اور لوگوں کو کوئی فرق اسکی چال میں معلوم نہ ہوگا - یہاں تک کہ اپنے ٹھہرنے کی جگہ آوے گا عرش کے تلے اس وقت اس سے کہا جاویگا اونچا ہو جا اور پچھم کی طرف نکل - پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جانتے ہو یہ کیا ہوگا - یہ اس وقت ہوگا جب کسی کو ایمان لانا فائدہ نہ دیگا - جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو - یا اس نے نیک کام نہ کئے ہوں اپنے ایمان میں"

اگر ابو ذر ایسی ہی حدیثوں کے اہل ہیں تو ان سے معراج کی روایت میں جو کچھ بھی نہ بیان ہو تھوڑا ہے - لہذا ابو ذر سے تو ہمیں رخصت مانگ لینی چاہئے - اب رہ گئے مالک بن صعصعہ - مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب معجزات نبوی دیکھنے کے پہلے مجھے ان کے متعلق کچھ علم نہ تھا - کیونکہ انکی کوئی حدیث مسلم - موطا - ابن ماجہ - ابوداؤد میں مجھے ملی ہی نہیں نہ کہ معراج کی حدیث - سید سلیمان صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ مہاجر نہ تھے بلکہ انصار تھے - لہذا انصار ہونے کی حیثیت

---

[۵] بقول مصنف معجزات نبوی -

سے ان کا معراج کے واقعے کے بعد رسول اللہ صلعم سے کچھ سننا مشہور ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث میں اگر کوئی روایت ہو تو وہ انس کی ہے۔ مگر ان کو معلومات براہ راست حاصل نہیں ہوئیں اور جن لوگوں سے انھوں نے سنا ہے۔ مثلاً ابوذر اور مالک بن صعصعہ ان میں سے کسی کی تائیدی روایت میری نظر سے حدیث میں نہیں گذری۔

ابن عباس اور ابوہریرہ کی روایات معراج

ہر چند کہ ابن عباس و ابوہریرہ کا زمانہ انس سے بھی بعد کا ہے۔ یعنی ابن عباس سال ہجرت میں پیدا ہوئے تھے اور ابوہریرہ فتح خیبر کے زمانہ میں مسلمان ہوئے۔ مگر انھوں نے جو کچھ سنی سنائی باتیں معراج کی بیان کی ہیں۔ اس سے کم سے کم اس قدر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ ان دونوں اصحاب نے رسول اللہ کی سیر ہفت آسمان کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ وہ آنحضرت کا انبیا سے ملنا بیت المقدس میں بتاتے ہیں۔

مسلم میں معراج کے متعلق ابوہریرہ کی روایت حسب ذیل ہے:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے تئیں دیکھا حطیم میں اور قریش مجھ سے میری سیر کا حال پوچھ رہے تھے تو انھوں نے بیت المقدس کی کئی چیزیں پوچھیں جنکو میں بیان نہ کر سکا۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ ایسا رنج کبھی نہیں ہوا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے بیت المقدس کو اٹھا کر میرے سامنے کر دیا۔ میں اسکو دیکھنے لگا اب جو بات وہ پوچھتے تھے میں بتا دیتا تھا اور میں نے اپنے تئیں پیغمبروں کی جماعت میں پایا۔ دیکھا تو موسےٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے وہ ایک شخص ہیں میانہ تن و توش کے اور گٹھے ہوئے جسم کے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور دیکھا عیسےٰ ابن مریم کو وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے میں عروہ بن مسعود ثقفی کو پاتا ہوں اور دیکھا تو حضرت ابراہیم نماز پڑھ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے تمہارے صاحب ہیں۔ آپ نے اپنے تئیں فرمایا۔ پھر نماز کا وقت آیا تو میں نے امامت کی اور سب پیغمبروں نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ایک بولنے والا بولا۔ اے محمد یہ مالک ہے جہنم کا داروغہ اس کو سلام کرو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے خود ہی سلام کیا۔"

دوسری روایت میں ہے:۔

"میں موسیٰ علیہ السّلام سے ملا۔ پھر آپ نے انکی صورت بیان کی۔ میں خیال کرتا ہوں آپ نے یوں فرمایا وہ لمبے چھریرے تھے یا پُر گوشت سیدھے بال والے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور فرمایا کہ میں عیسےٰ علیہ السلام سے ملا۔ پھر آپ نے انکی صورت بیان کی وہ میانہ

قد تھے۔ سرخ رنگ جیسے ابھی کوئی حمام سے نکلا ہو اور آپ نے فرمایا میں ابراہیم علیہ السلام سے ملا تو میں انکی اولاد میں سب سے زیادہ ان سے مشابہ ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے پاس دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب۔ اور مجھ سے کہا گیا جسکو چاہو پسند کرو۔ میں نے دودھ کا برتن لے لیا۔ فرشتے نے کہا تم کو راہ ملی فطرت کی۔ اور جو تم شراب اختیار کرتے تو تمہاری امت گمراہ ہو جاتی۔"

ابن عباس کی روایت ذرا مختصر ہے اور یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وادی ارزق پر گذرے تو پوچھا کون سی وادی ہے لوگوں نے کہا وادی ارزق آپ نے فرمایا گویا میں موسےٰ علیہ السّلام کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ اتر رہے ہیں چوٹی سے اور آواز سے لبیک پکار رہے ہیں۔ پھر آپ ہرشا کی چوٹی پر آئے (ایک پہاڑ کا نام شام اور مدینے کے راستے پر جحفہ کے قریب) آپ نے پوچھا کون سی ٹیکری ہے۔ لوگوں نے کہا یہ ہرشا کی ٹیکری ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں یونس کو وہ ایک سرخ اونٹنی گٹھی ہوئی پر سوار ہیں۔ اور ایک جبہ پہنے ہیں بالوں کا اور وہ لبیک کر رہے ہیں۔

دوسری روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے معراج ہوئی میں موسےٰ بن عمران پر گذرا وہ ایک لمبے آدمی تھے گھونگر والے بال جیسے شنوہ کے آدمی ہوتے ہیں۔ اور میں نے دیکھا عیسےٰ بن مریم کو وہ میانہ قد تھے اور رنگ ان کا سرخ و سپید تھا اور بال ان کے سیدھے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے اور بیان کیا مالک کا اور ذکر کیا دجال کا۔

کیا معراج روحانی تھی یا جسمانی

جیسا میں نے اسریٰ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔ اسرےٰ چلانے و چلنے کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے سیارۃ نکلا ہے اور سیار عربی میں دو ڈکر چلنے والے اور قافلے والے کو کہتے ہیں اسریٰ پر رویا کی تاویل عربی میں بالکل غلط اور لغو ہے۔ رویا دیکھنا ہے اور اسریٰ چلانا یا چلنا ہے۔ لہذا قرآن کے ماننے کیلئے یہ ماننا ضروری ہے کہ آنحضرتؐ راتوں رات مکہ سے بیت المقدس یعنی مسجد اقصےٰ تک چلائے گئے۔ اور اس کے بعد اگر انھوں نے وہاں خدا کی آیات کو ملاحظہ کیا تو اس پر رویا کی تاویل جائز ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کہ کیا آنحضرت کے لئے یہ ممکن تھا میری بحث سے خارج ہے۔ کائنات قدرت میں ایسی باتیں معمولی ہیں۔ اور اللہ کا اپنے بندے کو لمحہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا اس سے زیادہ ممکن ہے۔ جتنا ہوائی جہاز پر لندن سے کراچی ایک ہفتے میں واپس آنا و جانا۔ ہمارا ایمان چونکہ قرآن پر ہے ہم کو اس بات کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ اسرےٰ رویا نہ تھا بلکہ ایک چیز تھی جو معجزات و خصائص نبوی میں سے ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو معمولی خواب ہر انسان دیکھتا ہے اس میں خصائص نبوت کیا پیدا ہوئی۔

وراس پر قرآن شریف کا اس شد و مد سے ذکر اور پھر اس پر کفار قریش اور نو مسلموں میں فتنہ و شور و شغب ہونا سب مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ مگر رویا کی تاویل کرنے والے عام مسلمان ہی نہیں بلکہ اکثر صحابی بھی ہیں۔ ور اسکی ضرورت غالباً انس کی روایات نے پیدا کی ہے۔ کیونکہ آسمان پر جانا چند لمحے[51] میں نور کے لئے ممکن ہے۔ ز فرشتوں[52] کے لئے۔ اور انسان کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک کی تردید میں سائنس و علم ہے۔ اور دوسرے کی تردید میں خود قرآن۔ لامحالہ اس کی تاویل کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان سارے عجائبات کو یا تو غلط سمجھا جائے یا اس کو خواب سے زیادہ وقعت نہ دیجائے۔ میں نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اور اسی کی بحث اس مطالعہ میں ہے پہلی صورت کے اختیار کرنے پر مجھے صرف ایک حدیث سے مقابلہ کرنا رہ جاتا ہے جو انس سے مروی ہے مگر مقطوع غیر مرفوع و شاذ۔

انس کے روایت کی تنقید

تنقید کرنے سے پہلے ایک ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے کہ تا نہ باشد چیزکے مردم نگویند چیزہا کی رو سے ہر روایت کی حقیقت ہے کیا بے سر پا روایتیں ہی اپنی راویوں کی جسمانی اور دماغی حالت کے ساتھ ان کی نیت کا پتہ دیتی تھی۔

انس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک نو عمر غلام تھے۔ اور انکی کثرت حدیث کی سب سے بڑی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے مخاطب دوسری اور تیسری پشت کے مسلمان تھے۔ یعنی تابعین و تبع تابعین۔ انس کا زیادہ تر قیام بصرہ میں تھا۔ مگر قرین قیاس ہے کہ ابتدائی زمانہ انھوں نے شام میں گذارا۔ کیونکہ انس کے سلسلہ اسناد میں شہاب زہری اور قتادہ حسن بصری۔ نافع عروہ اور موسے ابن عباس۔ یہ سب ہی انس کے دیکھنے والے تھے۔ مگر ان لوگوں نے معراج کی حدیثوں کو بیان نہیں کیا ہے۔ سوائے شہاب زہری اور قتادے کے۔ امام مالک نے اپنی موطا میں زہری سے زیادہ اعتنا کیا ہے۔ مگر موطا میں معراج کی یہ حدیث میری نظر سے نہیں گذری۔ موطا میں عجیب تر بات یہ ہے کہ اس میں صرف زہری سے ہی روایتیں ہیں۔ بلکہ مروان حتے کہ عبدالملک سے بھی روایتیں ہیں۔ حالانکہ مروان اور عبدالملک دشمنان اہل بیت میں سے تھے۔ آل مروان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت علیؑ پر تبرہ کہنے کی بدعت خطبہ میں پیدا کی۔ چنانچہ خود مسلم کی اکثر روایتوں جبراً سے ظاہر ہوتا ہے کہ آل مروان کے خلیفہ جو مدینے میں مقرر ہوئے تھے۔ وہ علانیہ حضرت علی پر ممبر پر تبرا کہتے تھے۔ اور کہلاتے تھے۔ زہری ابو ہریرہ کی طرح مروان اور عبدالملک کے وظیفہ خوار تھے۔ لیکن انس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائیوں کا

---

[51] سب زمین پر سب سے قریب ستارے کی روشنی ہزاروں برس کے بعد پہونچتی ہے۔

[52] تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (قرآن)

بطریق یوحنا نحوی دمشقی جو عبدالملک کے زمانے میں گذرا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے اکثر مناظرے کئے ہیں اور اسلام سے اس کے مباحث اب بیروت میں چھپ گئے ہیں۔ اگر یہ کتابیں جعلی نہیں ہیں تو ان تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں میں معراج کا کوئی عقیدہ نہ تھا ورنہ یوحنا ضرور اس کا ذکر کرتا۔ اور اس کی تردید کرتا حالانکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی معجزہ والی بات نہیں کی۔ سوائے شق القمر اور اسرائے بیت المقدس کے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ باتیں کہاں سے دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئیں۔

زنادقہ کی ابتدا اور اُن کے مکائد

سنہ ۱۴۲ ہجری میں جب طبرستان دوبارہ فتح ہوا۔ تو وہاں کے باشندے جو اس وقت تک محض خلافت کو جزیہ دیتے تھے اور اپنے قدیم مذہب مجوسیت پر قائم تھے۔ براہِ راست عربوں کے محکوم ہوئے۔ دہقانوں اور امرائے عجم کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔ ابھی یہاں امن نہ ہوا تھا کہ دیلم میں جہاں کے لوگ مجوس مذہب کے پابند تھے فتنہ برپا ہوا۔ جو دراصل سب خراسان کے مقنع کے قتل کے ضمن میں تھا۔ ایک زمانہ تک بابک خرمی اور اسکے مجوسیوں سے اور مسلمانوں سے سخت مقابلہ رہا۔ بالآخر دیلم دوبارہ فتح ہوا۔ اور ایران سے مجوسیت کا پورا قلع قمع کیا گیا۔ انکی زیادہ تعداد بغداد میں منتقل کردی گئی اور جو کچھ اپنے وطن میں رہے انکے لئے سوائے اس کے اور کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ درپردہ اپنے مذہب پر رہیں اور ظاہر میں مسلمان۔ یہ جماعت بڑھتی گئی۔ اور اس جماعت کو تاریخ میں زنادقہ کہا گیا ہے۔ یہ فرقہ ثانوی عقیدہ کی تبلیغ کے ساتھ اسلام و عرب و رسول کی اہانت کو اپنا فرض جانتا اور مختلف صورتوں سے اس کا پروپگنڈا کیا کرتا تھا۔ ہارون رشید کے زمانے تک تو یہ جماعت خفیہ رہی مگر مامون رشید کے زمانہ میں زنادقہ ظاہر ہوئے اور اپنے باطل عقیدے کی اس درجہ تبلیغ کی کہ بقول کریم اس زمانہ میں امرائے عرب زندیقیت پر فخر کیا کرتے تھے۔ گویا وہ ایک قسم کا فیشن ایبل عقیدہ تھا۔ زنادقہ نے شعوبیت کا سوال اٹھایا یعنی وہ قرآن سے یہ ثابت کرتے تھے کہ عرب کو عجم پر کوئی فوقیت نہیں۔ بلکہ عرب بدترین قوم ہیں۔ زنادقہ کی پوری تاریخ یہاں بیان نہیں کی جاسکتی۔ تفصیل کے لئے گولڈزیہر۔ نولڈیکی۔ فوڈن کریمر کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ زنادقہ نے ایک کمیٹی بنائی جسکا اصل مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہر قسم کے اتہام لگائے جائیں۔ اور اگر صراحتًا بیان نہ ہوسکیں تو ہجو ملیح کیجائے۔ یہ لوگ خرافات سے خرافات باتیں اور بدترین اتہامات سے آنحضرت کو منسوب کرتے تھے۔ زنادقہ کا دور دورہ مہدی خلیفہ عباس سے لیکر متوکل تک رہا ہے۔

حدیث کی تدوین ہارون رشید کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اس کو ذہن نشین کرلو اور یہی کہ زنادقہ کا عقیدہ خرفہ مانویہ کا عقیدہ تھا۔ خرفہ مانویہ جو مجوس اور نصرانیت سے مل کر بنا ہے۔ اس میں مانی کے نسبت یہ خیال ہے کہ اسنے آسمان پر چڑھ کر خدا سے چند کی ملاقات کی۔ اور اپنی سیاحت میں ہفت آسمان کے متعدد پیغمبروں سے ملا اور وہیں سے

اس کو شریعت ملی۔ تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ زنادقہ نے مسلمانوں سے کہا۔ تم کو کس بات پر ناز ہے کیا تمہارے مذہب میں بھی ہماری طرح پانچ وقت کی نمازیں ہیں۔ اور کبھی تمہارے پیغمبر نے بھی ساتوں فلک کی سیاحت کی ہے۔

بھولے بھالے مسلمانوں نے دانتوں کے نیچے انگلی دبالی۔ ان کو یاد تھا کہ ایک زمانہ میں یہودی بھی ایسا ہی طعنہ دیا کرتے تھے کہ واہ بڑے شریف مسلمان ہیں کہ زانی کو چند درے لگا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں دیکھو۔ زانی قتل کر دیا جاتا ہے۔ ابھی وہ اسی حیص بیص میں تھے کہ قرآن کو کس طرح محرف کہا جائے کہ یہ ایک دوسرا تازیانہ لگا۔ بےچین ہو گئے۔ جوش آ گیا۔ اتفاق ایسا کہ حدیثیں ڈہل رہی تھیں تو کیا محدثین سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ وہ بھی رسول اللہ صلعم کو آسمان پر چڑھا دیں اور پانچ وقت کی نماز کے بجائے پچاس وقت کی رکھا دیں۔ الغرض ایک واعظ نے بصرہ یا کوفہ کی جامع میں یہ شگوفہ چھوڑ دیا۔ بس پھر کیا تھا دنیائے حدیث میں آگ لگ گئی۔ اور رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصہ مواد اس فسانہ کے لئے مہیا ہو گیا۔ سوڈیڑھ سو برس بعد جب بخاری نے آنکھ کھولی تو اس پر بڑی بڑی مہریں شنعہ اسناد کی لگ چکی تھیں۔ لہذا اُنھوں نے اس کو داخل دفتر کر لیا۔ اگر یہ نتیجہ نہ نکلا تو پھر تصویر کا دوسرا رُخ تو یعنی زنادقہ نے تو اس حدیث کو وضع کیا تاکہ مسلمانوں کے رسول پر مضحکہ کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔

۱۔ اسلام کا صاف عقیدہ تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان عالم برزخ میں رہتا ہے۔ اور عالم برزخ کی جگہ نہ اول آسمان پر ہے اور نہ دوسرے پر نہ تیسرے پر۔ اس لئے یا تو اس روایت کے رو سے وہ چھ سات ... مرے ہی نہیں اور یا مرے بھی تو دیوتا بنکر ہر ایک آسمان پر بٹھا دئے گئے ہیں۔ یہ عقیدہ مجوس و مشرکین کا ہے مسلمانوں کا نہیں۔

۲۔ اسلام میں آسمان نہ چمڑے کا ہے نہ شیشے کا نہ لوہے کا نہ لکڑی کا۔ اور وہ نہ اس طرح زمین کے اوپر تنا ہے جیسا پرانے زمانے کے بیوقوفوں کا خیال تھا۔ آسمان زمین کے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی۔ داہنے بھی اور بائیں بھی۔ اور سما ایک تقابل مجلہ ہے اور اس سے ہر چیز جو ہمارے سر کے اوپر دکھائی دے۔ حتےٰ کہ بادل بھی وہ سب سما میں داخل ہیں۔ مگر زمین سے آسمان پر جانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ سما درحقیقت حد احاطہ ہے۔

۳۔ اسلام کا خدا انسان کی طرح آسمان پر تخت نشین نہیں ہے۔ وہ ایک لامکان ہے۔ نور ہے۔ اللہ نور السموات والارض۔

۴۔ سورۂ النجم کا تعلق سورۂ بنی اسرائیل سے کچھ بھی نہیں ایک واقع کو دوسرے سے ملانا وہی کر سکتا ہے جو تاریخ نزول قرآن سے واقف نہیں۔

۵۔ سورۃ اسرےٰ میں اور نہ قرآن میں کہیں پچاس یا پانچ وقت کی نماز کا ذکر ہے۔ خود سورۃ اسرےٰ میں اوقات صلوٰۃ کی تعیین اس طرح کی گئی ہے۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرأن الفجر کان مشھودا سورۃ اسرےٰ کی قبل کی سورتوں میں ہی متعدد بار اوقات[۵] صلوٰۃ میں قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا

(۵ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ ہو)

ومن انائ الیل آچکا ہے۔ اور اس پر سارے قرآن میں کہیں زیادتی نہیں کی گئی۔ البتہ اس کا اندیشہ تھا کہ قبل از غروب و قبل از طلوع میں ذرا الہام اوقات کی اور زیادہ صراحت کر دیجائے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کو اطراف النہار یا غیر فی النہار سے ظاہر کیا ہے۔ اور بعض جگہ جیسے سورۃ اسرٰی میں ہے اسکی اور زیادہ صراحت عصر کے وقت کی کر دی ہے۔ اسرٰی کی آیت میں اقم الصلوٰۃ ہے نہ صلوٰۃ۔ یعنی واحد ہے نہ جمع۔ جس سے مراد ایک ہی مسلسل نماز کے ہو سکتے ہیں۔ اور کئی وقتوں کی نماز مراد نہیں ہو سکتی۔ ورنہ جہاں نماز میں بولی گئی ہیں جیسے حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ۔ اس میں دیکھو معنیوں نماز کو جمع سے کہا اور پھر اس میں سے ایک مخصوص نماز کے لئے واحد کیا رہا یہ سوال کہ پانچ وقت کی نماز پھر کہاں سے پیدا ہوئی۔ وہ علٰحدہ مضمون ہے۔ یہاں صرف اسقدر کافی ہے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نماز کی کوئی سند نہیں۔

"حق گو"

(نگار) ہمارے فاضل دوست نے واقعۂ معراج کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے اس سے ہیں بھی اتفاق ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اور ہر شخص بہ اول نظر معلوم کر سکتا ہے کہ واقعۂ معراج کی شرح وبسط میں جو احادیث بیان کیجاتی ہیں، وہ کسی طرح مدخور یقین نہیں ہو سکتیں، لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ اسرٰی و معراج دو علٰحدہ چیزیں ہیں۔

کیا بخاری و مسلم سے جو حدیث نقل کی گئی ہے، وہ سورۂ بنی اسرائیل کی اُس اولین آیت سے متعلق نہیں ہے جسے "آیت اسرٰی" کہا جاتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسرٰی و معراج کی تفریق کیسی اور اگر غلط ہے تو پھر بتایا جائے کہ معراج کا واقعہ قرآن کی کس آیت میں بیان کیا گیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اگر معراج آیت اسرٰی سے متعلق نہ سمجھی جاتی تو اسکی اہمیت اس قدر نہ بڑھ سکتی تھی اور محض حدیث کی بنا پر وہ اس قدر مہتم بالشان چیز نہ بنجاتی۔ یہ واقعہ ہے کہ تمام مفسرین نے بخاری و مسلم کی انس والی حدیث کو اسی آیت کی تفسیر سمجھا اور اسی لئے معراج کے انکار کو نص قطعی کا انکار سمجھا گیا۔ جن لوگوں نے انس والی روایت کو (اس لحاظ سے کہ کوئی عقل انسانی اس کی صحت پر یقین نہیں کر سکتی) نظر انداز کر دیا۔ وہ یقیناً ذوق سلیم کے مالک تھے، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس قدر

سلہ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۔ ملاحظہ ہو) محترم سلطنت معجزات نبوی نے یہ عجیب بات اپنے نوٹ میں لکھی ہے کہ معراج کے قبل صبح و شام کی نماز نہیں تھی۔ کیا یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ حالانکہ ابو حنیفہ نے تو سورہ روم کی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت کی ہے یعنی سورۃ اسرٰی کی قبل کی سورۃ کہ۔

جرات اپنے اندر نہ رکھتے تھے کہ آیت اسرائے کے عام بتبادر مفہوم سے ہٹکر اس کے حقیقی معنی پر غور کرتے اور انھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ واقعۂ اسرائے کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ اُن کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی آیت اسرائے میں کوئی ایسی بات پاتے تھے جو دل میں کھٹکتی تھی اور جس کے متعلق انھیں خیال تھا کہ لوگ باور نہ کرینگے۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ معراج کی حدیث سے انکار کرنا اور اسرائے والی آیت کا وہی مفہوم لینا جو عام طور پر لیا جاتا ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔ ہمارے فاضل مقالہ نگار نے بھی اسرائے و معراج میں تفریق کی ہے اور وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ اسرائے کے انکار قرآن کا انکار ہے۔ اور رسول اللہؐ کا بیت المقدس کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا اور واپس آنا" جیسا کہ آیت اسرائے سے سمجھا جاتا ہے اسرار خداوندی ہیں جن پر ایمان لانا پڑے گا۔ مجھکو اسی سے اختلاف ہے اور اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اسرائے والی آیت یہ ہے:۔

"سبحان الذی اسرٰی بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا"

"یعنی پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصےٰ تک جس کے گرد و نواح کو ہم نے مبارک بنایا ہے تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھلائیں"۔

اس سلسلہ میں تین باتیں تحقیق طلب ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد حرام سے کیا مراد ہے، مسجد اقصےٰ کا کیا مطلب ہے اور لیجانے سے کیا مقصود ہے۔ اس کو غالباً سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسجد حرام سے مراد واقعی مسجد حرام نہیں ہے بلکہ اس سے مدعا شہر مکہ ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مسجد اقصےٰ سے واقعی بیت المقدس کی وہ مسجد مراد لیجائے (جس کے متعلق ہمارے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اُس وقت اس کا نشان تک باقی نہ تھا اور وہ جگہ فرملبہ تھی) اگر لفظ اقصےٰ کے لغوی معنی پر غور کیا جائے اور اس کے معنے دُور یا انتہا کے لئے جائیں تو جس طرح مسجد حرام سے مکہ مراد لیا گیا ہے اسی طرح مسجد اقصےٰ سے دُور کی مسجد یعنی مدینہ سمجھا جا سکتا ہے جہاں لبعد کو رسول اللہ نے راتوں رات ہجرت فرمائی اور مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس لئے یہ آیت اگر مکی مانی جائے تو اس کو ہجرت نبوی کی پیشین گوئی سمجھنا چاہیئے اور اگر لبعد ہجرت مدینہ میں نازل ہوئی تو واقعۂ ہجرت کا بیان۔

بہرحال میرے نزدیک معراج کا کلام مجید میں کسی جگہ ذکر نہیں ہے اور اسرائے والی آیت ہی سے لوگوں نے واقعۂ معراج کو تصنیف کیا، درآنحالیکہ اس آیت میں کوئی بات ایسی الجھاؤ کی

نہیں ہے جس پر معراج جسمانی یا روحانی کی بحث چھیڑی جائے۔ صاف صاف طور پر اس میں مکہ سے مدینے کی ہجرت کا حال بیان کیا گیا ہے جو ایک واقعہ تھا اور حقیقتاً اسلام کے لئے بہت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔

نیاز

سمن لغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۶ سنہ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب پنڈت کرشن انند صاحب بہادر خفیفہ اوناؤ

دیال ولد بھجا ور قوم اہیر ساکن گنگا کھیڑہ مزرعہ بادی کھیڑہ پرگنہ پوروہ ضلع اوناؤ		مدعی

بنام رد ہو۔ بنام

رد ہو ولد رما قوم تیلی ساکن بادی کھیڑہ پرگنہ پوروہ ضلع اوناؤ		مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت مار سے کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۴ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوائے مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوے کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اُسی روز انکو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۳ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

(مہر عدالت)		**دستخط حاکم بخط انگریزی**

وقت حاضری بدفتر سب جج اوناؤ		۱۰ بجے سے ۴ تک

(۱)

سنہرے اناج کے پے درپے کھیتوں کا ایک سلسلہ تھا جس کے کنارے کنارے گھنے اور سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ خزاں کا نیلا آسمان سایہ افگن تھا اور اُس انتہائی نقطہ پر جہاں آسمان اور زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نقاش نے مختلف وضع اور قطع کے پہاڑوں کے ایک سلسلہ کی تصویر کھینچدی ہے اُن میں سے بعضوں کی شکلیں ایک مغرور، سربلند، زرہ پوش، سپاہی کی سی معلوم ہوتی تھیں، بعض بعض اپنے شانوں کو جھکائے ہوئے گیانی سادھوؤں سے ملتے جلتے تھے اور بعض ایسے معلوم ہوتے تھے کہ جیسے کوئی شرمیلی چڑیا اپنی نظروں کو نیچی کئے ہوئے ہے۔ یہ بڑی بڑی پتھر کی چٹانیں گرچہ اٹل، بے جان، اور بے زبان تھیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی وضع قطع سے کسی بات کا اظہار کر رہی ہیں۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ اُسکی آخری کرنیں بادل کے سفید ٹکڑوں پر ضیا پاشی کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھک کر درختوں کے سرے پر جھرنے کی طرح برس پڑتی ہیں۔ دہان کے کھیتوں کے کنارے کنارے ایک تنگ راستہ چلا گیا تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جھرنا دکھائی دیتا تھا جس کے دونوں کناروں پر سنہری بالو کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ چند بھینسیں اور گائیں اس چھوٹے سے چشمہ پر کھڑی پانی پی رہی تھیں دو قدیم نسل کی لڑکیاں اُن کی رکھوالی کر رہی تھیں۔ ان کا سیاہ فام جسم ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں کالے پتھر کی طرح چمک رہا تھا۔

سمارش اور مادہابی دونوں اس تنگ راستہ پر ٹہل رہے تھے۔ مادہابی انتہائی مسرت کے ساتھ اُن رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔ جنکو غروب آفتاب کے شاندار نظارہ نے پیدا کر دیا تھا اُس نے کہا "جب ہم لوگ کلکتہ میں ہوتے ہیں تو ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں سورج کا نکلنا اور ڈوبنا بھی کوئی چیز ہے"۔

سمارش نے ہنس کر کہا "ہملوگوں کو وہاں آفتاب سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے اس لئے اُسے ہملوگ آسانی سے بھلا دے سکتے ہیں۔ لیکن ہملوگ ہر روز کے کھانے میں بھی زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے کیا ہم لوگ یہ غور کرنے کے لئے توقف کرتے ہیں کہ یہ دال اور چاول کہاں سے آتے ہیں؟ یہ سنہرے غلے

کھیت ہم لوگوں کو یاد دلاتے ہیں مگر جیسے ہی وہ ہماری نظروں سے دور ہو جاتے ہیں، دنیا میکڈآم کے بنائے ہوئے اُصول کے مطابق سڑکوں، پتھروں اور سمنٹ کے بڑے بڑے مکانوں سے بھری ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔

یکایک چھوٹے راستہ کی انتہا پر ایک چھوٹی سی جماعت زور زور سے گفتگو کرتی ہوئی اور قہقہہ لگاتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اور ان دونوں کی گفتگو بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے رُک گئی۔ اس جماعت میں بھاری، سنتھالی، اور دوسرے لوگ تھے۔ اس جماعت کے زیادہ تر لوگ گھر کی بنی ہوئی چوڑی چوڑی سرخ کنارے کی موٹی موٹی ساریاں اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سرخ اور سیاہ مضبوط دھاگے زیبائش کے لئے لگائے گئے تھے اور مرد عورت دونوں اپنے بالوں کو سنوار کر چکنے ہوئے جوڑے باندھے ہوئے تھے۔ رنگین موتیوں کے لمبے لمبے مالے اُن کے زیب گلو تھے۔ ان میں سے بہت سے سر پہ گٹھڑے لئے ہوئے تھے عورتیں شیر خوار بچوں کو بھی لئے ہوئے تھیں جن کو انہوں نے اپنی پیٹھ پر ایک سرخ رومال کے ذریعہ سے باندھ لیا تھا۔ سبز سبز ترکاریاں، چاول، اور دال کی ٹوکریاں [illegible] نے دیہات کے میلہ میں خریدا تھا ان کے سروں پر رکھی ہوئی تھیں۔

اسی بھیڑ میں ایک نوجوان لڑکی ایک مرد کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ اُس کے سر پر ایک ٹوکری تھی لیکن کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ ایک کم قیمت انگلستان کی بنی ہوئی چھینٹ کی تنگ انگیا اور ایک نیلی ساری پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ اور گھنے [illegible] جوڑے سرخ فیتہ سے مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اُس کے ماتھے پر قشقہ کا ٹیکا تھا اور اُس کی چپٹی ناک، گول منہ، اور سیاہ رنگ صاف اُسکی نسل کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ کسی سائنس یا صنعت کے اصول کے مطابق [illegible] خوبصورت کہی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنی پُر کیف صحت اعتدال پر ہوئی جوانی میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی، اُس کی چال، اُس کی گفتگو، اور اُس کی ادائیں بالکل بیباکانہ، فطرتی اور دلکشی سے معمور تھیں۔

جب وہ مادہابی کے قریب پہونچی تو اُس نے کہا "میم صاحب! آپ کو آدمی کی ضرورت ہے؟"
اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مادہابی نے شوخی کے ساتھ سارش سے کہا "دیکھتے ہو یہ مجھ کو میم صاحب سمجھتی ہے"۔

سارش نے جواب دیا "تم ایک حبشی حسن کے سامنے ایسی ہی معلوم ہوتی ہو"۔
اس اثنا میں لڑکی متانت کے ساتھ کھڑی رہی۔
"کیا تم ہندوستانی ہو؟" مادہابی نے دریافت کیا "تم نے ہندوستانی زبان کیونکر سیکھ لی؟"

لڑکی نے ہندوستانی یا غیر ہندوستانی ہونیکے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن مادہابی کے سوال کے آخری حصہ کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا "ہم ہندی اپنا پہلا میم صاحب کا پاس سیکھا"

اُس کی ٹوٹی پھوٹی زبان اور لب ولہجہ سے بالکل واضح تھا کہ وہ ہندوستانی نہ تھی۔

"تم کیا کام کر سکتی ہو؟" مادہابی نے پوچھا "میں برتن دھو سکتی ہوں" اُس نے جواب دیا۔ اب اُس کے ساتھی نے بڑھ کر کہا "حضور جو کچھ آپ چاہیں گی وہ کرے گی"

سارش بیتاب ہو رہا تھا بول اٹھا "نوکروں کا شہر میں کال نہیں ہے جو تم سڑک پر بات چیت کر رہی ہو۔ اب ہلوگوں کو جلدی چلنا چاہیئے"

مادہابی نے جواب دیا "ٹھہرو! چونکہ وہ خود آئی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ نہیں مانگیگی۔ کھوکھا کو کھلانے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ لڑکی مضبوط معلوم ہوتی ہے"

سارش نے غصہ سے کہا "تمہارا جو جی چاہے کرو تم ہمیشہ روپیہ برباد کرنیکی فکر میں لگی رہتی ہو"

مادہابی نے اُس کے غصہ کا کوئی خیال نہیں کیا اور لڑکی سے پوچھا "تم کیا لوگی؟"

اُس نے جواب دیا "جو آپ کی خوشی"

مادہابی نے کہا "میں تمکو تین روپیہ اور کھانا دونگی"

"میں چاول نہیں کھاؤں گی میم صاحب" لڑکی نے کہا۔

"کیا چاہتی ہے پلاؤ؟" مادہابی نے مذاق کے لہجہ میں پوچھا۔

لیکن لڑکی نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا "آپ مجھکو چاول دیدیا کیجیگا میں خود پکالونگی۔ ہلوگ باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے ہیں"

سارش نے ہنس کر کہا "اوہ! یہ ذات کے بارے میں بڑی کٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہلوگ آریا نسل سے ہونے کے باوجود بھی ایسی سنتھال لڑکی کے لئے کافی نہیں ہیں"

"بہت اچھا میں تمکو بغیر پکا ہوا کھانا دوں گی اور تین روپیہ مہینہ" مادہابی نے کہا۔

لڑکی بالکل مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ مادہابی نے کہا "میں تم کو اپنا پتہ دونگی اور تمکو وہاں ٹھیک ۶ بجے پہونچ جانا چاہیئے۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟"

"بھگی" لڑکی نے جواب دیا اور مادہابی سے پتہ لیکر چلی گئی۔

مادہابی نے سارش سے کہا "تم ہمیشہ میرے روپیہ برباد کرنے کی شکایت کرتے ہو۔ اگر اُس نے رہنے کا فیصلہ کرلیا تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ کلکتہ میں اگر تم ایک آیا رکھنا چاہو تو فوراً

بیس روپیہ مشاہرہ مانگیگی اور کھانا اور رہنے کی جگہ۔ بجائے اس کے اگر کوئی خادمہ تکو تین روپیہ ماہوار پر ملتی ہو۔ تو یہ فضول خرچی ہے۔"

"تمہاری مرضی جو چاہو کرو۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب تمہارا ہو چکا ہے یہانتک کہ میں بھی، کیا میں کچھ اس سے بھی زیادہ دے سکتا تھا؟"

"میں امید کرتی ہوں کہ تم اس کو یاد رکھو گے۔" مادھابی نے کہا "اگر میں پہلے مرجاؤں تو میری ملکیت جا کر کسی دوسری عورت کو نہ دیدینا۔"

جواب میں سمارش صرف ہنسا۔

(۲)

دوسرے دن علی الصباح ٹھیک ۶ بجے بھنگی اپنے کام پر پہونچ گئی۔ اس کے گلے میں تسبیح والی موتیوں کا چار لڑا مالا تھا اور اُس نے مضحکہ خیز اور تعجب انگیز طریقہ پر بہت سا سرخ فیتہ لپیٹ رکھا تھا۔ مادھابی جلدی سے اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملتی ہوئی اُٹھی اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا "دیکھو وہ کیسی وقت کی پابند ہے گرچہ وہ صرف تین روپیہ مشاہرہ پاتی ہے۔ برعکس اس کے تمہارا بیرا جو بارہ روپیہ پاتا ہے اب تک سو رہا ہے۔ وہ کھوکھا کو صبح کی ہواخوری کیلئے ۹ بجے سے قبل کبھی نہیں لیجا سکا۔ میں یوں ہی فضول کھوکھا کے لئے آیا نہیں چاہتی تھی۔ یہ نکمے نوکر مجھکو پاگل کئے ہوئے ہیں۔

جیسے ہی بھنگی اندر داخل ہوئی کھوکھا نے اُسکی طرف تعجب کی نظروں سے دیکھا اور پوچھنے لگا۔ "یہ کون ہے اماں!"

"وہ تمہاری آیا ہے" ماں نے جواب دیا۔

کھوکھا نے ماں کا منھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنی طرف گھما کر پوچھنے لگا "آیا کیا کریگی؟"

"وہ تمہارے ساتھ کھیلے گی، باہر ٹہلانے کو لیجائے گی اور تمکو اچھے اچھے قصے سنائیگی" کھوکھا خوشی کے مارے اُچھلنے لگا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھنے لگا "کون قصہ وہی بلی اور سیار والا"

اُسکی ماں نے تنگ آ کر جواب دیا "جاؤ اسی سے پوچھو۔"

کھوکھا پہلے پہل کچھ شرمایا اُس نے اپنی ماں کی ساری کے آخری حصہ کو زور سے پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ رہ رہ کر بھنگی کی طرف توہم کی نگاہوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ گرچہ بھنگی بہت متین معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بھی مشکل سے ہنسی کو روک سکی۔ اس نے "آؤ بابو" کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔

یہ ایک پکار کھو کھا کے دل پر فتح پانیکے لئے کافی تھی وہ اس کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا آیا اور چمٹکر کہنے لگا" مجھکو اچھے اچھے قصّے سناؤ"

(۳)

ٹھبکی اپنے کام کو عبادت کی طرح انجام دیتی تھی، صبح کی تاریکی دور ہونے سے پہلے ہی ٹھبکی کھو کھا کے استعمال کے برتنوں کو اکٹھا کرتی اور اپنی کلائیوں سے جھن جھن کا شور برپا کر دیتی۔ کتنا ہی سویرا کیوں نہ ہو ماما بی اُسکو اپنی خواب گاہ کے دروازہ، کھو کھا کو لینے کے لئے مستعدی کے ساتھ کھڑا ہوا پاتی تھی۔ اُس کی سخت پابندی کی وجہ سے ما دہ بی اور سارش کو مجبورًا معمول سے پہلے اُٹھنا پڑتا تھا۔ سارش نے پہلے تو اس پر اعتراض کیا گر وہ ماردہا بی کا مقابل نہ تھا "نہیں! نہیں!! یہ اچھا نہیں ہے" وہ کہتی "تم گرم کملوں کے نیچے سوتے رہتے ہو، جبکہ اللہ کی ایک مخلوق تمہارے حکم کی تعمیل کے انتظار میں تمہارے دروازہ پر سردی سے ٹھٹھر رہی ہے" تمکو یورشینوں کے بُرے اطوار کی نقل اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کے کمرہ سے متصل دکھن جانب ایک بڑا برآمدہ تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے باغ کے سارے درختوں کو ہلاتے ہوئے تیر کی طرح کمرہ کے اندر بہتے نالوں کے حبسوں کو چھیدتے ہوئے اندر گھس آتے تھے۔ ٹھبکی کے پاس سوتی ساری کے سوا کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ اس لئے سارش کو اپنا سرخ کمل چھوڑ کر اٹھنا پڑتا تھا اگرچہ بہت ہی بیدلی کے ساتھ۔

جیسے ہی وہ اٹھتا کو کھا بھی اُچھل کر کھڑا ہو جاتا۔ اُس کے لئے ٹھبکی کی دل موہ لینے والی باتوں کی یاد جادو کی اُس سنہری چھڑی کا کام دیتی تھی، جس کے مس کر دینے سے شاہزادی اپنی دائمی نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور اپنے گھونگھر والے بالوں کو اپنے منھ پر سے ہٹاتے ہوئے چلاتا" پاپا مجھکو نیچے اتارو، میں ٹھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں"۔

اُسکی ماں کہتی" کیا احسان فراموش لڑکا ہے۔ رات بھر مجھکو دیکھنا پڑتا ہے کہ کمل کو بدن سے علحدہ نہ کردے...... میں بہلاتی ہوں، پیار کرتی ہوں، لیکن جیسے ہی صبح ہوتی ہے یہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور چلاتا ہے، میں ٹھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں، جا چلا جا بدمعاش میں تیرے پاس پھر نہیں آؤں گی اور دیکھیں رات کو تیرے ساتھ کون سوتا ہے"۔

کھو کھا اپنے مچھلی جیسے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر کہتا" بہت اچھا ہم ٹھبکی کے ساتھ سوئیں گے"۔
اسکی ماں کہتی" بندر کہیں کا"۔

کھوکھا فوراً ٹھبکی کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا جاتا اور کہتا "میں آگیا ٹھبکی مجھے پیار کرو"

ٹھبکی چاروں طرف ایک دزدیدہ نگاہ ڈالتی اور کھوکھا کا منھ چومنے لگتی وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں مادھابی دیکھ نہ لیں کیونکہ انھوں نے بچہ کا منھ چومنے کی ممانعت کردی تھی کیونکہ یہ حفظان صحت کے اُصول کے خلاف تھا۔

کھوکھا جب ناشتہ کرلیتا تو وہ اور اُسکی کھلائی دونوں باہر چلے جاتے اور باغ میں بڑے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھتے۔ بعض مرتبہ مالی، بیرا، اور مہترانی بھی آکر بیٹھتے اور کھوکھا کو پھول اور پھل پیش کرتے۔

ٹھبکی ایک بانس کے بنے ہوئے اسٹول پر بیٹھتی۔ آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ اُس کے منھ پر چمکتا اور کھوکھا ایک چھوٹی سی پہیہ والی کرسی پر بیٹھتا۔ اور آفتاب اُس کی پیٹھ پر پڑتا تھا۔ "بڑی سردی ہے کھوکھا بابو اور میرے پاس کپڑے نہیں ہیں"

کھوکھا کا دل فوراً رحم کے مارے پگھل جاتا اور اُسکو تسلی دیتے ہوئے کہتا "میں کل تمہارے لئے دوکان سے کپڑے خرید دونگا۔ میں تمہارے لئے ایک نیا کوٹ لادونگا۔ پھر تم اپنے ہاتھوں کو جیب کے اندر رکھکر سڑک پر ٹہلنا۔ اور اپنے پرانے کپڑے پھینک دینا"

ٹھبکی پھر پوچھتی "اور کیا لادوگے کھوکھا بابو"

"میں تم کو دونگا۔ آلو چاپ — نارنگیاں۔ مٹھائی اور سب چیزیں"

چھوٹا سخی داتا جواب دیتا۔

مالی پانی چھڑکنے کا برتن لئے ہوئے آتا اور پوچھتا "مجھکو کیا دیگا مالک"

کھوکھا کے چہرہ پر متانت آجاتی اور کہتا "ماما تمہارے لئے چیزیں خریدینگی"

بیرا پوچھتا "میرے لئے کچھ نہیں کھوکھا بابو"

کھوکھا تنگ آجاتا اور چلاتا "جاؤ میں تمہیں نہیں چاہتا"

ٹھبکی فاتحانہ انداز سے دیکھتی اور بچے کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی۔

(۴)

شام کے وقت کھوکھا ہوا خوری کے لئے قریب کے میدانوں میں گیا تھا۔ مادھابی موسم خزان کے سہ پہر کی مختصر نیند سے بیدار ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ کھوکھا اُس کے کمرہ میں نہ تھا لیکن تمام

...ں کھلے ہوئے تھے۔ جب کھوکھا یہاں نہیں ہے تو کس نے ایسا کیا ہوگا؟ وہ باہر آئی اور اُس نے نوکروں سے
...یافت کیا لیکن اُسکو کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔

جاڑے کی مختصر شام جلدی سے ختم ہو گئی۔ راستے اور میدانوں کو نرم اور سرد چھوڑ کر
...درختوں کے سروں سے روشنی کا تاج چھین کر سورج ڈوب رہا تھا۔ مادہابی نے وہاں کے کھیتوں
...طرف نظر کی اور دیکھا کہ راستہ کا کنارہ خیموں سے بھرا ہوا ہے جس کو ایک خانہ بدوش جماعت
...نصب کیا تھا۔ عورتوں نے آگ جلا رکھی تھی اور مٹی کے برتن میں کھانا پکا رہی تھیں۔ مادہابی نے خیال
...کہ غالباً یہی لوگ آئے ہونگے کہ موقع ملتے تو کچھ چرالیں اور خوفزدہ ہو کر چیزوں کو الٹ پلٹ چھوڑ کر
...اگ نکلے۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اپنی کسی چیز کو پہچان سکتی ہے یا نہیں۔ کھڑکی کے باہر سر ابھر دیکھتی
...ی۔ ٹھبکی کا سر جو سرخ فیتوں سے سنوارا ہوا تھا سڑک پر نمودار ہوا۔ لیکن کھوکھا کی گاڑی پر کون
...بیٹھا ہوا ہے؟ ..... وہ قوس وقزح کے تمام رنگوں کی پوشاک پہنے ہوئے نظر آتا تھا۔ لیکن جب وہ نزدیک
...پہنچے تو مادہابی صاف دیکھ سکی کہ یہ کھوکھا کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ ایک سرخ مخمل کا پتلون اور ساٹن
...کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے اوپر وہ ایک چمکدار گلابی اونی چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اُس کے
...دلے چھوٹے پیر سبز موزوں اور سفید جوتے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک ٹوپی جس پر سنہرے کلابتوں کا
...کام بنا ہوا تھا اُس کے سر پر تھی۔ ٹھبکی نے تمام بکسوں کو چھان مارا تھا اور کھوکھا کو پہنانے کیلئے جو چیز اُس کی
...نظر میں بھڑکیلی معلوم ہوئی اُس نے اُس کو نکال لیا تھا۔ خوبصورت خوبصورت کپڑے جن کو مادہابی نے بڑی جانفشانی
...سے جمع کیا تھا سارے کے سارے غارت ہو گئے تھے۔ مادہابی غضبناک ہو گئی اور جیسے ہی قصوروار کھلائی
...اندر داخل ہوئی وہ اس پر برس پڑی "بدمعاش! تو نے یہ کیا کیا؟" وہ چلائی "پہنانے کے لئے اُس گرم
...کوٹ پر تیری نظر نہ پڑی"۔

ٹھبکی نے متانت سے جواب دیا "کھوکھا بابو میلے کپڑے نہیں پہننا چاہتے .... مجھکو
شرم آتی ہے"۔

مادہابی نے کہا "اوہو بڑا نواب بنا ہے .... اُسکو میلی چیزوں سے شرم معلوم ہوتی ہے
...... چلی جا بدذات .... میرے بچے کو مت چھو"۔

ٹھبکی نے بچے کو رکھدیا اور کنارے بیٹھ گئی "ٹھبکی! ٹھبکی!!" چلا کر کھوکھا نے سارے گھر کو
سر پر اُٹھا لیا۔ اس پر بھی ٹھبکی کو اُس کے قریب آنے کی ہمت نہ پڑی۔ شدت غم سے کھوکھا زمین
پر لوٹنے لگا۔

"کیا بند رہے"، مادہابی نے کہا "اب اس کے ڈر سے ٹھبکی کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے۔ اس کو لیجا۔ مگر میرے بکس کو چھونے کی پھر جرات نہ کرنا۔"

ٹھبکی نے حسب دستور اپنے متین چہرہ کے ساتھ کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی۔ جب وہ اتنی دور چلی گئی کہ جہاں سے مادہابی تک اسکی آواز نہیں پہونچ سکتی تھی تو اس نے آہستہ سے کان میں کہا "کھوکھا بابو تم بہت امیر ہو۔ جب تم بڑے ہو جاؤگے تو تمنوں سونا اور چاندی پہنوگے۔ تم بادشاہ ہو جاؤگے۔ بیرسٹر ہو جاؤگے۔"

"نہ ام۔ نہ ام" کھوکھا نے کہا "میں کھوکھا ہوں گا۔"

جیوں جیوں دن گذرتا گیا مالی روز بروز کھوکھا کی محبت کا زیادہ دلدادہ ہوتا گیا۔ وہ شاید ہی اس کے نزدیک سے غیر حاضر رہتا۔ صرف ایک نوکر کلکتہ سے ساتھ آیا تھا۔ لیکن وہ بہت سست تھا۔ کلکتہ میں مادہابی کو برآمدہ اور کمروں کو صاف کرنے کے لئے روزانہ ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہاں ایک وسیع باغ کی خبر گیری اس کے لئے ناممکن ہوگی کیونکہ دھمکی اور ترغیب دونوں بیکار ثابت ہو چکے تھے۔ اب اس کو شوہر کے ساتھ ایک جنگ کرنی پڑی کیونکہ وہ ایک مالی رکھنا چاہتی تھی اور حسب معمول آخرکار اسی کی بات رہی۔

شروع شروع میں مالی بہت کم کام کرتا تھا۔ وہ پودوں اور درختوں میں پانی دیتا اور ڈرائنگ روم کے گلدانوں کو بہت سے پھولوں سے سجاتا۔ کمرہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھتا اور پرانی دیوار اور پرانے فرنیچر میں ایسی شان رعنائی پیدا ہو جاتی کہ سارش بھی ایک ضرورت سے زیادہ نوکر رکھ لینے کی شکایت کو بھول جاتا۔ لیکن مادہابی اُن نوکروں کو پسند نہیں کرتی تھی جو ہمیشہ اپنے جائز فرائض سے پہلوتہی کرتے تھے۔ مالی گھر کا ایک کام بھی نہیں کرتا تھا اور صاف صاف زور سے کہدیتا تھا کہ وہ باغ کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہ کہ دوسرے نوکروں کا کام کرنے کے لئے۔

لیکن دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اُسکو بہت فرصت ہے۔ اُسکو پرانے نیم کے درخت کے نیچے کھوکھا کے پاس بیٹھے ہوئے یا کھوکھا کو کندھے پر چڑھا کر اِدھر اُدھر لئے پھرتے دیکھا جاتا تھا۔ ٹھبکی ایک شاہانہ انداز کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے رہتی اور اس کے ہاتھوں میں کھوکھا کی ٹوپی یا گرم چادر ہوتی۔ وہ آقا معلوم ہوتی اور اُدھر یا مالی اُس کا خادم معلوم ہوتا۔

مادہابی اس نظارہ کو دیکھ کر بھڑک اُٹھتی "دیکھو اس آدمی کو" وہ کہتی "میں نے اسکو رکھا تھا کہ باغ کے کاموں سے فراغت کرکے کھوکھا کو تھوڑی دیر کے لئے کھلایا کرے۔ لیکن وہ میری کبھی نہیں سنتا

پودوں میں پانی دینے اور پھولوں کے چھانٹنے میں معلوم ہوتا ہے جیسے دن بھر کی محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ اس سنتھالی لڑکی کے پیچھے پیچھے دن بھر پھرا کرتا ہے۔ میں عنقریب اُس کو ایکدن لات مار کر باہر کردونگی میں اس قسم کے رابطہ کو برداشت نہیں کرسکتی"۔

"تم بیکار کیوں غصہ ہوتی ہو؟" اُس کا شوہر کہتا "وہ بھی انسان ہیں اور اپنے اندر فطرتی محبت اور دوستی کا جذبہ رکھتے ہیں"۔

"لیکن یہ بالکل انہونی بات ہے"۔ اُسکی بیوی جواب دیتی" وہ لڑکی ایک سنتھال ہے اور مالی اُوڑیا ہے۔ ان کی دوستی کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"لیکن تم تو سوشل ریفارم کی سب بڑی مبلغ تھیں۔ سمارش نے کہا" اگر وہ غریب اور غیر متمدن ہیں تو یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہاری ہمدردی سے فائدہ نہ اُٹھائیں"۔

لیکن مادہابی کو یہ امر تسلیم کرنا پڑا کہ مالی نے کام میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آج کل کھوکھا کے نہلانے کا پانی لانیکے لئے کسی کو چلانا نہیں پڑتا تھا۔ جیسے ہی ٹھبکی کھوکھا کو نہلانے کے لئے تیار کرتی اودے مالی پانی لے کر فوراً حاضر ہو جاتا۔ اگر مادہابی ٹھبکی کو کچھ لانے کے لئے کہتی، اُودے ٹھبکی کے اُٹھنے سے پہلے ہی دوڑ پڑتا جب ٹھبکی کھوکھا کو نیچے اتار دیتی، اُودے فوراً اُٹھا لیتا۔ کھوکھا بہت ضدی اور ہٹی ہو گیا تھا اور بسا اوقات ٹھبکی بھی تنگ آجاتی۔ مگر اودے کو کبھی جبر نہ ہوتا وہ لڑکی کو مصیبت سے چھڑانے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ چھوٹے ظالم کو بہلانے کی ان تھک کوشش کرتا۔ ٹھبکی کو خوش کرنیکی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ایک ایک کرکے سب کو خوش کرنیکی کوشش کی۔

(۵)

ہاٹ کے دنوں میں بسا اوقات ٹھبکی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی غرض سے چند گھنٹوں کی اجازت لیتی۔ اس اثناء میں کھوکھا بے صبری کے ساتھ اس کا انتظار کرتا اور اپنی ماں سے ہزار بار پوچھتا "اماں ٹھبکی کہاں گئی؟"

ہر ہفتہ قریہ میں بازار لگا کرتا تھا۔ درمیان میں ایک برگد کا درخت تھا جس کے نیچے چھوٹی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ بیچنے والے زمین پر اپنی چٹائیاں بچھاتے تھے جن کے اوپر وہ اپنی چیزیں قرینے سے سجادیتے تھے۔ چاول، دال، مچھلی، سبزی اور مختلف قسم کی چیزیں وہاں مہیا ہوتی تھیں۔ رنگین ساڑیاں۔ چھپی ہوئی اور سادی، خوشنما موتیوں کی لڑ، کانچ کی چوڑیاں، بال میں لگانے کے کانٹے اور

کنگھیاں، غرضکہ دیہاتی حسن کی زیبائش کا سب سامان موجود تھا۔ اُودے باورچیخانہ کے لئے مچھلی اور ترکاری لیکر واپس آرہا تھا۔ بھبکی ایک کنگھی، ایک بوتل ریڈی کا تیل، اور ایک ٹین کی ٹلی لئے جارہی تھی۔ یکایک ایک عورت اُس کے سامنے نمودار ہوئی۔ وہ ایک سرخ ساری جس کے اوپر بڑے بڑے زرد پھولوں کے بوٹے تھے پہنے ہوئے تھی اور اپنے سر پر کانچ کی چوڑیوں کا ایک ٹوکرا لئے جارہی تھی "چوڑی لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

بھبکی نے رنگ برنگ کی چوڑیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور فوراً ہی اپنی آنکھیں پھیر لیں "تم چوڑی کیوں نہیں لیتی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"میرے پاس پیسہ نہیں ہے"۔ بھبکی نے کہا۔ اُودے نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کیساتھ کہا "چوڑی ضرور لو۔ میں قیمت دیدونگا"۔

بھبکی کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگی اور وہ آگے چلی گئی "کون مانگتا ہے؟" اُس نے غصہ سے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے دو پیسہ کی سنگار کی چیزیں لیکر شاہزادی ہوجاؤں گی؟" وہیں سامنے ایک دوکاندار چاندی کی زنجیریں، کڑے، اور بچھیاں بیچ رہا تھا۔ اودے دوکان میں داخل ہوا اور اُس نے زنجیر اُٹھالی "یہ لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

بھبکی اور زیادہ غضبناک ہوگئی "جا! بدمعاش کہیں کا"۔ اُس نے کہا "میں تجھ سے تحائف کیوں لینے لگی؟"

اودے نے اُس کے کانمیں کچھ آہستہ سے کہا۔ انداز سے معلوم ہوا کہ اس سے بھبکی کچھ نرم ہوگئی اور وہ ایک مربیانہ انداز سے مسکرائی۔ اودے نے زنجیر کی قیمت دیدی اور زنجیر اُس کے گلے میں ڈالدی۔

جیسے ہی وہ گھر پہونچے کھوکھا نے ایک طوفان برپا کر ڈالا۔ وہ بھبکی کی زنجیر مانگتا تھا۔ بھبکی اُس کو پہناتے ہوئے شرماتی تھی مگر چھوٹا ظالم اس کے بغیر مانتا نہ تھا۔ آخر کار مادام بی آگئی اور اُس نے پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" "میں نے اس کے قبل زندگی میں کبھی ایسا شور نہیں سنا تھا"۔

"کھوکھا بابو یہ زنجیر مانگتے ہیں"۔ بھبکی نے اپنی شرمائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"کھوکھا چھی! چھی!!" اُس نے کہا "تم ایسی چیزیں کیوں مانگتے ہو؟ تم بہت بیوقوف ہو۔ تم کو بھبکی کا زیور نہیں پہننا چاہیئے"۔

"مہربانی کرکے کھوکھا کے لئے ایک خرید دیجئے میم صاحب"۔ بھبکی نے بزدلانہ انداز سے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے" مادام بی نے کہا "ایسی چیز دیکے خریدنے کا فائدہ کیا ہے؟"

یکایک اُس نے کچھ محسوس کیا "تو یہ زنجیر کہاں سے لائی ہے؟" اُس نے لڑکی سے دریافت کیا "تجھکو صرف تین روپیہ ملتا ہے۔ تو اسباب زینت کیونکر خرید سکتی ہے؟"

ٹھبکی خاموش رہی "جواب کیوں نہیں دیتی ہے؟" مادہابی نے پوچھا۔

ٹھبکی نے تامل کیا اور پھر بولی "۔ کسی نے مجھکو دیا ہے۔"

مادہابی کو شک ہوا اور اُس نے جرح کرنا شروع کی۔ "وہ کسی نے کون ہے؟"

"اودے" ٹھبکی نے شرما کر جواب دیا۔

مادہابی غضبناک ہو گئی "تجھکو اودے کا تحفہ کو میرے سامنے اکڑ کر دکھلانیکی کیسے جرات ہوئی؟ وہ تیرا کون ہے؟"

ٹھبکی چپ چاپ کھڑی رہی "تو سیدھے جہنم میں جا رہی ہے۔" مادہابی نے اپنی گرج کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تجھکو اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے ڈر نہیں معلوم ہوتا ہے؟ وہ تیرے ساتھ کبھی شادی نہیں کرے گا؟"

"ہاں! میم صاحب" ٹھبکی آخرکار خوفزدہ ہو کر بولی "اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"کچھ نہیں کرے گا" مادہابی نے کہا "تجھکو ذات کھو جانے کے خوف سے میرے یہاں کا پکا ہوا کھانے میں ڈر معلوم ہوتا ہے..... تو اس اوڑیا کے ساتھ شادی کرنے پر کیسے راضی ہو سکتی ہے؟"

ٹھبکی کی آنکھیں آنسو سے ڈبڈبا گئیں "میرا کوئی دوست یار رشتہ دار نہیں ہے میم صاحب۔" اُس نے کہا "اس لئے ذات کا کیا فائدہ ہے؟ اگر وہ میرے ساتھ شادی کرے گا اور مجھکو اوڑیا بنائے گا تو میں کسی کو اپنا کہہ سکوں گی۔"

مادہابی کچھ اور زیادہ نہ کہہ سکی۔ ٹھبکی نے کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی۔ باغ میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک پھول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی زنجیر اُتار کر اُس نے کھوکھا کے گلے میں ڈالدی۔ کھوکھا نے اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈالدیں اور اُس سے چمٹ گیا۔ ٹھبکی نے کہا "تم بہت اچھے کھوکھا ہو۔"

(۶)

رات کو مادہابی اور سمارش میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ "تم نے اپنے مالی کی بہادری کے متعلق کچھ سنا؟" مادہابی نے کہا "اس نے ٹھبکی کے لئے ایک چاندی کی زنجیر خریدی ہے اور وہ سب کو دکھلاتی

پھرتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کیا خیال کر رہے ہیں؟"
"شاید سول قانون کے مطابق شادی" اُس کے شوہر نے جواب دیا۔
"بیوقوف مت بنو" مادہابی نے اُس کو آہستہ سے دھکا دیتے ہوئے کہا "تم کو چاہیئے کہ کل اُسکو ڈانٹ دو۔"

دوسرے دن اودے بلایا گیا۔ سمارش نے پوچھا کیا تم نے کہا ہے کہ تم ٹھبکی سے شادی کرو گے؟"
اودے اس اچانک سوال پر بھونچکا ہو گیا۔ آخر اس نے ہوش و حواس بجا کئے اور گھبرا کر بولا۔
"ایسا کیونکر ہو سکتا ہے حضور؟ اگر میں ایک سنتھال لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا تو میری ذات چلی جائے گی۔ پھر یہ کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے گھر پر بال بچے اور سب لوگ ہیں۔"
سمارش نے غصہ ہو کر پوچھا "تب تم نے اُسکو تحفہ کیوں دیا؟"
اودے نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ توقف کے بعد وہ انتہائی حماقت کے ساتھ بولا "حضور میں نے اُسکو کوئی تحفہ نہیں دیا ہے۔ کسی اور نے دیا ہوگا۔"
سمارش نے غصہ میں آکر ایک تھپڑ اُسکو مارا اور بولا کہ "میرے گھر سے ابھی چلا جا۔ میرے منہ پر جھوٹ بولنے کی جرات کرتا ہے؟ ابھی اسی وقت چلا جا۔"
اودے ایک لمحہ کے اندر غائب ہو گیا۔ یہ دغا دیکھ کر ٹھبکی زمین میں سما جانیکو تیار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ اُس کے پیچھے پیچھے جانے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکی۔ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اودے نے غصہ سے پھر کر اُسکی طرف دیکھا اور سخت سست الفاظ کہے۔
لیکن ٹھبکی کھوکھا کو گود میں لئے ہوئے اب تک اُسکا پیچھا کر رہی تھی۔ مادہابی اپنے کمرہ سے باہر نکل آئی اور ڈانٹ کر بولی۔ "دروازہ سے باہر جانیکی جرات نہ کرنا ورنہ میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دونگی۔"
ٹھبکی واپس چلی آئی۔ "تجھکو شرم نہیں آتی ہے۔" مادہابی نے پوچھا "اگر اس طرح تو اس کے پیچھے پیچھے دوڑے گی تو تجھکو کسی اچھے گھر میں جگہ نہیں ملے گی۔"
ٹھبکی کھڑی روتی رہی مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے کھوکھا کو ایک لمحہ کے لئے بھی گود سے اتارنے کے لئے انکار کر دیا۔ خود مادہابی بھی کھوکھا کو اُس سے نہ لے سکی۔
شام کو اُس نے کھوکھا کو کھانا کھلایا اور اُسکو سُلا دیا۔ تب اُس نے چپ چاپ اُس کے پھولے پھولے گالوں کا بوسہ لیا اور غم کے آنسو بہاتے ہوئے سرہانے بیٹھ گئی۔
جب مادہابی کمرہ میں داخل ہوئی تو وہ کھڑی ہو گئی اور اُس نے کہا "میم صاحب! مہربانی

ذرا کر مجھکو معاف کر دیجئے اور اُس کے علاوہ بھی اگر میں نے کبھی قصور کئے ہیں تو اُن کو بھی مہربانی کر کے معاف کر دیجئے۔"

(۷)

صبح کو مادہابی بہت دیر میں اُٹھی کیونکہ آج برتن مانجنے کی آواز اُس کو بیدار کرنے کے لئے پیدا نہ ہوئی تھی۔ جب صبح کی روشنی کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر آنے لگی۔ تو مادہابی بیدار ہوئی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ٹھبکی اتنی دیر تک دروازہ پر اس سردی میں کھڑی کھڑی ٹھٹھر کر رہ گئی ہوگی۔" اس نے دل میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور یہ معلوم کر کے متعجب ہوئی کہ ٹھبکی وہاں نہ تھی۔ شمال کی سرد ہوا اُجڑے ہوئے باغ میں زور شور کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے دوسرے نوکروں کو بلایا مگر ٹھبکی کی کوئی خبر اُن سے نہ ملی۔ وہ پھر اپنے کمرہ میں داخل ہوئی اور بولی "ٹھبکی وہاں نہیں ہے۔ شاید آتے ہوئے شرماتی ہے۔"

"کون جانتا ہے۔" اُس کے شوہر نے کہا "کہ وہ بدمعاش اُس کو بہکا کر لے بھاگا ہو۔"

مادہابی کھوکھا کو بستر پر سے لانے کے لئے گئی۔ جیسے ہی اُس نے اُسکو کھینچا اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک سونے کا کڑا غائب ہے۔ "کس نے اس کا کڑا لیا ہے؟" وہ چلائی۔ "اُسی کتیا نے چرا لیا ہوگا۔ اب میں سمجھی کہ وہ کیوں غائب ہے۔ اُس نے زیور لے لیا اور اُس بدمعاش کے ساتھ چلی گئی۔"

"یہ بالکل ممکن ہے۔" اُس کے شوہر نے کہا۔ "لیکن اُس نے صرف ایک کڑا کیوں چرایا اور دوسرا کیوں چھوڑ دیا؟ یہ تعجب انگیز امر ہے۔"

"اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔" اُس کی بیوی نے جواب دیا "وہ دونوں ہی کڑے لینے کو تھی کہ میں اندر آگئی۔ اور اُس کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مال غنیمت کے ساتھ چلتے وقت اُس نے مجھ سے معافی مانگی۔"

مادہابی نے کھوکھا کو زمین پر اُتار دیا اور فوراً ہی ایک جھنجھناہٹ کی آواز آئی اور وہ زنجیر جس کا اُنا چرا چاہتا تھا، ٹھبکی کے چند کم قیمت زیورات، اور تین چاندی کے سکّے نیچے آگرے۔ "یہ اور زیادہ تعجب کی بات ہے۔" سمارش نے کہا۔ "اپنی چیز چھوڑ دینا اور دوسروں کی چرا لینا۔ لیکن زنجیر نقلی چاندی کی بنی ہوئی ہے۔ بدمعاش نے اُسکو ہر طرح دھوکا دیا۔"

"یہ صرف اشک شوئی کے لئے ہے۔" اُسکی بیوی نے کہا "وہ ہلوگوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے یہ سب فضول چیزیں چھوڑ دیں۔ لیکن اس مرتبہ میں اس کو آسانی سے نہیں جانے

دونگی۔ تم کو ضرور تھانہ پر جانا چاہیئے۔"

سمارش نے چائے پی اور تھانہ کا قصد کرکے روانہ ہوا۔ سب سے پہلی چیز جو اُسکی آنکھوں کے سامنے آئی وہ ٹھبکی کا کالا سر تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دروازہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اس لئے پہلے پہل سمارش پر اُس کی نظر نہ پڑی۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی رو رہی ہے۔

اُس کو لڑکی کی اس بیکسی پر ترس آگیا۔ وہ کانسٹبل کے پاس گیا جو دروازہ کے قریب کھڑا تھا اور بولا "تم اس لڑکی کو کہاں سے لائے ہو؟ کیا کسی نے اُس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے؟ اسکو چھوڑ دو۔"

جب ٹھبکی کی نظر بولنے والے پر پڑی تو وہ دروازہ کے اور آڑ میں آگئی۔ "ہم لوگ اسکو یہاں نہیں لائے ہیں حضور" کانسٹبل نے کہا "وہ خود آئی ہے۔ اور کہتی ہے کہ ایک اودے نامی مالی نے اُسکے آقا کے لڑکے کا طلائی کڑا چوری کر لیا ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ سب انسپکٹر سے ملنا چاہتی ہے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے" سمارش نے کہا "لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مالی نے چُرایا ہے؟"

اس مرتبہ ٹھبکی بولی "ہاں حضور" اُس نے کہا "میں نے کڑا لیا تھا۔ لیکن میرا منشا چرانے کا نہ تھا۔ کھوکھا بابو ایک سونے کی زنجیر مانگتے تھے لیکن میم صاحب نے نہیں خرید دی۔ کھوکھا بابو اس کے لئے چیختے اور چلاتے تھے۔ تب اودے نے کہا کہ وہ ایک چیز کو دو چیز بنانے کا عمل جانتا ہے اور اگر میں اُسکو ایک کڑا دیدونگی تو وہ دو کڑے بنا دے گا۔ مجھے اُس پر پورا یقین نہ آیا تاہم میں نے اُسکو ایک کڑا آزمانے کی غرض سے دیدیا۔ لیکن کل جب وہ چلا گیا تو اُس نے ہر بات سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ کڑے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتی حضور کہ اتنی بڑی حماقت کے بعد کیونکر سر اونچا کروں۔ اگر پولیس اُسکو نہیں پکڑ سکتی تو میں اُس کی جگہ پر جیل جاؤں گی۔ میں ذات کھو سکتی ہوں، حضور مگر میں کوئی پاپ کرنا نہیں چاہتی۔"

اتنا کہکر وہ پھر رونے لگی۔ "حضور میں کھوکھا بابو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اُس نے کہا "مہربانی کرکے اس مرتبہ مجھکو معاف کر دیجیئے۔"

سمارش نے کھوکھا کو ٹھبکی کے لئے روتے ہوئے سُنا اور بولا "اچھا" "جا! جلدی جا! کیونکہ دیر ہو رہی ہے؟"

(سشریمتی شانتی دیوی)

شبلی ابراہیمی (ایم۔ اے)

اقبالنامۂ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہد مغلیہ کے ایک درباری اہل قلم کی چشمدید بیانات

زیر تبصرہ نسخہ اس وقت میرے سامنے اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ ہے، اور اسی پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یہ نسخہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں۔ ۲ ذلقعدہ ۱۲۲۱ھ میں اسکی کتابت ہوئی، یعنی آج سے ایک سوستائیس سال قبل یہ کتاب لکھی گئی، کاتب کا نام رام سکھ پنڈت ہے۔

میں ہندو اہل قلم کے ان خدمات کا معترف ہوں جو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی دوستی کے ثبوت میں فارسی ادب کے متعلق انجام دی ہیں، چنانچہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ (۱۲۲۹ھ) میں بھگوان داس نے تذکرۂ شعرا کے متعلق ایک کتاب "سفینۂ ہندی" لکھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو آزاد بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، اسی طرح بندرابن داس نے بھی "سفینۂ خوش گو" کے نام سے فارسی زبان کے اُن شعراء کا تذکرہ لکھا جو اکبر کے بعد ہندوستان میں تھے۔ یہ شخص سراج الدین علی خاں آرزو کا شاگرد تھا اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح محمد حسین آزاد مرحوم نے "آب حیات" میں ذوق کے ساتھ اپنی روحانی وابستگی اور عقیدت ونیایش کا حال لکھا ہے، اسی طرح اس ہندو ادیب نے بھی اپنے لائق استاد خان آرزو کے ساتھ اپنی شاعرانہ عقیدتمندیوں کا اظہار کیا ہے، چنانچہ خان آرزو کے حالات اگر تفصیل کے ساتھ کہیں ملیں گے تو اسی ہندو شاگرد بندرابن داس کے "سفینہ خوش گو" میں، مگر ساتھ ہی اس کے اس صف میں بعض وہ حضرات بھی نظر آئے ہیں جو صرف شوق میں علمی کام تو کرنا چاہتے تھے، لیکن علمی بے مائگی کے باعث وہ کوئی قابل قدر خدمت انجام نہیں دے سکے۔ چنانچہ اسی صف میں نسخۂ ہذا "اقبالنامۂ جہانگیری" کے کاتب رام سکھ پنڈت بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں یہ کتاب خط نستعلیق میں ہے، اور کاتب نے بڑے استقلال کے ساتھ نقل کی ہے، ظاہری نمائش بھی نظر فریب ہے، لیکن جب میں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا شروع کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اول سے آخر تک اس میں کتابت کی ایسی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کاتب فارسی زبان سے بالکل نابلد تھا، اس لئے تبصرہ کرنے سے قبل مجھے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتابت کی غلطیوں کو دور کرنا پڑا۔ جو سخت صبر آزما کام تھا، لیکن تصحیح کرتے وقت میرے پاس کوئی دوسرا نسخہ نہ تھا کہ مقابلہ کرتا اس لئے متن کی صحت میں مجھے اپنی ہی ذات پر اعتماد کرنا پڑا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے اقبالنامہ جہانگیری کا نسخہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے،

اصل کتاب

اقبالنامہ کا مصنف معتمد خاں عہد جہانگیری کا ایک درباری اہل قلم تھا، کتاب کے اندر جستہ جستہ اس نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں، قدیم مورخین اسلام کی طرح مصنف نے سال کے اعتبار سے اس کتاب کی ترتیب دی ہے، اس میں ابو المظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ خاندان مغلیہ کے چوتھے فرمانروا کے عہد سلطنت کے حالات سے بحث کی گئی ہے، ابتدا میں ایک مختصر سی تمہید ہے اس کے بعد اول سال جلوس سے لیکر بائیس سال تک کے حالات قلمبند کئے ہیں، یعنی سنہ ۱۰۱۴ھ سے سنہ ۱۰۳۷ھ کے درمیان سلطنت مغلیہ میں جو سیاسی و ملکی واقعات رونما ہوئے اُن کے چشمدید حالات اس کتاب میں ملتے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف نے اس عہد کی سیاسیات کے علاوہ بہتیری ایسی باتیں لکھی ہیں جو عام مذاق کے لئے بھی دلچسپ ہیں، مثلاً اس عہد کے علماء فضلاء، صوفیہ و درویش، عمارات و آثار آرٹ و صنعت طیور و حوش، سیر و شکار، نذر و پیشکش، عجائب و غرائب کے متعلق نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور میں ان تمام عنوانوں پر ایک تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہوں،

حالات مصنف

کتاب کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد مصنف کے ذاتی حالات کے متعلق بھی بہت سے واقعات مل جاتے ہیں، چنانچہ یہ شخص اپنی اعلےٰ قابلیت، وفاداری اور اطاعت شعاری کی بدولت "بخشی" کے معزز عہدہ پر پہونچ گیا تھا، جلوس کے چودھویں سال بادشاہ کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں اس نے ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ لکھا ہے، اثنائے سفر میں ایک منزل ایسی ملی جسکی راہ بالکل دریا کے کنارہ واقع تھی، اور اُس کے ہر دو جانب بڑے بڑے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، یہاں پر بادشاہ نے مصنف کو ٹھیرا دیا، اور کہا کہ میرے چلے جانے کے بعد تمام فوج عقب سے آئے، مصنف نے اپنا خیمۂ خرگاہ پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا، اس لئے اپنے آدمیوں کو پیام بھیجا کہ جب منزل پر پہونچ چکے ہو وہیں ٹھہر جاؤ ادھر بادشاہ چلے رستہ میں زور کا طوفان آیا، بجلی کی چمک، رعد کی گرج، برف و باراں کی صعوبت سے

بادشاہ کی طبیعت سخت پریشان ہوئی، خیمہ دخوگاہ پیچھے تھا، نور جہاں بیگم، خواص، اور خواجہ سرا ساتھ تھے، منصبداروں کو عقب سے آنے کا حکم مل چکا تھا، یکایک مصنف کے آدمی جہاں ٹھہرے تھے، وہ خیمہ نظر آیا، شاہی خاندان نے اسی میں پناہ لی، اس کے بعد بادشاہ نے مصنف کو بلا بھیجا اور تمام نذر و پیشکش جو حضور میں موجود تھا سب اُسے عطا کیا، چنانچہ مصنف لکھتا ہے:۔

"آنچہ در بساط بود از نقد و جنس .... بہ تفصیل بہ رسم پیش کش دپائے انداز معروض داشت ہمہ را بایں غلام بخشیدند، و فرمودند کہ متاع دنیا در چشم چہ نماید جواہر اخلاص را بہ بہائے گراں خریدارم الحق این اتفاق از اثر اخلاص و تائیدات طالع اوست کہ مثل من بادشاہے با اہل حرم خود یک شبانہ روز در خانہ او بہ راحت و آسودگی بسر بردہ او را در امثال و اقران و اہل جہاں چنیں روئے سرفرازی شود"

اس کے بعد لکھتا ہے:۔

"روز پنجشنبہ در موضع کیہانی نزدل موکب منصورہ اتفاق افتاد سرو پائے کہ پوشیدہ بودند بہ کمترین بندہا مرحمت فرمودند، و منصب ایں فدوی از اصل و اضافہ ہزار و پانصدی ذات و پانصد سوار حکم شد"۔

جلوس کے تیسرے سال مصنف کو "معتمد خاں" کا خطاب ملا، چنانچہ خود لکھتا ہے:۔

"در چہارم ربیع الاول راقم اقبالنامہ بہ خطاب "معتمد خانی" ممتاز گشت"۔

جلوس کے نویں سال جب خبر آئی کہ فدائی خان شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے بخشی نے انتقال کیا تو یہ خدمت مصنف کو ملی اسی طرح جلوس کے گیارھویں سال مصنف کو "بخشی گیری" کی خدمت، منصب ہزاری اور خلعت اور علم ملا۔

کشمیر اور اس کے نزہت افزا مناظر کے متعلق روشنی ڈالنے میں مصنف نے جس طرح اپنی لطافت بیان اور نزاکت حس و اثر پذیری کا اظہار کیا ہے قابل تعریف ہے، اسی سلسلہ میں ایک جگہ "کوہ ہارن" کا (جسے اہل ہند "ہری پربت" کہتے ہیں) تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"بر سمت مشرقی آں کوہ دل واقعست ...... حضرت عرش آشیانی (یعنی اکبر) انار اللہ برہانہ حکم فرمودہ اند کہ دریں مقام قلعہ از سنگ و آہک در غایت استحکام بنند و در عہد دولت جہانگیری قریب الاختتام شدہ چنانچہ کوہچہ مذکور درمیان حصار واقعست و دیوار قلعہ بر دور آں گشتہ و کوہ مذکور بہ حصار پیوستہ و عمارات دولت خانہ مشرف بر آب است و در دولت خانہ باغچہ

واقعست با مختصر عمارتے کہ حضرت عرش آشیانی اکثر اوقات درآنجا می نشستہ اند چوں ریں مرتبہ سخت بے طراوت وافسردہ بہ نظر اشرف درآمد بہ راقم اقبالنامہ حکم شد کہ در ترتیب ایں باغچہ وتعمیر منازل آں غایت جد و جہد بہ تقدیم رسانید درا ندک فرحت بخش اہتمام ایں فدوی رونق تازہ گرفت و در باغچہ چبوترۂ عالی سی در دہ مربع مشتمل بر سہ طبقہ آراستہ شد وعمارات از سر نو تعمیر فرمودہ نادرہ کار رشک نگارخانہ چین ساخت و ایں باغچہ را از سر نو "نور افزا" نام فرمودند"

خلاصہ یہ ہے کہ "ہری پربت" کے پورب طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی "کوہ دل" ہے، اکبر نے یہاں پتھر اور چونے کا ایک قلعہ بنانے کا حکم دیا تھا جو جہانگیر کے زمانہ میں ختم ہوا، چنانچہ یہ پہاڑی قلعہ کی دیواروں کے اندر داخل ہو گئی ہے، یہاں پانی پر ایک عمارت بنائی گئی ہے، جس میں چھوٹا سا ایک باغ ہے، اور اس میں چھوٹی سی ایک کوٹھی ہے، جہانگیر نے اس سفر میں دیکھا کہ یہ باغ بہت ویران اور بے رونق نظر آتا ہے، اس لئے مصنف کو حکم ملا کہ شروع سے اس باغ کی ترتیب دے، اور اسکی عمارتیں تعمیر کرائے، مصنف نے تھوڑے ہی دنوں میں اس طور سے باغ کو آراستہ کر دیا اور اسکی عمارتیں درست کرائیں کہ نگارخانہ چین کے لئے باعث رشک بن گیا، جہانگیر نے اسکا نام "نور افزا" رکھا۔

جہانگیر اور اسکی سیرت

گیارھویں جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ جمعرات کے دن جہانگیر آگرہ میں تخت پر بیٹھا، اور ۲۸ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ اتوار کے دن بوقت چاشت جلوس کے بائیسویں سال دنیا سے رحلت کی، بائیس سال کے اس عرصہ میں سیاسی نقطۂ نظر سے چند انقلابات ضرور ہوئے، مثلاً رانا امر سنگھ کی اطاعت، قلعہ کانگڑہ کی فتح، جو فیروز شاہ اور اکبر کو بھی باوجود سعی نصیب نہ ہو سکی، شاہجہاں کی بغاوت، نور جہاں بیگم کی سیاسی حکمت عملی، فارس کے خاندان صفویہ سے ازدواجی تعلقات، ان میں ہر مسئلہ سیاسی زاویۂ نظر سے بہت کچھ اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے، لیکن میں یہاں سیاسیات کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہوں، چونکہ عوام کے ذوق جمالیاتی کی نزاکت سیاسیات کے خشک مباحث کی گرانیاں برداشت نہیں کر سکتی۔

جہانگیر فطرت کی طرف سے جمالیات پرستی کا ایک ایسا ارفع ذوق لیکر آیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاہان مغلیہ کی زندگی میں نہیں ملتی، معتمد خاں نے نور جہاں سے شادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سطحی حیثیت رکھتا ہے، میں بھی اس وقت اس افسانہ کہنہ کا اعادہ بہتر نہیں سمجھتا، ہر چند تاریخی اعتبار سے اس افسانہ کے اندر جو ژولیدگی ہے، اسے سلجھانا بھی ارباب نظر کا فرض ہے، بہرحال میں اس وقت اپنے مصنف

اقبالنامہ کے بیانات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں اس لئے یہی مناسب ہے کہ صرف الفیں کے "خوان لیغما" پر لوگوں کو دعوت نشاط دوں۔

جہانگیر کو سیر و شکار سے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ سطور ذیل سے پتہ چلے گا، کہ وہ شیر کے شکار کا مہلک حد تک دلدادہ تھا، شکار ماہی، شکار فیل، شکار آہو و طیور ہمیشہ اسکی تفریح کا مشغلہ تھا سیر و سیاحت سے بھی اسے خاص لگاؤ تھا، چنانچہ ہر سال کشمیر جانا اس کا فرض تھا، صوفیہ اور فقرا سے اسی بڑی موانست تھی، خود انکی خانقاہوں اور ان کے معابد میں جاتا، پہروں ان سے باتیں کرتا، علما و فضلا، شعرا و اہل کمال ہمیشہ اس کی زینت دربار تھے، اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں، شکستہ آثار کی مرمت کرائی، اس کے پانچ بیٹے سلطان خسرو، سلطان پرویز، سلطان خورم، سلطان جہاندار، سلطان شہر یار اور دو بیٹیاں سلطان نساء بیگم، سلطان بہادر بانو بیگم ہوئیں، خسرو اور پرویز نے جہانگیر کی زندگی ہی میں وفات پائی خسرو کے دو لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی، سلطان پرویز کے بھی ایک لڑکا ہوا تھا لیکن اس نے باپ ہی کی زندگی میں انتقال کیا اسکی ایک لڑکی زندہ رہی جو شاہزادہ داراشکوہ کے عقد میں آئی، شاہزادہ خورم کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں دارا شکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب، مراد بخش پرہیز بانو بیگم، روشن آرا بیگم، جہاندار کے کوئی اولاد نہیں ہوئی شہریار کی نسل سے جسکی شادی نور جہاں کی لڑکی (جو شیر افگن خاں سے ہوئی تھی) سے ہوئی صرف ایک بچی زندہ رہی،

سیر و سیاحت معتمد خاں نے جہانگیر کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں وہاں کے سبزہ زار، چمنستان، اور تختہ گل و لالہ پر بھی دلفریب انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور ابتدا ئً مملکت کشمیر پر جغرافی اور عمرانی حیثیت سے بھی بحث کی ہے، ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کے دسویں مقالہ میں تاریخی واقعات کے ضمن میں ادبی داد سخن سنجی دی ہے، اور دل کھولکر، چنانچہ فیضی اور عرفی کے قصائد بھی درج کئے ہیں، عرفی نے کشمیر کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا جسکے دو بیت یہ ہیں۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید — گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید
بنگر کہ ز فیضش چہ بود گوہر کیتا — جائیکہ خزف در رود آنجا گہر آید

اسی طرح فیضی نے بھی کشمیر کی تعریف میں لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

ہزار قافلہ شوق می کند شب گیر — کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصۂ کہ دیدن او — ورق نگار خیال است نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چہ فکرت نقاش — زمین او متلون چہ صفحۂ تصویر

به پیش فیض نسیمش دم مسیح سموم | به نزد آب زلالش زلال خضر غدیر

فضول او متشابه زاعتدال هوا | بهم یکی دی واردی بهشت وبهمن وتیر

درو بجائے علف زعفران همی روید | که آب وخاک ورا اینچنیں بود تاثیر

بهرطرف روی از بحر فیض مالا مال | هزار چشمه جوشنده چوں دل تحریر

فیضی کے اشعار میں "صور شعریہ" کی خصوصیت پائی جاتی ہے، تاریخ فرشتہ کے اندر اس کی جغرافی حالت کے متعلق مفصلہ ذیل تبصرہ کیا گیا ہے:-

"مختصر آنچه در ظفرنامه مسطور است اینست که کشمیر از مشاهیر امکنه معموره عالی است وموضع غریب واقع شده آں ولایت در وسط اقلیم چهارم است .... وعرصه آں ولایت طولانی افتاده زمین کوه جنوبی به جانب دهلی وزمین کوه شمالی به طرف بدخشاں وخراساں وجانب غربیش به صوب مواضعے است که محل اقامت وسکونت اقوام افاغنه می باشد، وطرف شرقیش منتهی می شود به مبادی اراضی تبت وساحت طول آں عرصه وآنچه هموار واقع شده از حد شرقی تا جانب غربی قریب چهل فرسخ است وعرض آں از جانب جنوبی تا حد شمالی نسبت فرسخ ودر وسط آں دشت هموار که میان کوهسار واقع شده هزار قریه معموره است ومشحون به چشمه هائے خوشگوار وسبزه هائے لطافت آثار واز شواهد جودت آب وهوائے آں دیار است که حسن صورت ولطف شمائل خوباں آنجا در السنه سخنوراں فرس مشهور شده (جسکی ایک مثال "سیہ چشماں کشمیری" کی شہرت ہے) ودر کوه ودشتش انواع درختاں میوه دار است واثمارش به غایت خوب ورسانه گوار"

اس کے بعد اور بھی مفصل واقعات درج ہیں جنمیں بعض اہم یہ ہیں:-

"یہاں شہر کے درمیان ایک نہر جاری ہے، جس کا سوت دریائے دجلہ سے ملا ہوا ہے یہاں سے تین رستے نکلے ہیں ایک راہ خراسان کی طرف گئی ہے، اور یہ بہت دشوار ہے، اس طرف سے مال واسباب چارپایہ پر بھی نہیں لیجا سکتے ہیں، بلکہ آدمی مقرر ہیں جو باربرداری کا پیشہ کرتے ہیں، اور مسافروں کو اس منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ جہاں سے چارپایہ اور سواری پر اسباب وسامان رکھکر سفر کیا جا سکے، دوسری راہ ہندوستان کی طرف گئی ہے اور یہ بھی بہت سخت اور دشوار ہے، ایک رستہ تبت کی طرف گیا ہے، جو سابق الذکر دو راہوں سے آسان ہے۔"

یہ تو فرشتہ کی روایت ہے، اقبالنامہ میں بھی اسی قسم کے مجمل و مفصل واقعات درج ہیں، لیکن یہاں مجھے عہد مغلیہ کے ذوق جمالیاتی کو نمایاں کرنا ہے، اس لئے میں یہاں معتمد خان کے ان مباحث کو نظر انداز کردیتا ہوں، جہانگیر کا جب دل گھبرایا کشمیر پہونچا، اور وہاں کے گل و لالہ، نسرین و نسترن سے جی بہلاتا رہا، قدرتی چشمے، عظیم الشان پہاڑوں کے زمردیں دامن، لطیف ہوائیں، گل و لالہ کا تختہ زار، میوہ دار درختوں کی کثرت فطرت کی ایسی فیض بخشیاں نہ تھیں جو انسانی قلب میں ہلچل نہ پیدا کردیں خصوصیت کے ساتھ جہانگیر جیسے حساس انسان کے قلب میں جو فطرت کے ہر نقش جمیل پر مٹ جانے کے لئے آمادہ رہتا جہانگیر نے شاہزادگی ہی کے زمانہ میں کشمیر کے اندر بعض عمارات و حوض بنوائے اس سے قبل بھی مغلیہ تعمیر کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، معتمد خاں نے جہانگیر کے اس باغ، حوض اور عمارت کا نہایت دلچسپ تذکرہ کیا ہے جو دامن کوہ میں واقع ہے، اور وہاں کا قدرتی چشمہ سبزہ زار میدان (جس کا عکس حوض کے اندر پڑتا ہے تو بالکل نئی چیز اور نئی دنیا سامنے آجاتی ہے) مغلیہ فن تعمیر کی آن بان کے ساتھ مل کر صحرا میں ایک ایسا نقش دلفریب پیش کرتا ہے، جسے دیکھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہیں، اور عضلات کی بیتابیاں، حیات کے شرارے اگر منہ سے کوئی صدا نکالنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ صدائے "ہو" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحرائے کشمیر کے نہاخانوں میں بہت سے "دل والوں کی" ہڈیاں دفن ہیں[۵]

علماء و فضلاء

مصنف اقبالنامہ نے کتاب کے آخری صفحہ میں فضلا و شعرائے دربار کی ایک فہرست دی ہے، کتاب کے اندر بھی بعض حضرات کا ذکر ہے، لیکن بالکل مجمل طریقہ سے انہیں چند اکابر کے حالات میں نے تذکرہ و تاریخ کی ان قلمی کتابوں سے مدد لی ہے، جو پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں ہیں فضلائے دربار کی حسب ذیل فہرست ہے۔

ملا شکر اللہ، ملا ابوالقاسم گیلانی، ملا باقر کشمیری، ملا محمد مقصود علی، قاضی نوراللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ملا عبداللطیف سلطانپوری، ملا عبدالرحمن ..... گجراتی، ملا حسن فزاعی گجراتی، ملا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، ملا محمود گجراتی، حکیم رکنائے کاشی، حکیم مسیح الزماں کاشی، حکیم ابوالقاسم

---

[۵] حوض کے متعلق اقبالنامہ کے یہ الفاظ ہیں "حوض مثمن چہل وہ در وہ و رچہل و دو در وہ و عمقش چہار دہ ورعہ آبش در عکس سبزہ و دریا مین کہ بر کوہ رستہ، زنگاری رنگ می نماید" یہیں دامن پہاڑ میں وہ قدرتی چشمہ ہے جسکے ساتھ دریائے "جہیلم" کا علاقہ لگا ہے (جو شہر کشمیر میں جاری ہے، اور جسکے متعلق فرشتہ نے لکھا ہے کہ دریائے دجلہ سے اسکا سوت لگا ہوا ہے) گل جعفری کا تختہ، چنار کے گنجان درخت، دل نمانازگی پیدا کردیتے ہیں، کشمیر کی یہ مشہور سیرگاہ ہے، جہانگیر یہیں عیش و جشن منانا تھا، اور اُسکی یادگاریں ابھی تک ہیں۔

گیلانی ملقب بہ حکیم الملک، حکیم مومنائے شیرازی، حکیم روح اللہ بروی، حکیم حمید گجراتی، حکیم تقی گیلانی، بابا طالب اصفہانی، ملا حیالی گیلانی، ملا نصیر منشیا پوری، ملا محمد صوفی مازندرانی ملک الشعرا طالب آملی، سعید ائے میر معصوم کاشی۔

معتمد خاں نے پانچ نام اور دئے ہیں، لیکن کتاب کی خرابی کے باعث وہ پڑھے نہ جا سکے۔

بابا طالب صفہانی اور حکیم رکنائے کاشی کا مجمل تذکرہ کتاب کے اندر بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ مصنف بابا طالب اصفہانی کے متعلق لکھتا ہے،

> "بابا طالب اصفانی در عنفوان شباب بہ لباس تجرد و قلندری از اصفہان برآمدہ بہ سیر سیاحی گذارش کشمیر افتاد، و از نفاست جا و لطافت آب و ہوا، دل نہاد آں ملک شدہ توطن و تالف اختیار نمود، و لعبد از فتح کشمیر بہ خدمت عرش آشیانی پیوست و در سلک بندہ ہائے درگاہ منتظم گشت، و در اواخر عہد حضرت شہنشاہی کہ سال عمرش از چند[۵] (غالباً "صد" ہے) گزشتہ بود در گزشت۔

مصنف نے حکیم رکنائے کاشی کا تذکرہ صرف ایک جگہ جہانگیر کی علالت کے سلسلہ میں لکھا ہے، اور بھی صرف یہ کہ بادشاہ بیمار ہوئے، تو حکیم رکنائے کے علاج کرنے پر بھی افاقہ نہوا۔

"شاہجہاں نامہ" میں تفصیل کے ساتھ اور خلاصۃ الافکار ابو طالب صفہانی میں اجمالی طور پر حکیم رکنائے کاشی کا تذکرہ پایا جاتا ہے، علامہ براؤن نے تاریخ ادب فارسی بہ عہد جدید" میں حکیم رکنائے کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے، میرزا افضل سرخوش نے "کلمات الشعرا" میں طالب آملی کے ایک عجیب شعر کا تذکرہ کیا ہے، فرشتہ کے اندر محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے دکن کے سلسلہ میں میر محمد مومن استر آبادی کے حالات اور کلام کے متعلق کسی قدر تفصیل سے واقعات ملتے ہیں، اگر حکیم مومن شیرازی دوسرے تھے اور میر محمد مومن استر آبادی دوسرے تو ایک ہی زمانہ میں ہندوستان کے اندر گویا مومن تخلص کے دو اہل کمال تھے، ایک دربار مغلیہ میں دوسرا خاندان قطب شاہیہ میں شاہجہاں نامہ میں بھی حکیم مومنائے شیرازی کے حالات درج ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں اگر ان کتابوں سے مدد لیکر ان اکابر علم و ادب کے حالات پر کسی قدر مزید روشنی ڈالی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

---

[۵] "چند" صحیح نہیں یہ اصل لفظ "صد" کی تحریف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بابا طالب اکبر کے زمانہ میں فتح کشمیر کے بعد مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے اور عہد جہانگیری کے اخیر میں انتقال کیا تو اس عمر والے کو "چند" کیونکر لکھ سکتے ہیں، خاصکر اس حالت میں جبکہ فتح کشمیر کے قبل بہت دنوں پہلے وہ یہاں آگئے تھے۔

مزید روشنی ڈالی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

میرزا افضل سرخوش طالب آملی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"برائے ایں مصراع شش ماہ فکر کردہ پیش مصرعہ رساند" [51]

زغارت چمنت بر بہار منتہا است   کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر باشد

طالب آملی نے جس نزاکت تخیل سے کام لیکر کسی کے اعجاز گلگشت کا تذکرہ کیا ہے، وہ انھیں کا حصہ تھا معلوم ہوتا ہے شاعر کا تصور اسوقت سدرہ نشین تھا، یا وہ خود دنیائے روح وجمال میں مدہوش فصل بہار پر احسان رکھنا اور وہ بھی چمن کو غارت کر کے نیا انداز بیان ہے، شاعر موصوف نے اسکی توجیہ بھی کر دی ہے، کہ یہ احسان صرف خیالی بات نہیں بلکہ واقعہ ہے، چونکہ شاخ کے اندر پھولوں میں وہ شگفتگی نہیں رہتی، جو کسی کے کف دست رنگیں میں انھیں شادابی میسر آجاتی ہے، یعنی محبوب کے ہاتھوں میں پھول شاخ کی بہ نسبت زیادہ شگفتہ اور شاداب نظر آتے ہیں یہ ہے رفعت خیال اور نزاکت حسن، اقبالنامہ کی روایت کے مطابق طالب آملی کو جہانگیر نے جلوس کی تیرہویں سال "ملک الشعراء" کا خطاب دیا ہے، معتمد خاں نے بھی مرقومہ بالا شعر نقل کیا ہے

حکیم رکنائے کے والد کا نام حکیم نظام الدین احمد کاشی تھا، کاشان میں پیدا ہوئے، علم طب میں کمال رکھتے تھے، لعض معقول علاج کے صلہ میں دربار صفیہ میں گزرہوا، عزت و آبرو حاصل لیکن صاحب شاہجہاں نالہ لکھتے ہیں :۔

"لیکن از خوئے ناہموار وسلوک بے ہنجار خود، در آنجا نتوانست ماند وناگزیر بہ ہندستان آمدہ وبہ نگاہ گیتی پناہ حضرت عرش آشیانی (اکبر) رسیدہ، دولت ملازمت اندوخت وچوں روزگار بہ ایں دولت بے اندازہ نشو ونمائے تازہ یافت چندے در زمرہ آستاں معلے بودہ از ضعف پیری رخصت انصراف بہ وطن حاصل نمود، وازابرجود خدیو زماں خداوند جہاں گشت امید خویش سرسبز گردانیدہ روزانہ گشت و بہ عراق رفتہ پس از چندے بہ حرمین شریفین شتافت و بعد از احراز ایں سعادت بدانجا معاودت نمود" [52]

بادشاہ کی تعریف اور شاعرانہ طرازی کے صلہ میں حکیم صاحب کو وطن میں بھی شاہی وظیفہ ملتا رہا حکیم رکنا صرف طب ہی میں یگانۂ روزگار نہ تھے بلکہ حکیم شفائی کی طرح (جنکی شبیہ براؤن نے "تاریخ ادب فارسی بہ عہد جدید" میں شائع کی ہے) شعر وسخن میں بھی شہرۂ آفاق تھے، چنانچہ مصنف شاہجہاں نامہ لکھتا ہے :۔

"واز سخنوراں ایران است واشعارش مقبول ہمگناں۔

(باقی)   عبدالمالک آروی

---

[51] کلمات شعرا مصنفہ میرزا افضل سرخوش (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

[52] شاہجہاں نامہ (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

جنت کی حقیقت
یا افسانۂ فردا

دن بھر ریل میں دو رویہ پہاڑوں کی گرم ہوا سے جھلستے رہنے کے بعد دفعتہً شام کو، بنگلور کی سرور بخش و جانفزا ہوا میں پہونچ جانا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے سارے گناہ معاف کرکے یکایک دوزخ سے بہشت میں پہونچا دیا ہے، وہی سرد سرد ہوائیں، وہی کھلی ہوئی صاف فضا، وہی جذبۂ سرور و نشاط جسے جوانی کی دولت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنکھیں حور کو ڈھونڈھ رہی تھیں سو کبن ہوٹل میں وہ بھی میسر آگئی کس منھ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا۔ فرق یہ تھا کہ جنت میں حور غالباً طوبےٰ کے نیچے، یا کوثر و سلسبیل کے کنارے چادر میں لپٹی ہوئی ملتی ہوگی۔ اور یہاں کھانے کے کمرہ میں نظر آئی۔ اور وہ بھی ۲/۳ بالکل عریاں باقی ۱/۳ حصہ کو آپ مستور کہہ لیجئے، لیکن باریک ہلکے ریشم کا حجاب ہی کیا اور وہ بھی بجلی کی روشنی میں کہ اگر انسان ذرا جرات سے کام لے تو شعاعوں سے پہلے ہی نگاہ شوق کا تمام نشیب و فراز طے کرکے کہیں نہ کہیں اودی اودی رگوں کے جال میں اُلجھ جانا مشکل نہیں۔ ایک یورپین ہوٹل میں مشرقی شیروانی اور ترکی ٹوپی، روز میسر آنیوالی چیز نہیں کہ میں آماجگاہ نظر نہ بنتا۔ اس حور نے مجھے غور سے دیکھا اور مجھ غیر مستحق و مکروہ صورت جنتی نے اس کو۔ اس آدھ گھنٹے کے دوران میں کتنی مرتبہ نگاہوں کا تصادم ہوا اور ہر بار نگاہیں ملکر کس طرح پلٹیں، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ جب صبح کو طعام چاشت کے وقت پھر یکجائی ہوئی تو

التفات اُسکی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

رات کے کھانیکے بعد جب میں لیٹا تو لکھنؤ سے لیکر حیدرآباد تک کی بیسیوں اُلجھنیں سامنے آئیں، لیکن میں نے کوشش کرکے تمام افکار کو دور کیا اور خیال کی تمام خلوتوں کو اسی سیاہ چشم و سمنبر حور کے لئے وقف کرکے غافل ہوگیا۔ سو گیا۔ میں نے اس لئے نہیں کہا کہ اسکے بعد جو کچھ میں نے دیکھا وہ خواب کی نیم شعوری کیفیت سے زیادہ کسی اور کیفیت سے متعلق تھا۔ جسے ہوش و بیداری کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ غفلت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

—— میں بیخبر سو رہا تھا کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا اور کہا کہ "چلو تمہیں جنت میں لیجانیکا حکم ہوا ہے"

ہر چند یہ خبر اس قدر عجیب و غریب تھی کہ مجھے گھبرا کر بغیر کسی خیال خودداری کے دفعتہً اس کے ساتھ چلا جانا

چاہیئے تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اول تو بجائے خود نیند سے اٹھایا جانا ہی میرے لئے باعث تنغص تھا۔ دوسرے جگانیوالے کی بدتہذیبی پر بھی مجھے غصہ آرہا تھا کہ کیا اہل جنت کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ گنواروں کی طرح آکر انھیں جھنجوڑ ڈالا جائے۔ چاہیئے تھا کہ ایک حور آکر آہستہ آہستہ شانہ دابتی، دوسری حور نرمی سے تلوے سہلاتی اور اس پر بھی اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو کونے میں بیٹھ کر کوئی ساز چھیڑتی، اپنے لبوں سے میری پیشانی کو مس کرتی اور پھر جب میں انگڑائی لیکر اٹھنے والا ہوتا تو کم از کم کچھ سہارا ہی دیتی اگر آغوش میں آتے شرم آتی تھی ــــ میں نے جھنجلا کر پوچھا "آپ کون ہیں"؟ اس نے جواب دیا کہ :- "میں اعلےٰ علیین کا فرشتہ ہوں اور جنت میں تمہارے ساتھ رہنے کے لئے مامور ہوا ہوں" ــــ میں یہ سن کر ہنس پڑا کہ جب اعلےٰ علیین کے فرشتہ کی تہذیب کا یہ حال ہے تو معلوم نہیں کمتر درجہ کی جنتوں میں فرشتوں کی شائستگی کا کیا حال ہوگا اور غریب اہل جنت پر ان کے اکھڑپن سے کیا کیا نہ گزر جاتی ہوگی۔ اس کے بعد پھر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا کہ :- "جنت میں کس ملک کی تہذیب رائج ہے کہ میں تو مخاطبہ لفظ آپ سے کرتا ہوں اور اس کا جواب تم سے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایک خادم ہونیکی حیثیت سے تمہارا فرض ہے کہ　　حضور دسرکار کے الفاظ سے خطاب کرو۔ علاوہ اس کے تم کو مطلق خیال نہ آیا کہ اس طرح گنوارپن سے شانہ ہلا ہلا کر بیدار کرنا کس قدر تکلیف دہ۔ اور ایک شائستہ انسان کے لئے کس درجہ ناقابل برداشت ہے۔ اور ہاں یہ کیا کہا کہ تم میرے ساتھ رہنے کے لئے مامور ہوئے ہو۔ تو یہ فرمایئے کہ آپ کا عذاب جنت میں بھی میرے سر پر مسلط رہیگا۔ مہربانی فرماکر آپ تشریف لیجایئے، اور اپنے داروغہ (رضوان) سے کہیئے کہ ازراہ عنایت کوئی انسان فرشتہ مامور کریں، اگر مجھے جنت میں بلانا مقصود ہے، ورنہ میں آپ کی اعلےٰ علیین سے باز آیا۔ اور یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ تم غلطی سے میرے پاس آگئے ہو۔ کیونکہ الحمد للہ آج تک میں کسی ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوا کہ مجھے فردوس میں کوئی جگہ دیجائے۔ اور اگر سہواً کوئی بات ایسی ہو گئی ہے تو اس کا صلہ، صلہ کی طرح ملنا چاہیئے۔ نہ کہ تم ایسے مستقل عذاب کی صورت میں"۔ یہ کہکر میں کروٹ لینا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دوبارہ زیادہ قوت کے ساتھ میرے شانہ کو پکڑ کر جنبش دی اور میں فرط تکلیف سے پھر اٹھ بیٹھا

اس کا عجیب عالم تھا، نتھنے پھولے ہوئے تھے، آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اور شانوں کے دونوں پر کبھی سمٹتے تھے اور کبھی پھیل جاتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اسی خونخوارانہ طریقہ سے وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا کہ :- "مجھے کتنا افسوس ہے اُن فرشتوں پر جنھوں نے آدم کو سجدہ کرکے حقیر انسان کی اطاعت قبول کرلی۔ کاشکے میں نافرمان ابلیس ہوتا، اس کی ذریات میں سے ہوتا کہ آج تجھ ایسے دوزخ میں جھونکدئے جانے کی قابل ہستی کے پاس آکر اپنی توہین ہوتے ہوئے نہ دیکھتا تم کو چلنا

پڑے گا۔ خوشی سے نہ جاؤ گے تو میں زبردستی گھسیٹ کر لیجاؤں گا" مجھے اس فقرہ پر ہنسی آگئی کہ واہ رے اللہ میاں مجھے جنت بھی دی تو اس تھکا فضیحتی کے ساتھ، اب میری کیفیت بالکل بدل گئی تھی اور بجائے غصہ کے اب مجھ میں کھلنڈرا پن پیدا ہو چلا تھا۔ میں ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور بے تکلفی سے اس کے سینہ پر ہاتھ مار کر بولا کہ :۔ "واقعی تم خفا ہو گئے، جنت سے بھلا کوئی انکار کر سکتا ہے، میں تو دیکھ رہا تھا کہ کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے" یہ کہکر میں نے اس کے پروں کو چھوا اور بولا کہ :۔ "یار تمہارے پر تو بڑے اچھے ہیں، لیکن شتر مرغ کی طرح چھوٹے بہت ہیں، اُن سے تم اُڑتے کیسے ہو گے" یہ فرشتہ چاہے کتنا ہی غیر مہذب رہا ہو، لیکن تھا نیک، میری باتوں میں آگیا اور کہنے لگا کہ :۔ "ان پروں کو میں بہت پھیلا سکتا ہوں" یہ کہکر جو اس نے ایک گہری سانس اندر کی طرف لی تو دونوں پر پھیل کر تمام کمرے پر چھا گئے وہ بولا کہ :۔ "اگر کہو تو ان دیواروں کو توڑ کر یہاں تک پھیلا دوں کہ ایک طرف مشرق کو چھو لوں اور دوسری طرف مغرب کو" میں نے کہا :۔ "جی نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کیوں مشرق و مغرب کو تکلیف دیں، اپنے پر سمیٹ لیجئے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کھاتے کیا ہیں؟" یہ سُن کر وہ اس قدر زور سے ہنسا کہ اُسکے سارے دانت نمودار ہو گئے اور بولا کہ :۔ "ہم کو کھانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا کہ :۔ "پھر یہ آپ کے منھ میں جو پوری بتیسی جڑی ہوئی ہے اس سے کیا فائدہ؟" وہ بولا :۔ "بتیسی کہاں ہے" یہ کہکر جو اُسنے منھ کھولا تو واقعی کسی دانت کا پتہ نہ تھا اور اس کا منھ ایک تاریک غار کی طرح کھلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کو اپنے جسم کی تمام چیزوں پر اختیار حاصل تھا، جب جی چاہے غائب کر دے اور جب جی میں آئے انھیں پھر لے آئے۔ میں دیر تک اُس کی ناک، کان، آنکھ کا اسی طرح جائزہ لیتا رہا اور وہ طرح طرح سے اپنے کمالات دکھاتا رہا۔ جب وہ یہ تمام تماشہ دکھا چکا تو میں نے کہا کہ :۔ "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں اور وہ یہ کہ بھئی تم لاکھ فرشتے سہی، لیکن انسان پھر بھی انسان ہے اور بعض باتیں جو وہ کر سکتا ہے تم سے شاید ممکن نہ ہوں" وہ یہ سُن کر ہنسا اور بولا کہ :۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ انسان بیچارہ میں کیا قدرت ہے، وہ تو بالکل مجبور پیدا ہوا ہے" میں نے کہا :۔ "اگر یہ سچ ہے تو میں تمہارا امتحان لوں؟" اسنے جواب دیا :۔ "ضرور" میں نے کہا کہ "اچھا اگر یہ صحیح ہے تو ایک ٹانگ اُٹھا کر تھوڑی دور لنگڑی تو چلو" افسوس ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور پہلے ہی قدم پر مُنھ کے بل آرہا۔ میں نے کہا کہ :۔ "اسے جانے دو اچھا اب سامنے کھڑے ہو کر لکھنؤ والوں کی طرح سلام کرو" لیکن غریب اس میں بھی کامیاب نہ ہوا اور بہت کوشش کرنے پر بھی وہ حیدرآبادی سلام سے زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ میں نے کہا :۔ "خیر ان فضول کو چھوڑو، صبح کا وقت ہے، بھیرویں کی کوئی چیز سناؤ" اُس نے کہا :۔ "بھیرویں کیا ہے میں نہیں جانتا"

میں نے کہا کہ "سیٹی تو ضرور بجا لیتے ہو گے کچھ اسی میں الاپو" لیکن وہ بیچارہ یہ بھی نہ کر سکا۔ ان لغویات میں جب زیادہ دیر ہو گئی اور اس نے پھر تقاضہ کیا تو میں اُس لنگڑی نہ چل سکنے والے، اہل لکھنؤ کی طرح سلام نہ کر سکنے والے، بھیروین اور سیٹی سے ناواقف فرشتہ کے پروں پر سوار ہو کر چشم زدن میں بہت بلند ہو گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر کہیں خدا نخواستہ اس نے اپنے پروں کو ذرا بھی سمیٹا تو زمین پر پہونچنے سے پہلے ہی دم نکل جائے گا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ اُسے باتوں میں لگائے رہوں اور آخر کار بہت سوچ سمجھ کر میں نے کہا کہ:- "میاں فرشتے، تم غزل بھی کہہ سکتے ہو؟" میں نے یہ اس خیال سے کہا تھا کہ وہ فکر سخن میں محو ہو کر یکساں طور پر اڑتا چلا جائے گا، لیکن یہ سنتے ہی معلوم نہیں غصہ سے یا کیا، اُس نے اپنے پر دفعتاً اس طرح سمیٹ لئے کہ اگر گھبرا کر میں اُس کے گلے میں باہیں نہ ڈال دیتا تو بس چل ہی دیا تھا۔ مجھ پر اس واقعہ سے بدحواسی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور میں اس وقت ہوش میں آیا جب اُس نے فردوس بریں کے ایک باغ میں لیجا کر مجھے اتارا۔ شکر ہے کہ میرا امین فرشتہ اس وقت موجود نہ تھا اور میں آزادی کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔

فردوس۔ جنات عدن۔ بہشت وغیرہ کے باغوں کے متعلق مولویوں کی زبانی میں سنتا آیا تھا کہ وہاں میوے ہی میوے ہیں اور میوے بھی صرف انگور، انار، اور سیب۔ یعنی اگست ستمبر میں جو حالت کشمیر کی ہوتی ہے وہی فردوس کے باغوں کی بتائی گئی تھی، مئی جون میں شگوفہ و بہار کا جو موسم کشمیر میں ہوتا ہے اس کا تعلق آسمانی فردوس سے کوئی نہیں۔ گویا کہ انسان صرف پیٹ کا کتا ہے جو صرف غذا کی لالچ سے اچھے کام کر سکتا ہے اور معدے کو پُر کرتے رہنے کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی، یہاں تک کہ اگر کسی باغ میں بھی وہ جائے گا تو اُسے نہ پھولوں سے کوئی واسطہ ہو گا، نہ سبزہ سے، نہ گلبن پر جھومنے والی کلیاں اس کے لئے باعث توجہ ہو سکتی ہیں، نہ وہاں کی عطر آمیز ہوا۔ وہ صرف یہ دیکھے گا کہ کھانے کی کیا کیا چیزیں یہاں موجود ہیں اور کس حد تک وہ لذت کام و دہن کی تسکین میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ احسن التفاسیر میں میں نے ایک روایت دیکھی تھی کہ جنت میں ایک ایک خوشہ انگور کا اتنا بڑا ہو گا کہ اگر کوا ستر ہزار سال تک اڑتا چلا جائے تو بھی اس کو عبور نہ کر سکے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر ساری فردوس میں صرف ۱۰۰ درخت انگور کے فرض کئے جائیں اور ہر درخت میں کم از کم پانچ خوشے تو ساری کائنات اُنھیں سے معمور ہو جائے گی۔ دوسرے پھلوں کی گنجائش کہاں سے نکلیگی جب کہ انگور کی نسبت سے سیب اور انار وغیرہ کو اور زیادہ بڑا ہونا چاہئے اُسی کے ساتھ میں یہ بھی غور کرتا تھا کہ ان خوشوں کا انگور حجم و وزن میں کتنا بڑا ہو گا اور پھر یہ کہ آخر اہل جنت اسکو کھائیں گے کس منھ سے اور رکھیں گے کس پیٹ میں۔ اس لئے یہاں پہونچنے کے بعد سب سے پہلے مجھے خوشۂ انگور دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جنتی جس میوہ کی خواہش کرے وہ فوراً سامنے آجاتا ہے، اسلئے

اس خواہش کے پیدا ہوتے ہی سامنے انگور کا ایک خوشہ نظر آیا، جو احسن التفاسیر کے بیان کے مطابق اتنا بڑا تو نہ تھا کہ کوا ستر ہزار برس تک اس کی انتہا کو نہ پا سکے، لیکن ہاں اس کا ایک ایک دانہ ہمالیہ کی بڑی چٹان ضرور معلوم ہوتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک اور جنتی دوسری طرف سے آتے ہوئے نظر آئے نہایت منقطع بزرگ تھے اور غالباً احسن التفاسیر کے مولف ہی ہوں گے۔ انھوں نے پہلے اس خوشہ کو دیکھا اور پھر میری طرف، مدعا یہ کہ اگر اجازت ہو تو آپ کے حصہ کا یہ خوشہ میں کھا لوں۔ میں نے بڑھ کر ان کی تواضع کی، اور انھوں نے وہیں سے کھڑے کھڑے جو منھ کھولنا شروع کیا تو وہ اتنا پھیل گیا کہ دو دو دانے بیک وقت اس میں سمانے لگے۔ ان کا پیٹ برابر بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بغیر کسی فکر و تردد کے دانہ پر دانہ نگلتے جا رہے تھے یہاں تک کہ جب اس غبارہ میں ہوا بھرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو وہ دفعتاً پھٹا اور تمام دانے ایک ایک کرکے پھر خوشہ میں جا کر لگ گئے، لیکن وہ اب پھولے ہوئے شاداب نہ تھے، بلکہ انکی حالت ایسی تھی جیسے خون پینے کے بعد جونک کو نچوڑ دیا جائے۔ اس واقعہ سے مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ ان کے کھانے اور ہضم کرنیکا کیا دستور ہے۔ اس کے بعد میں نے سیب و انار کی خواہش نہیں کی، کیونکہ وہ مجھے زیادہ مرغوب نہیں، البتہ لکھنؤ کا خربزہ، ملیح آباد کے دسہری آم، کشمیر کا آلوچہ، کابل کا سردہ، اور بمبئی کے انجیر کو ضرور جی چاہا، لیکن یہ کوئی چیز میسر نہ آئی، شاید یہاں کی زمین ان پھلوں کی پیداوار کے لئے مناسب نہیں۔ افسوس ہے کہ پھلوں کی طرف سے فردوس میں مجھے سخت مایوسی سے سامنا ہوا، اور میرے ذوق کا ایک پھل بھی یہاں نہ مل سکا۔

اس کے بعد گھومتا پھرتا میں حوض کوثر کے پاس پہونچا۔ اس میں شک نہیں کہ حوض بہت بڑا ہے، لیکن چونکہ شہد و دودھ کو ملا کر لبریز کیا گیا ہے اسلئے چاروں طرف چپچپاہٹ بہت ہے۔ جنتی لوگ حریصانہ جا کر اس میں غوطہ لگاتے ہیں اور پھر ٹپکاتے ہوئے واپس آتے ہیں، جن سے حوض کے اطراف آلودہ ہوگئے ہیں اور خاص قسم کا لیس اور لبلباہٹ پیدا ہوگئی ہے، چونکہ شہد اور دودھ دونوں بالطبع مجھے مرغوب نہیں، اس لئے میں نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ آگے بڑھ کر مجھے سلسبیل و تسنیم نظر پڑیں یہ دونوں فردوس کی ندیاں ہیں، لیکن بجائے صاف اور سرد پانی کے ان میں بھی وہی شہد اور دودھ بہ رہا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا سوت حوض کوثر ہی کے سوت سے ملا ہوا ہے۔

آگے بڑھ کر طوبیٰ کا درخت نظر آیا جس پر سینکڑوں چڑیاں سبز رنگ کی بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھیں۔ یہ منظر اچھا تھا، لیکن بغیر بندوق کے کیا خاک لطف آتا، خاموش تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا اور پھر میں نے ایک ڈھیلا زور سے پھینکا کہ شاید کوئی چڑیا اسی طرح گر جائے اور میں اسے نمک مرچ کے ساتھ

بھول کر دودھ اور شہد کی منغض کرنیوالی کیفیت کو دور کرسکوں، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا، وہ برابر اسی طرح بیٹھی رہیں اور میں مایوس ہوکر آگے چلدیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اہل فردوس کے محلات و قصور شروع ہوئے میں بیتاب ہوگیا۔ کیونکہ اگر مینے کبھی کوئی نماز پڑھی تھی تو صرف اس لالچ سے کہ یہاں حوریں ملینگی جو دوشیزہ ہیں سیاہ چشم ہیں، حسین و جمیل ہیں، قاصرات الطرف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے مینے جلدی جلدی قدم اٹھائے اور فرط بیتابی میں صدر دروازہ تک پہونچتے پہونچتے دوڑنے لگا۔ سامنے رضواں کھڑے ہوئے تھے اور دو رویہ فرشتوں کی صفیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی رضواں نے سلام کیا اور ایک تختی مجھے دی جسپر قصر نمبر ۲۴۶۷۵ درج تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نمبر کے قصر پر مجھے وہ سب کچھ ملے گا جو فردوس کی انتہائی لذت و سرشاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں اپنے قصر کا یہ نمبر دیکھکر ذرا متامل ہوا اور سوچنے لگا کہ جب مجھ سے پہلے ۲۴ ہزار سے زیادہ حوریں چھٹ چکی ہیں تو مجھے کیا خاک ملیگا، لیکن پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے سب حوریں ایک ہی طرح کی دوشیزگی و جوانی رکھتی ہوں، تختی لیکر دروازہ میں داخل ہوا، لیکن حالت یہ تھی کہ رلیشہ رلیشہ شوق کے فراوانی سے کانپ رہا تھا اور دل اس طرح بیتاب تھا گویا منھ کو آیا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سب سے پہلے پیغمبروں کے نشاط خانے ملیں گے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہاں ایک بھی کسی پیغمبر کا قصر نہ تھا اور سب سے پہلا قصر حدیث کے اس راوی کا تھا جس نے سب سے پہلے حور کو ایک حسین عورت کے مفہوم میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ میں نے پوچھا بھی کہ کیا پیغمبروں کی جنت کوئی اور ہے، لیکن اسکا جواب مجھے کسی نے نہیں دیا۔ آگے بڑھا تو اور راویوں کے محلات ملے۔ اس کے بعد جو مولاناؤں اور مولویوں کے قصر ملنے شروع ہوئے تو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ یہانتک کہ میں چلتے چلتے تھک گیا اور گھبرا کر ایک قصر کے اندر السلام علیکم کہکے داخل ہی ہو گیا۔ مولانا تخت پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے آبخورہ پر آبخورہ دودھ اور شہد کا خالی کرتے جاتے تھے۔ جب ایک آبخورہ خالی ہوتا تھا تو غلمان دوڑکر دوسرا بھرا ہوا آبخورہ رکھدیتے تھے اور مولانا دونوں ہاتھوں سے اس طرح جلدی جلدی اپنے منھ میں اُنڈیل رہے تھے کہ دوڑتے دوڑتے غریب غلمانوں کی بری حالت ہوگئی تھی۔ میں نے بڑھ کر عرض کیا کہ:۔ "مولانا سلام کا جواب تو دیجئے، یہ کیا بدمستی ہے، ذرا اپنے تخت کو تو دیکھئے کیسا چپ چپ کر رہا ہے، ذرا اس کو پانی سے دھلوا دیجئے، میں بیٹھکر کچھ دیر آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔ انھوں نے یہ سُن کر مجھے گھورا اور پھر پاس کی قابوں سے جن میں سیب کے بہت سے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے ایک مٹھی بھر کر منھ میں ڈالی اور پھر ایک لمبی اور گہری ڈکار لیتے ہوئے جیسے ہاتھی سونڈ سے منھ میں پانی انڈیل رہا ہو بولے کہ:۔ "تم کون ہو اور یہاں کیسے آگئے"۔ مینے عرض کیا کہ بندہ پرور میں بھی اسی جنت کا گنہگار ہوں، جہاں آپ رونق افروز ہیں، لیکن خدا کے لئے یہ تو بتایئے

کہ اگر کسی کو دودھ، شہد، انگور، سیب انار سے رغبت نہ ہو اور بدقسمتی سے اسے جوع البقر کا عارضہ بھی نہ ہو تو وہ یہاں آکر کیا کرے، اب رہگئیں دو چیزیں، غلمان و حور، سو غلمان آپ کو مبارک ہیں، البتہ حور دیکھنے کی ضرور تمنا ہے، میرا قصر ابھی سینکڑوں فرسنگ دور ہے، اسلئے اگر حرج نہ ہو تو مہربانی فرماکر ذرا اپنی حور مجھے دکھادیجئے تاکہ میں فیصلہ کرسکوں کہ اس کے لئے مجھے اتنا طویل سفر اختیار کرنا چاہیئے یا یہیں سے واپس جانا چاہیئے، کیونکہ اسوقت تک جنت میں جو کچھ مجھے نظر آیا ہے وہ بہت ہمت شکن ہے، مولانا کا دماغ اس وقت یا تو کثرت غذا کے بعد ابخرات رویہ پیدا ہونیکی وجہ سے بالکل بجھیں تھا۔ یا یہ کہ جنت میں جذبۂ رشک و رقابت پیدا ہی نہیں ہوتا، بہرحال جو سبب بھی رہا ہو، انھوں نے میری اس خواہش پر صرف یہ کہا کہ :۔ "کیا تم نے حوروں کی صفت میں "مقصورات فی الخیام" نہیں سُنا" میں نے عرض کیا کہ :۔ "یہ درست ہے لیکن آپ انھیں "مستورات فی الخیام" تو نہیں رکھ سکتے :۔" مولانا تھے شاید ادیب، یہ جواب سُن کر مسکرا پڑے اور بولے کہ :۔ "بھائی یہ سچ ہے لیکن آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں کہ ایک کی حور دوسرے کے سامنے آئے اسلئے ڈرتا ہوں کہ خدا جانے کیا آفت آئے۔" میں نے کہا کہ :۔ "آپ کا یہ اندیشہ بالکل بے محل ہے، کیونکہ یہ تو آپکو معلوم ہی ہے کہ جنت کی زندگی دوامی ہے اور اب آپ کو کوئی نکال ہی نہیں سکتا، اس لئے خوب جی کے حوصلے نکالئے اور جسقدر بے عنوانیاں ممکن ہوں عمل میں لائیے۔ اگر یہاں بھی سزا کا دھڑکا لگا ہوا ہے، تو لعنت ہے ایسی جنت پر، اس سے تو دنیا اچھی تھی کہ کم کھاتے تھے اور گناہ زیادہ کرتے تھے، یہاں انسان کھاتا زیادہ ہو اور گناہ کوئی نہیں کرسکتا، آپ نے دنیاوی زندگی میں شراب نہیں پی اس کا صلہ آپ کو یہ مل رہا ہے کہ دودھ شہد پیتے رہیئے، کیا اس احتیاط و صبر کا یہی انجام ہونا چاہیئے تھا، ہم تو جب جانتے کہ اگر وہاں یک آتشہ سے توبہ کی تھی تو یہاں دو آتشہ ملتی، دو آتشہ کو وہاں ہاتھ نہ لگایا تھا تو یہاں سہ آتشہ میسر آتی، ایام برشگال میں شب ماہ میں، کنار آب، فرش سبزہ پر، حوروں کے ہاتھ سے خم کے خم لنڈھاتے تو بے شک ایک بات تھی، نہ یہ کہ دودھ پیئے جاؤ، شہد چاٹے جاؤ اور پھر طرہ یہ کہ اس کا نام شراب طہور رکھا ہے۔ آپ نے اگر دنیا میں غیر عورت پر نگاہ ڈالنے سے احتراز کیا تھا تو اس کا عوض یہ نہ ہونا چاہیئے تھا کہ بیوی ہی کی طرح ایک معصوم حور مل جائے، بلکہ اس کے ساتھ وہی جذبات متعلق ہونے چاہیئے تھے جو دنیا میں ایک نہ مل سکنے والی عورت کو دیکھکر پیدا ہوتے تھے۔ اور ہاں یہ تو بتایئے کہ آپ کی بیوی کہاں ہیں۔ کیا وہ ابھی مری نہیں ہیں۔"

—— "نہیں وہ تو مجھ سے پہلے ہی مرگئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اطاعت نہ کرتی تھی اسلئے دوزخ میں ڈالدی گئی۔"

—— "اگر وہ اطاعت کرنیوالی ہوتیں تو کیا صلہ ملتا۔"

—— "یہی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس رہتی۔"

—— "معقول یعنی جنت میں بھی اس غریب پر آپ کی معیت و اطاعت کا عذاب مسلط رہتا۔ اور ہاں مولانا یہ تو فرمائیے کہ جو عورتیں اپنے شوہروں سے پہلے مرجاتی ہیں وہ جنت میں کیا کیا کرتی ہیں"

—— "اپنے شوہروں کا انتظار"

—— "اور اگر وہ شوہر ملحد و مرتد ہوگئے یا کسی اور سبب سے جنت نہ آسکے تو انکی جنتی بیویوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟"

—— "پھر تو اسی جنت میں سے کوئی بر تلاش کر دیا جاتا ہے، کیونکہ یہاں بہت سے مرد کنوارے بھی آتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی جن کی بیویاں دوزخ چلی جاتی ہیں، بس اُنھیں کے ساتھ ایسی جنتی عورتوں کا نکاح ہوجاتا ہے جو کنواری مری ہیں یا جن کا شوہر یہاں نہیں آسکتا۔"

—— "درست ہے، لیکن قبلہ یہ تو فرمائیے کہ جس طرح ایک نیکوکار مرد کو خواہ اُسکی بیوی ہو یا نہ ہو فوراً حور ملجاتی ہے، اسی طرح کیا عورتوں کو بھی مرد ملجاتے ہیں۔"

—— "لاحول ولا قوۃ، یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی نیک شریف عورت غیر مرد کی خواہش کرے۔"

—— "بالکل اسی طرح جیسے ایک نیک شریف مرد غیر عورت پر قابض ہوجاتا ہے۔ کس قدر ناانصافی ہے کہ ایک مرد کو تو اسکے احتیاط و تقوے کے صلہ میں یہاں حوریں دیجائیں اور ایک محتاط و باعصمت عورت کو یونہیں ٹالدیا جائے۔ دنیا میں غیر عورتوں کو دیکھکر آپ ہی کا جی للچایا ہوگا اور آپ کی بیوی کا ہیکو کبھی بیتاب ہوئی ہوں گی۔ اجی جائیے۔ بات یہ ہے کہ پیغمبر جتنے پیدا ہوئے سب مرد تھے، اس لئے مرد کو حور و غلمان سب دیدیا، اگر کوئی عورت کبھی پیغمبر ہوجاتی تو آپ دیکھتے کہ عورتوں کے لئے جنت میں کیسے کیسے حسین و نوجوان مردوں کا انتظام ہوتا۔ سچ ہے غریب عورت کی مٹی دونوں جگہ پلید ہے، اگر بدقسمتی سے دنیا میں کوئی برا شوہر ملگیا تو جنت میں بھی اُسی بدمعاش کے پاس رہنا ہوگا، یہ بھی کوئی انصاف ہے۔"——

—— "خیر ان قصوں کو چھوڑیئے اور اپنی حور کو تو بلائیے تاکہ میں اُس سے لگاوٹ کروں اور آپ میں جذبۂ رقابت مشتعل ہو کہ یہی ہے اصل لذت۔"

مولانا جو شاید خود بھی اپنی بے معنی فردوسی زندگی سے کچھ اُکتا سے چلے تھے کچھ سوچ کر بولے کہ "تم کہتے تو ٹھیک ہو، اچھا میں حور کو بلاتا ہوں، لیکن اگر وہ تم کو دیکھ کر تمہاری طرف مائل ہوگئی تو پھر میں کیا کروں گا۔" میں نے کہا کہ "اول تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ آپ ایسے پُر غرور، حلیم و شحیم جنتی کو چھوڑکر وہ مجھ ایسے فاقہ زدہ، ضعیف و نزار شخص کی طرف متوجہ ہو، لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہوا بھی تو کوئی حرج نہیں میں اپنی حور آپ کو دیدوں گا، اچھا ہے، ذرا مزہ بدلجائے گا" یہ سن کر مولانا نے کچھ تامل فرمایا، اور

بولے کہ:- "یہ ٹھیک ہے، لیکن اگر تمہاری حور نے مجھے پسند نہ کیا؟" میں نے کہا:- "تو پھر میں دونوں کو رکھ لوں گا۔" اس پر اُنھوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور بولے کہ:- "تم آدمی خطرناک معلوم ہوتے ہو، لیکن خیر کوئی مضائقہ نہیں، آج امتحان ہی سہی۔" یہ کہکر انھوں نے زور سے قرات کے ساتھ آواز دی:- "حورا!- حورا!" اور فوراً حجرہ سے ایک چیز حرکت کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اور سامنے آکر بےحس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو میں یہ غور کرتا رہا کہ اس کا چہرہ کہاں ہے، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کس جگہ ہیں، کمر سے اوپر کا حصہ کہاں سے اور نیچے کا حصہ کس خط سے شروع ہوتا ہے؟ لیکن مطلق کوئی پتہ نہ چلا، بعد کو جب بہت غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بی صاحب، سفید چادر میں سر سے پاؤں تک ملفوف ہیں۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ:- "قبلہ، میں نے تو ہمیشہ "حلۂ بہشتی" کے محاورہ کو عریانی کے مفہوم میں استعمال ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ حلۂ بہشتی اس چیز کا نام ہے۔ اے حضرت، ان سے کہیے کہ خدا کے لئے یہ کفن اُتار کے آئیں، اور جنت میں تو اس چیز کی یاد دلائیں، جس نے لاکھوں کو خانماں برباد کرکے رکھدیا۔" مولانا نے حکم دیا کہ:- "چادر اُتار دو۔" یہ کہنا تھا کہ چادر سانپ کی کینچلی کی طرح خود بخود اتر گئی اور بُت کی طرح بےحس و حرکت ایک نوجوان عورت جو واقعی جمیل بھی نظر آئی، لیکن نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، اور گلے سے گھٹنے تک ایک چادر لپٹی ہوئی تھی جہاں تک منظر کا تعلق ہے، یہ حور واقعی بہت دلکش چیز تھی، لیکن اس کے جمود و سکوت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے میں اُسے ایک سنگین بُت سے ممتاز کرسکتا تھا۔ میں نے کہا کہ:- "مولانا یہ چادر بھی علٰحدہ کرائیے، میں بالکل عریاں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اور بغیر اس انتظار کے کہ مولانا اُسے ایسا حکم دیں بیتاب ہوکر خود میں نے ہاتھ بڑھایا کہ اس کی چادر علیٰحدہ کردوں، لیکن مولانا نے مجھے زور سے ایک ڈانٹ بتائی کہ:- "خبردار، ایسا نہ کرنا، ورنہ میرے ہاتھ سے بھی یہ حور چلی جائے گی، یہ حجاب صرف تاریکی میں اور وہ بھی اس وقت دور ہوتا ہے، جب تھوڑی دیر کے لئے جنتی کی بصارت بھی غائب ہو جاتی ہے۔" یہ سُن کر مجھے ایسا سخت صدمہ ہوا کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا کہ:- "اگر مجھے بھی ایسی ہی کفن پوش حور ملی اور میں اس کی عریانی سے ان تمام حسرتوں کا انتقام نہ لے سکا جو دنیا میں خدا معلوم کتنی عورتوں کو عریاں نہ دیکھ سکنے سے پیدا ہوئی تھیں، تو ایسی جنت اور ایسی حور سے کیا فائدہ۔ اس وقت میرا دم گھبرا رہا تھا کہ میں نے بھی کیا حماقت کی کہ دنیا میں سینکڑوں پُرمزہ معصیتوں سے محض اس لئے محترز رہا کہ یہاں جی کھول کر ان کے کرنے کا موقعہ ملے گا، لیکن یہاں تو کمبخت معصیت بھی، طاعت کی طرح بےمزہ ہوکر سامنے آتی ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اور حور کے پاس جاکر

اس کا سر اونچا کیا، لیکن نہ ہو سکا، میں نے گدگدی کی، لیکن وہ بے حس کھڑی رہی، مینے اسکی کمر میں چٹکی لی، لیکن وہ پتھر کی طرح بدستور قائم رہی۔ اب میری وحشت قابو سے باہر تھی۔ بدحواس ہوکر وہاں سے بھاگا، لیکن اپنے قصر کی طرف رُخ کرنے کے بجائے صدر دروازہ کی طرف دوڑا جارہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ:۔ "اے خدا! مجھے اس جنت سے نکال، تیری فردوس میرے کسی کام کی نہیں میں یہاں نہیں رہوں گا، ہرگز نہیں رہوں گا، دودھ، شہد کے خیال سے مجھے متلی ہوتی ہے، ایک بیجان وبحیس حور کی طرف متوجہ ہونے سے بہتر ہے کہ میں کسی پتھر کے سامنے اپنا سر جاکر پھوڑ ڈالوں۔ نکال، جلد نکال، میرا دم گھبرا رہا ہے۔"

میری آواز بلند ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ ساری فردوس اس سے گونجنے لگی، میں بھاگتا جارہا تھا اور یہی کلمات میری زبان پر تھے۔ چاروں طرف سے فرشتوں نے، قرب وجوار کے اہل جنت نے مجھے آکر گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ:۔ "کیا بات ہے۔" لیکن میں نے کسی کی بات کا جواب دیا اور برابر چیختا رہا۔ جب میں صدر دروازہ کے قریب پہونچا تو رضواں نے مجھے روکا اور کہا کہ:۔ "تم جنت سے باہر نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا کہ:۔ "جناب یہ بھی کوئی زبردستی ہے، میں ایسی لغو وبے معنی جنت میں نہیں رہنا چاہتا، اگر مجھے رکھنا ہے تو میری خواہشوں اور تمناؤں کو پورا کیجئے، جس کا وعدہ کیا گیا ہے ورنہ آپ مجھے دوزخ میں پھینک دیجئے۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ میں وہاں جلکر خاک سیاہ ہو جاؤں۔" رضواں نے پوچھا کہ:۔ "تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ:۔ "سب سے پہلے تو آپ میرے قصر سے دودھ، اور شہد کو نکلوائے، اور اس کے بجائے جانی واکر یا شامپین کی بوتلیں رکھوائیے، جن کے پینے کی حسرت لیکر میں دُنیا سے چلا تھا۔ اس کے بعد جو حور صاحبہ وہاں موجود ہیں ان کو کسی مولانا کے سپرد کر دیجئے، اور مجھے تو کوئی گوشت پوست والی عورت مرحمت فرمائیے، جس کے جسم میں لوچ ہو، اداؤں احتراز ہو، عشوۂ وناز ہو، جو میرے بلانے سے نہ آئے، میں ہات لگاؤں تو ہات جھٹک دے، گالیاں سُنائے، میں کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہوں تو وہ ناگن کی طرح سمٹ کر کترا کر نکل جائے، میں دامن تھاموں وہ دامن جھٹک کر گزر جائے۔" رضوان نے کہا کہ:۔ "جنت میں تو ایسی کوئی حور نہیں۔" میں نے عرض کیا کہ:۔ "پھر بندہ کا بھی یہاں رہنا ضرور نہیں۔"

رضواں یہ سُن کر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا کہ:۔ "تم کو حوروں میں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے اور ان میں کیا بُرائی ہے۔" میں نے عرض کیا کہ:۔ "ان میں خوبی کیا ہے، لیکن آپ بھلا کیوں ماننے لگے، اچھا یوں نہیں، پہلے آپ یہ بتائیے کہ:۔ آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟" رضواں یہ

یہ سُن کر گھبرایا اور بولا کہ :- "میں اس لفظ کے مفہوم سے قطعی ناآشنا ہوں"۔
—— "اچھا یہ تو بتائیے کہ حوروں کو دیکھ کر آپ کا جی کیا چاہتا ہے؟"
—— "کچھ نہیں"۔

یہ سُن کر میں نے اپنا منھ پیٹ لیا اور بولا کہ :- "واہ جی اللہ میاں، آپ نے بھی کس احمق کو رضواں بنایا۔ ارے اس بے حس مُردہ کو دوزخ میں بھیجدے، اور ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو صرف چند دن کے لئے امتحاناً یہ منصب میرے سپرد کردے، پھر دیکھ کہ تیری جنت کو کیا چیز بنائے دیتا ہوں، اگر دن دہاڑے، سب کے سامنے نہیں، حوروں کے لئے باہم جنتیوں میں چھُریاں نہ چلوادی ہوں تو سہی"۔

رضواں جو میری بیتابی کو دیکھ کر ہنس رہا تھا بولا کہ :- "اچھا تم خود پہلے کسی حور سے دریافت کرکے دیکھو کہ وہ تمہاری تربیت سے درست ہوسکتی ہے یا نہیں"۔ یہ کہکر اس نے تالی بجائی اور اسی وقت زمین سے ایک حور نکلی۔ میں نے پہلے اُسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور پھر قریب جاکر سوال کیا :-

"تم کون ہو" —— "میں حور ہوں"۔
"تم مرد ہو یا عورت" —— "معلوم نہیں"۔
"میں کون ہوں" —— "مجھے نہیں معلوم"۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ مجھے اپنے سے اس قدر قریب دیکھ کر تمہارا جی کیا چاہتا ہے؟" جواباً "کیا؟" میں نے کہا کہ "میں جو تم سے اسقدر متصل کھڑا ہوں، تو تمہارا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی جاتا رہے یا یہ کہ تم میرا منھ نوچ لو۔ میری پیٹھ پہ دو ہتھڑ مار کر بھاگ جاؤ" —— "میں نہیں جانتی"۔ —— "تمہاری عمر کیا ہے" —— "معلوم نہیں"

—— "تم جوان ہوگئی ہو یا نہیں" —— "معلوم نہیں"

اب مارے غصہ کے میں کانپنے لگا اور پریشان ہو کر اپنی دو انگلیاں اس کے سامنے لیجا کر بولا کہ :- "اچھا یہی بتا کہ کتنی انگلیاں ہیں"۔ اس کا جواب اُس نے وہی دیا کہ "مجھے نہیں معلوم"۔ اب میں بالکل بے قابو ہوگیا اور جی میں آیا کہ زور سے ایک لات مار کر وہیں پہونچا دوں، جہاں سے وہ آئی ہے، لیکن رضواں نے مجھے روک لیا —— میں نے کہا "سنئیے جناب، یہ ہے جنت اور مجھے اب یہاں سے جانا نہیں، اسلئے کام یوں نہ چلے گا۔ یہ جو آپ نے ہر بات کے جواب میں "معلوم نہیں" کہنے والی ناکارہ حوریں بھرلی ہیں، یہ سب کی سب نکال دینے کے قابل ہیں۔ یا تو آپ خدا سے اجازت لیکر مجھے اپنی جگہ کام کرنے دیں تاکہ میں خود خدا سے اس کا فیصلہ کرلوں، یا پھر آپ ہی جلد اس کا انتظام کیجئے، ورنہ میں یہاں اس قبرستان میں

ایک لمحہ زندگی نہیں بسر کرسکتا"۔ رضواں نے کہا کہ:۔ "آپ اپنی تجویز تو بتایئے کہ کیا ہے"۔ میں نے کہا" سنیئے اس کی ایک ترکیب تو یہ ہے کہ جنت کی تمام موجودہ حوروں کو فنا کردیجئے، اور از سرِ نو نئی حوریں بنوائیے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ فردوس کی زمین یا یہاں کی کسی اور چیز سے ان کا خمیر نہ کیا جائے، بلکہ دنیا کی کسی ایسی سرزمین سے انکی تعمیر ہونا چاہیئے، جہاں عورت کا مفہوم ہی معصیت اور معصیت ہے۔ اسکے لئے فی الحال یورپ کی سرزمین موزوں ہوگی۔ موجودہ حور کے اعضا میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مدراس کے بال، بنگال کی آنکھ، پنجاب کی ناک، کشمیر کا چہرہ، امریکہ کی گردن، فرانس کا قد، اسپین کی لچک، سرکیشیا کا رنگ اور حبشی عورتوں کا سینہ حاصل کیجئے۔ جب اس طرح انکی تعمیر ہوجائے اور جان ڈالنے کا وقت آئے تو خون کے ساتھ پارہ بھی ملا دیجئے، اور ان کے دل میں یہ کیفیت پیدا کیجئے کہ جب مردوں کو دیکھیں تو بیتاب ہوجائیں، لیکن زبان سے اس کا اظہار نہ کرسکیں۔ اسی کے ساتھ ان میں شان احتراز پیدا کیجئے، عشوہ و ناز، لگاوٹ اور الوٹ کی باتیں سکھایئے، گانا، ناچنا بتایئے، اور ہاں یہ سکھانا نہ بھول جائیگا کہ صرف آنکھوں سے کیونکر مسکراتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تمام اہتمام آپکے بس کی بات نہیں، اسلئے سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ جتنی عورتیں اسوقت دوزخ میں موجود ہیں، ان سب کو حور بنا دیجئے، کیونکہ یقیناً یہ عورتیں حسین بھی ہوں گی۔ اور جذبات جنسی بھی بہت قوی رکھتی ہوں گی۔ ورنہ وہ دوزخ بھیجی ہی کیوں جاتیں۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو پھر دیکھئے کہ جنت کیا چیز ہوئی جاتی ہے۔ کوئی حور گا رہی ہے۔ کوئی گھونگھر باندھے چھم چھم ناچ رہی ہے، کوئی ساغر بھر بھر کر پلا رہی ہے، کوئی گلے میں باہیں ڈالے پڑی ہے۔ بھئی رضواں تمھیں انصاف کرو، کہ اسوقت کیا عالم ہوگا، ایک ایک جنتی پڑا اینڈ رہا ہوگا، آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوگی۔ اور پوری طرح داد لذت دے رہا ہوگا۔ لیکن اس مشورہ کے عوض میں میری ایک خواہش آپکو پوری کرنی ہوگی اور وہ یہ کہ جب عورتیں دوزخ سے نکال کر حوریں بنائی جائیں تو پہلا حق انتخاب مجھے دیا جائے تاکہ سب سے پہلے میں قلوبطرہ ملکۂ مصر کو الگ کرلوں، مجھے بڑی آرزو ہے کہ اپنی ایک سرشارراتت سے پورا لطف اٹھا لینے کے بعد مجھے بھی اپنے نازک ہاتھوں سے ایک جام زہر پینے کے لئے دے۔ آہ، میاں رضوان تمھیں نہیں معلوم کہ دنیا میں ہمیشہ سینے ظالم ہی عورتوں پر جان دی ہے۔ اور اس لئے اگر میں اپنی اس ستم رسیدگی کا انتقام قلوبطرہ سے نہ لے سکا جو دنیا کی سب سے زیادہ سفاک بے رحم عورت تھی، تو تف ہے میرے جنتی ہونے پر"۔ رضواں نے سُنا اور مسکرا کر کہا کہ:۔ "اس انتظام کے لئے تو بہت زمانہ درکار ہے، فی الحال تم دنیا میں سے کسی کا انتخاب کرلو تاکہ تمھاری ضد تو پوری ہو"۔ میں نے یہ سنتے ہی بغیر سوچے سمجھے گھبرا کر کبن ہوٹل کا پتہ دیدیا اور چشم زدن میں وہی ساحرہ اپنے اسی سیاہ ریشمی لباس میں چلکتی ہوئی سامنے سے نمودار ہوئی۔ لیکن قبل اسکے کہ وہ مجھ تک

ہوئیں، ساری فردوس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور ہر جنتی چیخ اٹھا کہ "ہمیں بھی، ہمیں بھی، ہمیں بھی" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں سال کے سوئے ہوئے جذبات ان کے دفعتہً بیدار ہو گئے تھے۔ میں اس کو جلدی سے قریب ہی کے ایک خیمہ میں لے گیا۔ لیکن کمبخت جنتیوں نے وہ یورش مچائی کہ خدا کی پناہ، خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں، قناتیں پھاڑ ڈالیں اور میں چونک پڑا ——

صبح کا وقت تھا اور نظیر کا یہ شعر زبان پر

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی میں جی کی رہ گئی

جب برکفاسٹ اور لنچ کے وقت پھر میں نے اسکو اپنی کرسی پر پورے غرور حسن کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا تو میں جی ہی جی میں مسکرایا کہ ابھی چند گھنٹے کی بات ہے کہ رات کو یہ کشاں کشاں سامنے لائی گئی تھیں اور میرے ہر اشارہ پر سجھکانے کیلئے تیار تھیں۔ لیکن اسوقت یہ عالم ہے کہ گویا کبھی دیکھا ہی نہیں اور کچھ جانتی ہی نہیں۔ اللہ! اللہ!

یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پہ یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

نیاز

اطلاعنامہ بنام دائنان نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالہ

(دفعہ ۹ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء) بعدالت جناب سب جج صاحب بہادر اول مقام بہرائچ

درخواست دیوالہ نمبر ۳ سنہ ۱۹۳۱ء بہ مقدمہ قرار دیئے جانے دیوالیہ مسمی بودھن ولد اوری قوم راڑہ ساکن موضع اجواپور پرگنہ نانپارہ ضلع بہرائچ سائل بنام رام ہت وغیرہ مہاجنان

ہرگاہ مسمی بودھن ولد اوری سائل مذکورہ بالا نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی مورخہ ۲۱ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشاء ایکٹ دیوالیہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ قرار دیا جاوے اور تمہارا نام فہرست دائنان میں جو مدیون کو نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تمکو اطلاع دیجاتی ہے۔ کہ عدالت نے تاریخ ۵ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء واسطے سماعت درخواست مذکور الصدر اور لینے بیان مدیون کے مقرر کی ہے۔ اگر تم کچھ اس معاملہ میں پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا بذریعہ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو۔ آج بتاریخ ۲۲ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی

(مہر عدالت)

وقت حاضری بد فتر بہرائچ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

زبان اُردو کے تنزل کے اسباب اور ہندوستانی اکاڈمی

دنیا میں جس طرح اور زبانیں عالم وجود میں آئیں - اُسی طرح زبان اردو نے بھی تدریجاً ایک ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ اب اُس کا شمار دنیا کی شستہ زبانوں میں ہونے لگا ہے - البتہ فرق یہ ہے کہ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو کی ابتدا پردہ خفا میں نہیں ہے - قدما کی نظم و نثر کے جستہ جستہ ٹکڑے اب تک موجود ہیں جن سے اُردو کی ابتدائی کیفیت اب بھی معلوم کی جا سکتی ہے - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زبان نے اور زبانوں کی بہ نسبت بہت جلد ترقی کی ہے - اور ترقی کرنے کے بعد اتنی زیادہ مقبول خاص و عام ہوئی کہ آخر کار مادری زبان بن گئی -

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں وہ تمام لوازم زبان موجود ہیں جن سے ایک زبان زبان کہی جا سکتی ہے - اس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے ہر طرح کی بندشیں موجود ہیں - اور شعرا اور ادبا کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی نے فصاحت کے معیار کو بہت بلند کر دیا ہے -

چونکہ یہ زبان اور زبانوں کے مقابلہ میں بہت نئی ہے اور بہت سی زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے - اس لئے اگر اس کو خاتم السنہ ہند کہا جائے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا - وہ تمام خوبیاں جو اور زبانوں میں فرداً فرداً موجود ہیں وہ سب کی سب اجتماعی حیثیت سے اُردو زبان میں موجود ہیں - اس میں قریب قریب ہر مخرج کی آوازیں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس زبان کا بولنے والا اور زبانوں کے تلفظ کو بآسانی سیکھ سکتا ہے - اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُردو زبان میں کوئی خامی نہیں - ایک ہندوستانی کو یقیناً فرانسیسی A جرمنی O و Z و CH وغیرہ کے تلفظ ادا کرنے میں دقت پڑے گی - مگر دوسرے ملکوں کے باشندوں کے مقابلہ میں وہ یقیناً ایک غیر مادری زبان کا تلفظ اچھی طرح ادا کر سکے گا -

ہر زبان میں چند خصوصیات ہوا کرتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زبان اور زبانوں سے درجۂ امتیاز رکھتی ہے اسی طرح اُردو زبان میں بھی چند خصوصیات ہیں - اور انھیں خصوصیات کا جاننا اردو زبان کا جاننا ہے - ان خصوصیات کے اعتبار سے ہندی اور اردو میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ اُردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی - مگر جہاں تک جملوں کی بندش اور نشست الفاظ

کا تعلق ہے دونوں زبانیں بالکل ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے اردو کی ترقی ہندی کی ترقی ہے اور اردو کا تنزل ہندی کا تنزل ہے۔ رسم خط سے زبان نہیں بدل سکتی ہے۔ اور نہ اُسکے محاورات بدل سکتے ہیں۔ البتہ اگر جہلا کی دستبرد سے محاورات اور انداز بیان میں فرق آیا تو چاہے ہم اُن جملوں کو خط نسخ میں لکھیں یا خط نستعلیق میں۔ دیا نگری کے خط میں لکھیں یا مرٹیا میں۔ ہر حالت میں زبان میں ایک ایسا نقص عظیم پیدا ہو جائے گا جس سے ہمارے بزرگوں کی سالہا سال کی محنت اور مدت دراز کی عرق ریزی جس سے انھوں نے اس ننھے پودے کو سینچکر پروان چڑھایا تھا۔ خاک میں ملجائیگی۔

زبان اردو کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث ۔ یہ فرانسیسی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ عربی زبان میں بھی ہے مگر بہت کم جرمنی میں تذکیر و تانیث کے علاوہ ایک تیسری نوعیت بھی ہے اور الفاظ کی تذکیر و تانیث محض استعمال پر ہے یا یوں کہیئے کہ یہ امر سماعی ہے۔

۲۔ صیغوں کا استعمال ۔ صیغوں کا استعمال بھی اردو زبان کے لئے مخصوص ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی دو زبانوں میں صیغہ کا استعمال ایک نہ ملے گا۔ ایک معمولی سی مثال یہ ہے :۔

اُردو۔ میں نے آپ سے کہدیا تھا

انگریزی۔ I HAD TOLD YOU

۳۔ حرف جار کا استعمال۔ اس میں بھی زبان اردو کی خصوصیت نمایاں ہے۔

اُردو۔ میں سڑک پر جا رہا تھا۔

انگریزی۔ I WAS GOING BY ROAD

۴۔ محاورات زبان ۔ مثلاً مجھکو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اُس نے دیکھا نہ سُنا۔

۵۔ بندش الفاظ۔ اُردو زبان کی بندش ایک خاص طرح کی ہے ۔ صلہ اور موصول کا استعمال بہت کم ہے۔ جملے مختصر ہوتے ہیں۔ الفاظ میں روانی ہوتی ہے۔

۶۔ نشست الفاظ۔ وہی لفظ ایک جملے میں فصیح ہوتا ہے اور دوسرے میں غیر فصیح۔ حضرت انیس فرماتے ہیں :۔ "کہا کہا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" یہاں شبنم کہنا غیر فصیح ہے۔

۷۔ معانی الفاظ۔ جس طرح لاطینی زبان کے الفاظ جب انگریزی فرانسیسی جرمنی زبانوں میں داخل ہوئے ہیں تو اُنکا مفہوم کچھ بدل گیا ہے۔ اسی طرح جو عربی اور فارسی الفاظ اُردو میں داخل ہوئے اُنکا مفہوم بھی استعمال کی بنا پر بدل گیا ہے۔

انگریزی COMPLIMENTS - سلام
فرانسیسی COMPLIMENTS (تلفظ CONPLIMAN) مبارکباد۔
اسی طرح اُردو زبان میں بھی مفہوم بدلا ہے۔
اردو۔ گلاس - پانی پینے کا برتن جو استوانہ کی مخروطی صورت کا ہوتا ہے۔
انگریزی - GLASS - شیشہ
فارسی - غصہ - پریشانی جس میں غم غالب ہو۔
اردو - غصہ - خشم۔
عربی - غصہ - گلے میں پھنسنا - ضبط کرنا۔

۸- تبدیلی الفاظ - جس طرح انگریزی فرانسیسی وغیرہ میں بعض لاطینی الفاظ ایک بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح اُردو زبان میں بھی بعض الفاظ بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔

عربی - کیفیت - خیریت - بہ تشدید یا
اردو - کیفیت - خیریت - بغیر تشدید یا
انگریزی - LANTERN اردو لالٹین
انگریزی - BISCUIT (تلفظ بسکٹ) اردو بسکٹ۔
انگریزی - ENGINE (تلفظ انجن) اردو انجن

۹- جاذبیت الفاظ - چونکہ اُردو زبان میں قریب قریب ہر مخرج کی آواز موجود ہے۔ اس لئے ہر زبان کا تلفظ بہت آسانی سے اُردو زبان میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایسے الفاظ بہت کم نکلیں گے۔ جو اردو زبان میں بہت زیادہ ناموزوں معلوم ہوں۔ اگر ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو...... (AEROPLANE ، THERMOMETER) وغیرہ اردو زبان میں نئے نہیں معلوم ہوتے۔

۱۰- تغیر الفاظ - بعض الفاظ جو پرانے زمانے میں فصیح تھے اب متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً اپنے تئیں ٹک - پس - دلہذا کے معنی پر) ابن وغیرہ۔

لہذا میرے خیال میں اُردو زبان اُسی شخص کو آتی ہے جسکو محاورات زبان پر عبور ہو۔ جو صیغوں کا صحیح استعمال جانتا ہو۔ جملوں کے تناسب سے واقف ہو اور اُردو کی صحیح بندش کو سمجھتا ہو۔ ساتھ ہی سکے یہ بھی جانتا ہو کہ جو الفاظ اُردو زبان میں استعمال ہو رہے ہیں خواہ وہ عربی زبان کے ہوں یا کسی اور زبان

کے اُن کا مفہوم اُردو میں کیا ہے نیز انکا صحیح تلفظ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہو کہ کون کون سے الفاظ و محاورات متروک ہو گئے ہیں۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں استعمال ہو تو اُسکا مفہوم وہی ہو جو اُسکی اصل زبان میں تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زبان اردو میں چراغ کا مفہوم فارسی کے چراغ یا عربی کے سراج سے بالکل مختلف ہے۔ اردو کا چراغ ایک مدور برتن ہوتا ہے۔ جس میں کڑوا تیل بھرا ہوتا ہے اور ایک فلیتہ پڑا ہوتا ہے۔ فارسی میں ہم فارسی مفہوم کے اعتبار سے چراغ ہدایت کہہ سکتے ہیں۔ مگر اردو میں اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ آپ ہدایت کے چراغ ہیں تو وہ اسکو یقیناً مذاق سمجھیگا۔ اردو کی فکر اور فارسی کی فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح قریب قریب ہر اُس لفظ کے مفہوم میں جو اردو اور فارسی دونوں میں استعمال ہوتا ہے نمایاں فرق ہے۔

غالباً اس تحریر سے یہ پوری طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ اگر کوئی شخص مندرجۂ بالا باتوں سے واقف نہیں ہے۔ تو اُسے ہم کسی حالت میں اردو داں نہیں کہہ سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی پڑھ جانے سے کوئی شخص اُردو داں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر عرب کا باشندہ اپنے آپ کو اُردو کا ایک بہترین زباندان تصور کرنے لگتا۔ اصل تو یہ ہے کہ عربی دانی اور فارسی دانی سے چند مشکل لغتوں کے معنی ضرور معلوم ہو جاتے ہیں، مگر ثقیل اور نامانوس لفظوں کے معنی جان لینا اردو دانی نہیں ہے۔ زیادہ عربی دانی سے یہ نقص پڑتا ہے کہ انسان اس بات کو بالکل بھول جاتا ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا مفہوم زبان اردو میں کیا ہے اردو زبان کو جانتے کے لئے اصل میں پہلی چھ خصوصیات بہت ضروری ہیں۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر ہم آج کل یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ انھیں خصوصیات کو بالائے طاق رکھکر محض الفاظ کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف زبانوں کے پڑھنے سے چند الفاظ کا مفہوم جو دوسری زبانوں میں ہے معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا نزاع لفظی کی سوجھتی ہے۔ باقی رہے محاورات زبان۔ صیغوں کا استعمال۔ بندش الفاظ ان سے قطعاً نابلد رہتے ہیں۔

جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ بعض اُردو الفاظ کی تشریح جان لینے سے انسان اردو داں ہو سکتا ہے وہ سراسر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ فیلولوجی کسی زبان کا ادب سیکھنے کے لئے بالکل غیر ضروری ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فیلولوجی سے صحیح ادبی مذاق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ مثلاً شمشیر کی تشریح۔ ستم = ناخون اور شیر سے ایک فیلولوجی جاننے والے کا خیال لفظ شمشیر کو سُن کر فوراً شیر کے ناخون کی طرف منتقل ہو گا۔ لہذا وہ شمشیر کے ادبی مفہوم کے سمجھنے میں قاصر رہے گا۔ اور اُس کا طرز تخیل ایک اردو داں کے طرز تخیل سے

کچھ مختلف ضرور ہوگا۔

دوسری مثال یہ ہے۔ اگر کسی شخص کو معلوم بھی ہوگیا کہ خندق کندک سے نکلا ہے اور اُسکو یہ نہیں معلوم کہ خندق کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ خندق کو کنوئیں یا تالاب کے معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی اس کے اگر خندق کی اصلیت کندک معلوم بھی ہو گئی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کندک کہاں سے آیا اور اگر اس کا مخرج بھی معلوم ہو گیا تو وہ لفظ کہاں سے نکلا۔ وہمچنیں مسلسل بہرحال اس جھگڑے میں پڑکر زبان اُردو پس پشت پڑ جاتی ہے اور ایک انسان غیر ضروری باتوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص زبان اُردو میں گفتگو کرتا ہے اُس وقت وہ ہر لفظ کو اردو سمجھتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ لفظ عربی سے مشتق ہو یا لاطینی سے اور اُس کا خیال بھی فیلولوجی کی طرف نہیں پہونچتا ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کردینے کی ضرورت ہے کہ زبان اُردو میں اس وقت کون سی خامیاں ہیں۔ اردو کے خزانہ میں اسوقت ادبی حیثیت سے ہر قسم کی نظم و نثر موجود ہے۔ اگر نثر میں غور کیا جائے تو جتنی صورتیں نثر کی تمام روئے زمین کی زبانوں میں ہیں وہ سب اردو میں موجود ہیں۔ نظم میں کوئی ایسی صنف نظم کی نہیں جو اردو میں نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ہم اردو کی صرف ایک بحر متدارک پر غور کریں۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ روئے زمین کی شاعری زیادہ تر اسی بحر میں ہے۔

LIVES OF GREAT MEN ALL REMIND US
WE CAN MAKE OUR LIVES SUBLIME

فعل فعولن فعلن فعلن فعل فعولن فعلن فاع مع زحافات

مضمون کے اعتبار سے اب بھی اردو کی شاعری کسی طرح دنیا کی تمام شاعری سے کم نہیں۔ البتہ زبان اردو میں جس بات کی کمی ہے وہ موجودہ سائنس کے علمی مضامین ہیں۔ اسکی وجہ بہت کچھ تو نامساعدت وقت ہے اور کچھ ہم لوگوں کی کوتاہی ہمت۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جب وہ وقت آئے گا کہ سائنس زبان اردو میں پڑھائی جائے گی تو لامحالہ ہم کو بعض الفاظ زبان اردو میں داخل کرنا پڑیں گے۔ مگر یہ کام صرف وہی حضرات کرسکتے ہیں جنھیں اردو کا صحیح مذاق ہو۔ جو زبان اردو پر عبور رکھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ کون لفظ زبان اردو کے لئے موزوں ہے اور کون سا ناموزوں۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ وہ اس دشوار مسئلہ میں رائے زنی کرے اور ایک نیا لفظ زبان اُردو میں داخل کرکے زبان کے مذاق کو خراب کردے۔

آج کل تو یہ حالت ہے بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر شخص اپنے آپ کو زبان اردو کا مسلم الثبوت اوستاد سمجھتا ہے۔ اور بعض حضرات کا تو یہاں تک دعوے ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ مگر جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات جو زبان اُردو کی توسیع میں پڑے ہوئے ہیں اُن کی وہی حالت ہے جو انگریزی مدارس کے آٹھویں درجہ کے طالب علموں کی ہوتی ہے۔

ایک طالب علم جب زبان انگریزی سیکھنا شروع کرتا ہے تو وہ اردو میں سوچتا ہے اور اپنے مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کرتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو زبان انگریزی میں الفاظ ہی نہیں ملتے ہیں اور وہ غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً FAT؛ فیٹ کے معنی موٹا یا پڑھنے کے بعد جب وہ موٹی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے تو بے تکلف A FAT BOOK لکھدیا کرتا ہے۔ جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ END OF THE ROOM کے معنی مکان کا کنارہ ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ کنارے کے لئے زبان انگریزی میں ENDE لکھتے ہیں۔ پس کچھ تعجب نہیں اگر وہ دریا کنارے کے لئے زبان انگریزی میں END OF THE RIVER لکھدے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ مجھے ایف اے کے ایک طالب علم کے انگریزی مضمون دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُس بیچارے نے زبان انگریزی کی یوں توسیع کی تھی۔

SO FAR THE REFORMATION WAS PURGATIVE IN THE OLD RELIGION

اس جملہ میں لفظ (PURGATIVE) اردو تخیل ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس لفظ کے استعمال سے اُردو داں حضرات کہاں تک بہرہ یاب ہوئے۔

چونکہ آج کل انگریزی مدارس میں تعلیم زبان انگریزی ہی میں دیجاتی ہے اور طالب علموں سے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ زبان انگریزی ہی میں سوچیں اور اپنا مفہوم زبان انگریزی میں ادا کریں۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد جب زبان انگریزی کی مہارت بڑھجاتی ہے اور انگریزی میں سوچتے سوچتے زبان اردو کے محاورے بالکل بھول جاتے ہیں۔ اُسوقت ایک ہندوستانی آدمی اپنی زبان کو خیرباد کہہ کے زبان انگریزی میں سوچتا ہے لکھتا ہے اور اپنی تقریر میں آدھے الفاظ انگریزی کے استعمال کرتا ہے۔ اُس کے جملوں کی بندشیں بالکل انگریزی ہوجاتی ہیں اور اُسے ہر جملے کو مکمل کرنے کے لئے زبان انگریزی کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے اور اردو کے صرف وہ الفاظ یاد رہجاتے ہیں جن کے مترادف زبان انگریزی میں ایک حد تک موجود ہیں اور وہ تمام الفاظ و محاورات جو زبان اردو کے لئے مخصوص ہیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ چونکہ دو مختلف زبانوں میں

ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے مترادف وہم معنی الفاظ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اسلئے ایسے اردو الفاظ کی تعداد جن کا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو۔ قاعدے سے بہت کم ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ اردو بہت وسیع زبان ہے اور اس میں زبان انگریزی سے کہیں زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ اس لئے کچھ مترادف الفاظ انگریزی مفہوم ادا کرنے کے لئے مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اردو الفاظ کی تعداد جنکا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو زبان انگریزی کے مقابلہ میں یقیناً کم ہو گی۔ اس لئے ایسے انگریزی داں حضرات کو زبان اردو بالکل محدود نظر آتی ہے۔ اُن کو قدم قدم پر اپنا خیال ادا کرنے کے لئے اُردو الفاظ نہیں ملتے اور وہ اُسے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ جسطرح ممکن ہو زبان اردو کی توسیع کیجائے اور توسیع بھی یوں ہو کہ انگریزی الفاظ کا ترجمہ زبان اُردو میں کر دیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ اردو الفاظ جو انگریزی الفاظ کے مترادف قرار دئے جائیں اُنکا مفہوم زبان اردو میں چاہے کچھ ہی ہو۔ اگر ایسے حضرات کو زبان اردو پر عبور ہوتا اگر وہ محاورات زبان سے واقف ہوتے اور اگر وہ زبان اردو میں بھی سوچنے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو غالباً ان کو الفاظ ملنے میں بالکل دقت نہ ہوتی۔

مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض قابل ہندوستانی انگریزی داں حضرات کو جب کبھی اردو یا ہندی میں تقریر کرنی پڑی یا خطبہ صدارت پڑھنا پڑا تو انھوں نے اپنی تقریر پہلے انگریزی میں لکھ کر اُردو یا ہندی میں ترجمہ کرایا۔ ایک مترجم نے بھولے سے کچھ ٹھیٹ اردو الفاظ استعمال کر دیئے۔ یعنی ایسے الفاظ استعمال کئے جن کے مترادف زبان انگریزی میں نہیں ہیں۔ بس کیا تھا بگڑ گئے اور اُن پر یہ الزام لگایا کہ تم نے عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کر دی ہے۔

آپ لوگ اگر غور سے دیکھیں گے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ہر اُس شخص کے اُردو مضامین میں جو زبان انگریزی میں سوچنے کا خوگر ہے صرف وہ الفاظ ملیں گے جنکے مترادف زبان انگریزی میں موجود ہیں۔ ایسے حضرات کے مضامین میں وہ الفاظ قطعاً نہ ملیں گے۔ جن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے زبان انگریزی میں کوئی لفظ نہیں۔ مثلاً آن۔ بان۔ ناز۔ ادا۔ نادان [illegible] وغیرہ۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انگریزی داں حضرات کی اُردو دانی اُن کی انگریزی قابلیت کی وجہ سے محدود ہو گئی ہے۔ اور اُن کو محض تھوڑے سے اردو الفاظ معلوم ہیں۔ جن کی تعداد اُن انگریزی الفاظ سے یقیناً کم ہے جو انھیں باوجود ہندوستانی ہونے کے معلوم ہیں۔

ایسے لوگوں کی عبارت میں زیادہ تر خود ساختہ الفاظ ملیں گے جو اُن کے خیال میں زبان انگریزی کے الفاظ کے مترادف ہیں۔ مثلاً زبان انگریزی میں PRODUCT OF THE FIELD کے معنی ہیں

کھیت کی پیداوار۔ لہذا انھوں نے سمجھ لیا کہ جہاں کہیں لفظ PRODUCT ہو اُس کے معنی پیداوار ہوں گے۔ اس قاعدے سے PRODUCT OF THE BRAIN کا ترجمہ دماغ کی پیداوار ہوا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسے ایک بچہ نے موٹے کے معنی FAT سمجھکر موٹی کتاب کا ترجمہ FAT BOOK کر دیا۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں دو زبانوں میں ایسے الفاظ کا ملنا ایک حد تک ناممکن ہے۔ جنکا مفہوم ہر نوعیت سے ایک ہو۔ یہ ممکن ہے کہ چند محاورات میں دو مختلف زبانوں کے الفاظ ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہوں مگر ضرور کوئی نہ کوئی ایسا محاورہ مل جائے گا جس میں صرف ایک ہی زبان کا لفظ استعمال ہوتا ہوگا۔ مگر دوسری زبان کا نہیں۔ ایک معمولی لفظ GOOD ہے جسکا مفہوم قریب قریب وہی ہے جو اردو میں لفظ اچھے کا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو کے لفظ اچھے میں COMPARISON کی شان موجود ہے۔ جو انگریزی لفظ (GOOD) میں نہیں۔ اُردو میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں "ان سب میں یہ کتاب اچھی ہے۔ مگر انگریزی میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ بریں انگریزی میں ایک خاص محاورہ FOR GOOD ہے۔ جس میں GOOD اور اچھے کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے یہ اصولی غلطی ہے کہ پہلے ایک انگریزی لفظ کے کسی خاص مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کیا جائے۔ پھر اُس اُردو لفظ کا اطلاق ہر اُس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہو جہاں ہم اُس کے انگریزی مترادف کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ وہ غلطی ہے جو انگریزی خواں حضرات نادانستہ کرتے ہیں اور جسکو وہ اپنی اصطلاح میں توسیع زبان کہتے ہیں۔

اسکے علاوہ انگریزی قواعد پر عبور ہو جانے کی وجہ سے انگریزی داں حضرات یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اردو زبان کے بھی وہی قواعد ہیں جو انگریزی کے۔ چنانچہ اس زعم میں محاورے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صیغوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنی غلطی کو نہیں محسوس کر سکتے۔ مثلاً اردو کا محاورہ ہے "ہمارے وہاں ایسا ہوا" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا کہ بولنے والا تو واحد ہے۔ اس لئے میرے لکھنا چاہیئے علاوہ بریں وہاں میں بُعد کے معنی ہیں۔ اسلئے یہاں ہونا چاہیئے۔ اس لئے میرے یہاں زیادہ فصیح ہے۔ مگر یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ ایک دوسرا اُردو کا محاورہ ہے "دیکھا نہ سنا" جسکے معنی ہیں "نہ دیکھا نہ سنا" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا چونکہ ابتدا میں علامت نفی نہیں ہے جیسے اس انگریزی فقرے (NEITHER HE SAW NOR DID HE HEAR) میں ہے۔ اس لئے اس کے معنی ہیں دیکھا مگر نہیں سُنا۔

اصلیت یہ ہے کہ انگریزی میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے بعد زبان اُردو سے اس حد تک بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے کہ سلاست زبان اور فصاحت تو درکنار اُردو کے معمولی معمولی جملے بھی لکھنا مشکل ہوتا ہے۔

غضب خدا کا اگر کسی انگریزی خواں ہندوستانی کے سامنے ہم Triangular field کی جگہ Three angular field استعمال کریں یا Biennial plant کی جگہ Two ennial plant TWO WEEKLY کی جگہ Biweekly - Two cycle کی جگہ Bicycle Fortnightly کی جگہ Half monthly کہیں تو یہ غیر فصیح جملے اُس کے کانوں پر بہت زیادہ گراں ہوں گے اور اُس کے مذاق سلیم کو بہت سخت ٹھیس لگے گی مگر جس وقت سہ ماہی کی جگہ تماہی استعمال کیا جاتا ہے اور متعدد پرچوں اور رسالوں میں اُسکی مخالفت بھی کی جاتی ہے تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ انگریزی محاورات اس طرح رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں کہ فصاحت کا احساس تک جاتا رہا اور مذاق سلیم بالکل مفقود ہو گیا۔ اردو زبان میں چھ ماہی صرف مردے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں تو ایک نیا لفظ تماہی غالباً اردو زبان کے مُردے کے لئے استعمال کیا گیا ہے میں نے لفظ مردہ کا استعمال خاصکر اس وجہ سے کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو زبان اردو پر عبور ہوگا تو لفظ تماہی سنتے ہی فوراً اُس کا خیال مردے کی طرف منتقل ہوگا۔ کیونکہ چھ ماہی صرف مردے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ آپ ہی خود بتائیں اردو کی تماہی کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ (باقی)

قاضی خورشید احمد۔ ایم۔ ایس۔ سی

انٹرویو

گھبرایا ہوا نوجوان میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی بولا کہ وہ روزنامہ... کا نامہ نگار ہے اور میرے پاس انٹرویو کے لئے آیا ہے۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کیوں؟ جواب ملا:۔ "انٹرویو کے لئے۔"

میں۔ اوہ، اچھا۔ اچھا ہاں۔

میری طبیعت گو صبح ہی سے کچھ مکدر سی تھی۔ تاہم میں کتابوں کی الماری کے پاس گیا۔ اور دس منٹ تک مختلف کتابیں اور ڈکشنریاں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نوجوان نامہ نگار کے بغیر یہ لاینحل مسئلہ حل ہونے کا نہیں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ آپ انٹرویو کے ہجے کس طرح کرینگے۔

وہ (حیران ہو کر) ہجے؟ کس کے؟

میں۔ انٹرویو کے

وہ۔ آپ کو انٹرویو کے ہجوں کی کیا ضرورت لاحق ہو گئی

میں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انٹرویو کے معنی کیا ہیں؟

وہ۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ میں آپکو اسکے معنی تو بتا دونگا۔ لیکن...... لیکن

میں۔ شکریہ۔ نوازش

وہ۔ الف نون زیر۔ اِن۔ ٹے رے۔ ٹر اِن ٹر........

میں۔ اچھا تو انٹرویو میں گویا پہلے الف آتا ہے۔

وہ۔ یقیناً۔ کیوں؟

میں۔ لاحول ولا۔ بس اسی بات نے تو میرے دس منٹ لئے

وہ۔ لیکن یہ کیوں؟ تو کیا آپ الف کی بجائے کسی اور حروف سے شروع کریں گے۔

میں۔ ہاں، یہی تو مجھے معلوم نہ تھا۔ اس لئے میں ڈکشنریوں کی طرف سے مایوس ہو کر لغات دیکھ رہا تھا کہ شاید ان میں کہیں پتہ مل جائے لیکن میری کتابیں بڑے پرانے ایڈیشن کی ہیں۔ اغلباً نئے ایڈیشنوں میں انٹرویو کی تصویر ہوگی۔

وہ۔ (سراسیمہ ہو کر) میرے معزز بزرگ۔ انٹرویو کی تصویر آپ کو نئے ایڈیشنوں میں کبھی نہیں ملسکتی۔ مگر مجھے معاف فرمائیں۔ میں دنیا میں کسی شخص کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ اتنے قابل ادیب نہیں۔ جتنی آپ کی شہرت ہے۔ معاف فرمائیے۔ میں نے ابھی

تک کسی کی دل آزاری نہیں کی

میں۔ یقیناً نہیں۔ میرے متعلق یہی خیال ایسے احباب نے بھی ظاہر کیا ہے۔ جو کسی کی خوشامد نہیں کرتے اور جن کو دنیا کی کوئی چیز بھی خوشامد پر مائل نہیں کرسکتی۔ بجز اوہ سب میرے اس خصوصیت کے مداح ہیں

وہ۔ بالکل درست۔ ہاں تو اس انٹرویو کے متعلق یہ گزارش ہے کہ آج کل یہ دستور ہے کہ جو آدمی مشہور ہو جائے۔ اُس کے ساتھ انٹرویو کیا جاتا ہے۔

میں۔ خوب۔ میں نے اس کے متعلق آج تک کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ یہ تو بڑی دلچسپ چیز ہوگی اچھا تو آپ انٹرویو کو کس چیز کیساتھ سرانجام دینگے۔

وہ۔ کس چیز کے ساتھ؟ یہ تو عجیب سوال ہے جناب من۔ انٹرویو میرے اور آپ کے درمیان ہوگا اور وہ اس طرح کہ میں آپ سے سوالات کرتا جاؤں گا۔ اور آپ جوابات دیتے جائیں گے چونکہ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ لہذا مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے چند ایسے سوالات کروں جو آپ کی زندگی کے پبلک اور خانگی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالیں۔

میں۔ بڑی خوشی سے۔ بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ لیکن ایک بات عرض کئے دیتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ چونکہ میرا حافظہ بہت زیادہ کمزور ہے۔ اس لئے آپ اس کا چنداں خیال نہ فرمائیں۔ میرا حافظہ عجیب و غریب ہے۔ یعنی یا تو اسے برسوں کی بات یاد رہتی ہے اور یا پرسوں کی بھی نہیں۔

وہ۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی طرف سے ٹھیک ٹھیک جواب دینے کی کوشش کریں۔

میں۔ ضرور میں دل و جان سے صحیح اور درست جوابات دینے کی سعی کروں گا۔

وہ۔ اچھا تو اب آپ میرے سوالات کے جوابات دینے کے لئے تیار ہیں نا۔

میں۔ بالکل۔

وہ۔ آپ کی عمر کیا ہے؟

میں۔ ماہ جون میں اُنیس سال کا ہو جاؤنگا۔

وہ۔ (تعجب سے گھورتے ہوئے) اچھا میں تو آپکو ۳۵، ۳۶ سال کا سمجھتا تھا۔ خیر آپکی پیدائش کس مقام پر ہوئی۔

میں۔ پشاور میں۔

وہ۔ آپ نے مضمون نگاری کب شروع کی۔

میں۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں

وہ۔ ہیں۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں؟ یہ کیسے ممکن ہے جب بقول آپ کے آپ صرف اُنیس سال کے ہیں۔

میں۔ میں خود نہیں جانتا۔ اور مجھے خود بھی یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔

وہ۔ خیر تو آپ خود بھی اسے محسوس کرتے ہیں اچھا تو آپ اب تک جن بڑے آدمیوں سے مل چکے ہیں۔ آپ کے خیال میں ان سب سے بڑا آدمی کون ہے؟

میں۔ سرسید علیہ الرحمۃ۔

وہ - تیز ہو کر (ناممکن) ایک اُنیس سالہ نوجوان بھلا سرسید سے کس طرح مل سکتا ہے۔

میں - اچھا تو جب آپ میرے متعلق مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ تو پھر ان سوالات کی کوئی ضرورت نہیں۔

س - خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا - اچھا تو آپ سرسید اعظم سے کہاں ملے ؟

میں - مجھے ایک دن اُن کے جنازے پر جانے کا اتفاق ہوا - اور اُنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ براہِ کرم یہاں شور نہ کرو۔

وہ - لاحول ولا - اگر آپ ان کے جنازے پر پہونچے تو وہ یقیناً فوت ہو چکے ہوں گے - اور اگر وہ وفات پا چکے تھے تو ایک مردہ آپ سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ برائے مہربانی یہاں شور نہ کرو۔

میں - میں کچھ نہیں کہہ سکتا - لیکن چونکہ وہ بہت بڑے آدمی تھے - اس لئے ممکن ہے یہ بھی اُن کی خصوصیت ہو۔

وہ - معاف فرمایئے - میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا - آپ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آپ سے بات بھی کی اور یہ کہ ان کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔

میں - میں نے ان کے انتقال کے متعلق تو کچھ بھی نہیں کہا۔

وہ - تو کیا وہ مر نہیں چکے تھے۔

میں - بعض آدمی کہتے تھے کہ وہ مر چکے ہیں - اور بعض کہتے تھے کہ نہیں وہ زندہ ہیں۔

وہ - لیکن آخر آپکا کیا خیال تھا۔

میں - میرا کچھ بھی خیال نہ تھا - کیونکہ وہ میرا جنازہ تو تھا ہی نہیں - کہ میں اس امر کا خاص خیال رکھتا۔

وہ - ہنستے ہوئے - یہ تو آپ نے ایک ہی کہی - خیر تو ہم اس مسئلہ کو یہیں چھوڑتے ہیں - اچھا یہ تو فرمایئے کہ آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے ؟

میں - بروز پیر ۳۱ ، اکتوبر ۱۷۹۳ء

وہ (نہایت غصہ سے) غیر ممکن - غیر ممکن - اس حساب سے تو آپ ڈیڑھ سو سال کے ہوئے بھلا آپ اس کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔

میں - میں اس کو ثابت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

وہ - لیکن آپ نے خود ہی تو پہلے کہا تھا کہ آپ اُنیس سال کے ہیں - اور اب آپ نے اپنے تئیں ڈیڑھ سو برس کا ظاہر کیا - یہ تو بڑا فرق ہے۔

میں (کرسی سے اُچھل کر) اخاہ - تو آپ نے یہ فرق بھی محسوس کیا (زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے) لبا اوقات مجھے خود بھی اس امر کا خیال آیا - لیکن بخدا میں نے فرق کبھی محسوس نہیں کیا - ماشاءاللہ آپ بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔

وہ - (جھینپ کر) اس اعزاز کے لئے شکریہ - اچھا تو آپ کے کوئی بھائی بہن بھی ہے یا نہیں۔

میں - میں ...... میں .... خیال کرتا ہوں ...... ہاں ...... نہیں ..... مگر مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔

وہ - ہیں - اس سے زیادہ مضحکہ انگیز جواب تو میں نے عمر بھر نہیں سُنا۔
میں - یہ کیوں - آخر اس میں کیا غیر معمولی بات ہے۔
وہ - لیکن میں اسے مضحکہ انگیز کیوں نہ کہوں - کیا یہ دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر آپ کے بھائی کی نہیں
میں - واہ - وا - شاباش - ہاں - ہاں - اب آپ نے مجھے یاد دلایا - فی الحقیقت یہ میرا بھائی تھا۔ یہ عبدالرحمٰن کی تصویر ہے - ہم اسے "مہابخی" کہا کرتے تھے - آہ - پیارا مہابخی ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔
وہ - کیوں - تو کیا وہ فوت ہو چکے ہیں۔
میں - آہ میں یہی فرض کرتا ہوں - میں یقیناً کچھ بھی نہیں کہہ سکتا - یہ بھی ایک عجیب راز ہے۔
وہ - واقعی بڑے افسوس کی بات ہے - یہ غریب کہیں غائب ہو چکا ہوگا۔
میں - ہاں - اب تو غائب ہی سمجھو - کیونکہ ہم نے خود ہی اسے دفن کر دیا تھا۔
وہ - دفن - دفن - تو کیا زندہ ہی کو دفن کر دیا تھا۔
میں - نہیں - نہیں - وہ کافی مر چکا تھا۔
وہ - جھنجلا کر - میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کی گفتگو کم از کم میری سمجھ سے تو بہت بالا ہے - بندۂ خدا - جب وہ مر چکا تھا - اور آپ نے مردہ کو دفن کیا تو ۔۔۔۔۔۔۔۔
میں - نہیں - نہیں - ہمارا خیال تھا کہ وہ مر چکا ہے۔
وہ - اچھا - اب میں سمجھا - تو دفن کرتے وقت جی اٹھا ہوگا۔

میں - تو آپ شرط بد لیجئے کہ وہ دفن کرتے وقت نہیں جیا۔
وہ - لاحول ولا - ارے میاں - آخر آپ کا مطلب کیا ہے - جب آدمی مر گیا - اور اُسے دفن کر دیا گیا تو اس میں "عجیب راز" کی کونسی بات ہوئی؟
میں - آہ یہی تو راز ہے - میں اور مہابخی توام تھے جب ہم دو ہفتے کے تھے - تو ایک ٹب میں نہانے لگے ہم میں سے ایک ڈوب گیا - لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون؟ کوئی کہتا تھا کہ مہابخی ڈوبا - اور کوئی میرا ڈوبنا ظاہر کرتا تھا۔
وہ - (ہنس کر) واقعی یہ تو بڑے عجیب راز کی بات ہے - اچھا تو آپ کے خیال میں کون ڈوبا تھا۔
میں - یہ تو خدا ہی کو معلوم ہوگا - لیکن واقعات کہتے ہیں - کہ میں - سنیئے میں آج آپ پر وہ راز ظاہر کرتا ہوں - جو اس سے پہلے کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا - اور اسی راز نے میری زندگی کو غم و آلام سے لبریز کر رکھا ہے - ہم دونوں میں سے ایک کی دہنی کہنی کے نیچے ایک بڑا تِل تھا اور وہی تِل والا بچہ ڈوبا تھا (کہنی ننگی کرکے اور یہ دیکھیئے - وہ تِل یہ ہے۔ آہ - مہابخی۔
وہ - بہت خوب - لیکن مجھے تو اب بھی اس میں راز کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔
میں - تو معلوم ہوا کہ آپ بھی میرے والدین کی طرح اندھے ہیں - کیونکہ اگر وہ اندھے نہ ہوتے تو میری جگہ مہابخی کو دفن نہ کرتے - اب خدا کے لئے یہ راز

انپر ظاہر نہ کرنا۔ کیونکہ کہیں تلافیٔ مافات کے لئے اُسے نکال کر مجھے نہ دفنا دیں۔

وہ۔ میں آپ کا بہت زیادہ ممنون ہوں۔ مجھے اس انٹرویو میں کافی سے زیادہ دلچسپ مواد مل گیا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ تذکرہ سرسید علیہ الرحمۃ کے جنازے کا تھا۔ ہاں تو کیا آپ یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ سرسید مرحوم کو سب سے بڑا آدمی ماننے کے لئے آپ کے پاس کیا اسباب ہیں۔

میں۔ اوہ۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے جب غسل وکفن کے بعد جنازہ باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو سرسید علیہ الرحمہ نے اُٹھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کالج کی عمارات کا ایک آخری نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سرو قد اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمارات کو دیر تک بہت غور سے دیکھتے رہے۔

نوجوان نامہ نگار مجھ پر دہشت خیز نگاہیں ڈالتا ہوا اٹھا اور بغیر رسمی سلام کے جلدی جلدی دروازہ کھول کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔

"شبلی افغانی"

بہ ادنیٰ تصرف مارک ٹوین

نگارستان

حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبولیت حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ قیمت (عہ)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ۔ حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ علاوہ محصول ۱۰/

صحابیات

جسمیں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول (عہ)

مینیجر "نگار" لکھنؤ

کوئی کہانی سناؤ

بچہ جب بولنے کے قابل ہوتا ہے تو کہتا ہے:۔ "کوئی کہانی سناؤ"۔
دادی شروع کرتی ہے:۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہزادہ تھا اور وزیر زادہ اسکا دوست تھا"
لیکن اس مشغلہ کو اسکول ماسٹر بند کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ "تین کا چوگنا بارہ ہوتے ہیں لسے سیکھو، کیونکہ یہ ایک واقعہ ہے، حقیقت ہے، اور شہزادہ کی کہانی تو جھوٹی کہانی ہے"۔
لیکن یہ تعلیم بچہ کو متاثر نہیں کرتی، کیونکہ اسکی روح تو اسی غیر دریافت شدہ سرزمین کی سیر کر رہی ہے۔ جہاں شاہزادہ نے دیو کو مارا تھا — اور — ریاضی میں اتنی پرواز کہاں کہ ہاں تک اڑ کر پہونچ سکے۔

بچہ کے والدین سر کو جنبش دیکر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ:۔ "یہ بالکل تباہ ہو رہا ہے۔ اب سوائے زد و کوب کے کوئی چارہ نہیں"۔

اسکول ماسٹر نے دادی کی کہانیاں تو بند کر دیں، لیکن وہ اس سے بیخبر ہے کہ کہانیوں کا سلسلہ تو بدستور جاری ہے۔ کہنے والے کہے جا رہے ہیں کہ:۔ "کہانیاں تاریخ میں کہیں نہیں پائی جاتیں۔ اسلئے جھوٹی ہیں"۔ اور ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی تعلیم تک بچہ کی تربیت ذہن و دماغ پر وقت صرف کیا جاتا ہے — مگر — بچہ کا یہ مطالبہ کہ:۔ "کوئی کہانی سناؤ" ہنوز جاری ہے۔

تمام روئے زمین پر، ہر جگہ، ہر گھر میں کہیں زبانی اور کہیں تحریری، کہانیوں پر کہانیاں طیار ہوتی جا رہی ہیں اور انسانی میراث میں سب سے زیادہ جو چیز ملتی ہے، وہ یہی کہانیاں ہیں۔
لوگ یہ نہیں سوچتے کہ کہانیاں بنانا تو خود خدا کا بہترین مشغلہ ہے۔ اس لئے پہلے اس سے یہ عادت ترک کراؤ، پھر انسان سے کہنا۔

ایک بار خالق اعظم نے، اپنے مصروف و منہمک دار التجربہ میں عنصر کی طیاری شروع کی۔ کائنات اسوقت صرف دھواں ہی دھواں تھی۔ چٹانیں، معدنیات تہ بہ تہ بچھائی جا رہی تھیں اور اسوقت اس خالق اعظم کی یہ حالت تھی کہ اگر تم دیکھتے تو کہتے کہ واقعی آج اس میں طفلانہ مزاجی بالکل نہیں

پائی جاتی۔ پھر جو کچھ اس نے کہا وہ وہ تھا جسے "مادہ اور مادی" کہتے ہیں۔

پھر آغازِ حیات کا زمانہ آیا۔ گھاس اُگی، درختوں کے کلّے پھوٹے، چڑیاں، چوپائے اور مچھلیاں نمودار ہوئیں، کسی نے گھونسلے بنائے، کوئی پانی کی تہ میں چلا گیا اور کسی نے منتشر ہو کر دنیا میں اپنی نسل پھیلانی شروع کی۔

عمریں گذر گئیں یہانتک کہ آخر کار ایک دن اُس نے آدمی بنایا۔ اس وقت تک خدا کچھ تو سائنس داں تھا اور کچھ انجنیر۔ لیکن اب وہ ایک "ادبی صنّاع" ہو گیا۔

اب اس نے انسانی روح کی تہوں کو کہانیوں کے ذریعہ سے کھولنا شروع کیا، جانور سوتے تھے، کھاتے تھے، بچے پیدا کرتے تھے، لیکن انسان جن حالات سے گذر رہا تھا وہ یکسر افسانہ خیز تھے۔ جذبات کا تصادُم۔ فرد و جماعت کی گتھیاں۔ جسم و روح کی جنگ —— دریا نام ہے پانی کے بہاؤ کا۔ لیکن انسان سیلاب ہے کہانیوں کا۔

جب دو آدمی ملتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے:۔ "کیا خبر ہے۔ پھر کیا ہوا؟" ان سوالوں کے جوابات کا ایک جال ساری دنیا پر بچھا ہوا ہے۔ یہی ہے زندگی کا افسانہ اور یہی ہر انسان کی تاریخ۔

انسان نمونہ ہے آرٹ کا۔ اس کی تعمیر میں نہ ترکیب مکانکی پر زور دیا گیا ہے نہ اخلاق پر، بلکہ صرف تخیّل و تخئیل پر۔ اس کے ہواخواہ اس صداقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن صداقت اس پردہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔

آخر کار انسان کے معلّم و رہبر اخلاق اور انسان کی افسانہ پسندی کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے ملکر نہیں رہ سکتے اور نتیجہ یہ ہے کہ خرافات کا ایک دفتر بے پایاں ڈھیر ہوتا جا رہا ہے۔ (ٹگور)

باب الاستفسار

مسیح علم و تحقیق کی روشنی میں

بہ سلسلۂ سابق

اوسیریز اور آئیسس کے متعلق روایت یہ ہے کہ سورج دیوتا رع کے نطفہ اور آسمان کی دیوی نوط کے بطن سے ایک دیوتا پیدا ہوا جس کا نام اوسیریز خداوند نور تھا۔ ایک دن نوط دیوی دیوتاؤں کے ایلچی ثوث (THOTH) سے اختلاط کر بیٹھی۔ جس سے ایک حسین و جمیل دختر آئیسس (ISIS) پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں بعد آسمان کی پرشوقین دیوی سیب (SEB) دیوتا یعنی زحل سے وابستہ ہو گئی۔ جس کے نطفہ سے سیت (SET) یعنی خداوند ظلمت پیدا ہوا۔ اوسیریز اور آئیسس دونوں ایک دوسرے کے دلدادہ تھے جس سے سیت سخت برافروختہ ہوا اور اس نے اوسیریز کو دغا سے قید کر لیا اور ایک سربمہر صندوق میں رکھکر دریا میں پھنکوا دیا۔[1] فرقت کی ماری حرمان نصیب آئیسس اپنے معشوق اوسیریز کو ہر طرف ڈھونڈھتی پھرتی تھی کچھ عرصہ بعد اسے معلوم ہوا کہ لاش کا صندوق دریائے نیل میں بہتا ہوا سمندر میں چلا گیا اور وہاں موجوں نے تھپیڑے دیکر ساحل شام پر بمقام بائبلوس پہونچا دیا ہے۔ صندوق جا کر ایک درخت میں لگا جو اس کی برکت سے اسقدر پھلا پھولا اور پھیلا کہ وہاں کے بادشاہ نے اسے پسند کر کے کٹوا دیا اور اپنے محل میں ستون بنوا کر نصب کرا لیا۔ آئیسس دیوی لاش کی تلاش میں بائبلوس پہونچی اور وہاں سے بدقت تمام لاش کا صندوق اور ستون لے کر مصر واپس آئی۔ اسطرح مصر اور بائبلوس کا تعلق پیدا ہوا۔

ایک روایت پلوٹارک نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک روز آئیسس دیوی اوسیریز کی لاش پر لیٹ گئی جس سے ہوروس (HORUS) پیدا ہوا۔ ایک دن آئیسس اپنے لڑکے ہوروس کو تلاش کرنے گئی تو سیت نے جسے لاش کا

---

[1] غالباً یہیں سے موسیٰ کو دریائے نیل میں پھینکے جانے کی روایت لی گئی ہے۔

پتہ چلگیا تھا لاش جو الی تھی اور اس کے چودہ ٹکڑے کرکے سب کو ادھر ادھر پھکوا دیا۔ آئیسس نے لاش کے ٹکڑے بڑی محنت سے تلاش کیے اور سب سے بڑے دیوتا راع نے رحم کھاکر اوسیریز کو زندہ کر دیا اور اسے پاتال کا بادشاہ بنا دیا۔ اسطرح مصری دیوتا اوسیریز مرکر زندہ ہوا۔

یہ روایت نہ صرف ہر مصری بچہ کی زبان پر جاری تھی بلکہ ہر سال نہایت شان و شوکت کے ساتھ اسکا ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ماہ نومبر میں جو مصر میں فصل ربیع کی تخم ریزی کا وقت ہوتا ہے سبقام سائیس (SAIS) رسم ادا ہوتی تھی۔ اول تو چار دن تک اوسیریز کی موت پر خوب ماتم کیا جاتا تھا پھر تین دن بعد پجاری لوگ ایک طلائی صندوق لے کر دریا پر جاتے صندوق میں پانی ڈالتے اور پھر نعرہ ہائے مسرت و شادمانی بلند ہوتے کہ اوسیریز مل گیا ہے۔ بہر حال اس کے معنی خواہ کچھ ہوں لیکن بظاہر ہے کہ اہل مصر زمانہ لاعلوم سے ایک مصیبت زدہ مقتول اور پھر زندہ ہونے والے دیوتا سے بخوبی واقف تھے۔

ایران قدیم ہم نے ابھی تک ایران کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہی وہ سلطنت تھی جو بابل۔ آشور یہ اور مصر کے زوال کے بعد اس وقت کی تمام متمدن دنیا پر غالب آگئی تھی۔ اور اس کا مذہب مدائن (PERSIPOLIS) سے لیکر جزائر برطانیہ تک اسوقت پھیلا ہوا تھا جبکہ دین علیسوی نہایت ہی کمزور و ضعیف حالت میں پایا جاتا تھا۔

ان دنوں ایران کا مذہب مترائیت (MITHRAISM) تھا جو دین علیسوی سے بہت پہلے کا مذہب تھا اس مذہب کا عقیدہ تھا کہ گناہوں سے نجات دلانیوالی ایک ہستی ہے جو بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی اس دیوتا کی ولادت موسم کے وسط میں (یعنی دسمبر کے آخری ہفتہ میں پیدائش یسوع کی طرح) ایک غار کے اندر ہوئی۔ مترائیت کے مندر تارک الدنیا لوگوں سے معمور رہتے تھے۔ جہاں ہر سال معتقدین کے سامنے یہی تقریب ہوا کرتی تھی یعنی دین مسیحی سے صدیوں پیشتر ہر سال یہ ڈرامہ ہوتا تھا کہ مترا (MTHRA) دیوتا نے جان دیکر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ دیا اور پھر جی اٹھا (یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے) اس کی ہر سال خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

پادری فرمکیس میٹرنس ( ) نے اپنی کتاب "اغلاط مذاہب باطلہ" (PROFANE RELIGIONS ERRORS OF) کے باب ۲۲ میں اس تقریب کا حال اسطرح بیان کیا ہے:۔ "ناواقف میں ایک خاص رات مقرر کرکے ایک بت ارتھی پر رکھا جاتا ہے۔ جسکا مذہبی جلوس کیساتھ ماتم کرتے ہیں۔ جب اس مصنوعی نوحہ زاری اور ماتم سے انکا دل بھر جاتا ہے تو پھر ایک روشنی اندر لائی جاتی ہے۔ اس کے بعد تمام ماتم گساروں کے منھ پر ایک پجاری تیل چپڑتا ہے اور آہستہ آہستہ یوں کہتا جاتا ہے:۔

"اے مرکر زندہ ہو جانیوالے دیوتا کے پرستارو! خوشیاں مناؤ کیونکہ اب تمھیں تمھارے غم و الم سے نجات ملگئی ہے"

یونان قدیم قدیم یونانیوں میں بھی اس قسم کی بہت سی روایات پائی جاتی تھیں۔

قدیم یونانیوں کا خدائے عظیم ذیوس (ZEUS) تھا اور جس طرح ہندوستان کا مہادیو کیلاش پربت پر رہتا ہے۔ اسی طرح قدیم یونان کا یہ خدا کوہ اولمپس پر رہتا تھا۔ ذیوس کی بیوی کا نام ہیرا دیوی تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی محبوبہ تھی جس کا نام دمیتر (DEMETER) (یعنی دیوتاؤں کی ماتا دیوا تری) - دمیتر کے بطن سے ایک حسین و جمیل لڑکی پرسیفونی (PERSEPHONE) پیدا ہوئی جس کا دوسرا نام کوڑے یا کوڑا (KORA) بھی تھا جس کے معنی "لڑکی" کے ہیں (پنجابی زبان میں لڑکی کو کوڑی کڑی - یا کڑیا کہنا کہیں اسی واقعہ سے تو تعلق نہیں رکھتا) پاتال کا راجہ پلوٹو (PLUTO) یعنی جمراج اس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ سنگدل اور رحیم و کریم ذیوس کو اس کی حالت پر رحم آیا اسلیے اس نے پلوٹو کو صلاح دی کہ چونکہ لڑکی کی ماں دمیتر دیوی اپنی بیٹی کو پاتال جانیکی ہرگز اجازت نہ دیگی اس لیے بہتر ہوگا کہ کسی روز جب تمھاری معشوقہ پرسیفونی چمنستان خلد میں سیر کو آئے تو تم اسے اڑا لے جاؤ۔ پلوٹو نے ایسا ہی کیا لڑکی کی ماں دمیتر دیوی کو جب صاحبزادی کی گمشدگی کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کی تلاش میں روتی اور دنیا بھر کی خاک چھانتی پھری (اسی طرح آئیسس دیوی اوسیریز کو، اشتار دیوی تموز دیوتا کو اور یہودی عورتیں یسوع ناصری کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں) بالآخر اسے معلوم ہوگیا کہ پرسیفونی کہاں ہے۔ اسکے بعد اس نے ذیوس کی منت سماجت کی کہ اس کی لڑکی واپس دلائی جائے۔ ذیوس نے رحم کھا کر پلوٹو کو حکم دیا کہ وہ پرسیفونی کو واپس کردے۔ پلوٹو نے بادل ناخواستہ منظور کر لیا لیکن جانے کی اجازت دینے سے پہلے پلوٹو نے پرسیفونی کو ترغیب دی کہ وہ ایک انار کھالے (یونانی روایات کے مطابق انار کھانے کا مطلب یہ تھا کہ پرسیفونی انار کھاکر پاتال کی مستقل باشندہ ہوجائے)۔ بہرحال آپس میں یہ مفاہمت ہوگئی کہ پرسیفونی چار ماہ تک اپنے عاشق پلوٹو کے پاس پاتال میں گذارے - اور بقیہ آٹھ ماہ اپنی والدہ دمیتر دیوی کے پاس رہے۔

قدیم یونان کی دوسری روایت اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اسطرح ہی کہ خداوند ذیوس (آسمانی خدا یا باپ) کی طبیعت ایک حسین و جمیل دوشیزہ لڑکی سمیلہ (SEMELE) پر مائل ہوگئی۔ دونوں میں اختلاط ہوا تو اس کنواری ماں کے پیٹ سے ایک سلوط کا (دیوتا) پیدا ہوا جس کا نام ڈیونی سوس (DIONUSUS) تھا۔ لیکن ذیوس کی بیوی ہیرا دیوی کو جب اپنے شوہر سمیلہ کی عشقبازیوں اور استقرار حمل کا حال معلوم ہوا تو سخت برافروختہ ہوئی۔ اور اس نے چاہا کہ اس بچہ کو ضائع کردے۔ اس لیے کنواری ماں سمیلہ کو بحالت سفر دردزہ شروع ہوا تو اسے ایک غار کے اندر چھپکر بچہ جننا پڑا۔ اور اس کے بعد بھی ہیرا کے خوف سے اس نوزائیدہ بچے کو خفیہ خفیہ کسی دوسری جگہ بھیجدیا (آجکل یہی صورت ولادت یسوع ناصری کی بیان کی جاتی ہے۔) مگر ہیرا دیوی نے دوسرے طریقہ سے انتقام لیا۔ یعنی وہ جوش سے بھری ہوئی بالحالت جنون عین عالم شباب میں اس لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد وہ نوجوان دنیا بھر میں گھومتا پھرا (واضح ہو کہ مسیح کے معنی بھی زمین کی

بیان کرنیوالا ہیں۔) وہ صاحب معجزہ ہوگیا۔ دریاؤں اور جھیلوں کو پیدل عبور کر جاتا تھا۔ اور اس کے پاؤں خشک رہتے تھے۔ اسی قسم کے اور معجزات بھی وہ دکھاتا تھا (یہی باتیں یسوع سے منسوب کی جاتی ہیں۔)
ڈیونی سوس دیوتا وگو یہ خصوصیات کا مالک تھا ایک تو وہ ہر جگہ تہذیب تمدن پھیلاتا تھا۔ دوسرے جہاں جہاں وہ پہونچتا تھا وہاں شراب کباب اور سیہ مستیوں کا دور دورہ شروع ہوجاتا تھا۔ (یسوع کی امت بھی آجکل یہی فرض ادا کررہی ہے)

اس ڈیونی سوس دیوتا کا کیا حشر ہوا اسکی نسبت دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ پاتال میں اترا اور وہاں سے اپنی ماں سمیلہ کو نکال لایا۔ اور پھر اسے ساتھ لے کر آسمان پر چڑھ گیا دوسری روایت یہ ہے کہ اسے ٹائٹن (TITON) لوگوں نے پارہ پارہ کردیا تھا۔ لیکن اسے پھر دیوتاؤں نے زندہ کردیا اور وہ آسمان پر چلا گیا (یسوع کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے)

جب ڈیونی سوس دیوتا کی ولادت کا تہوار منایا جاتا تھا تو اسے ایک خوبصورت اور پیارے بچے کی صورت میں دکھایا جاتا تھا۔ اور اس کی ماں سمیلہ بھی اس کے پاس ہوتی تھی (رومن کیتھولک گرجاؤں میں بھی کنواری مریم اور مسیح بچے کی ایسی ہی خوبصورت تصویریں ہوتی ہیں۔)

یونان قدیم کی تیسری عجیب کہانی ہرکلیس (HERCULUS) سے یسوع کے پیدا ہونے اور آسمان پر چڑھنے کے قصہ کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔

ہرکلیس بھی بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جس کا نام القمینہ (ALCEMENE) تھا جس کی ہرچند شادی ہوچکی تھی لیکن کوئی منت ماں لینے کی وجہ سے وہ ہنوز اپنے شوہر کے پاس نہیں گئی تھی (بعینہ یہی حالت یسوع کی ماں مریم کی تھی وہ بھی یوسف نجار سے منسوب ہوچکی تھی لیکن منت ماننے کی وجہ سے بیت المقدس کی خدمت کیا کرتی تھی اور ابھی تک سسرال نہیں گئی تھی) بہرحال مسماۃ القمینہ سے حالت دوشیزگی میں خداوند ذیوس نے ملاقات کی۔ یا یوں سمجھیے کہ قادر مطلق خدا کی قدرت نے اس دوشیزہ عورت پر اپنا پرتو ڈالا اور حمل ٹھہر گیا۔ (بالکل یہی فسانہ ولادت یسوع کے متعلق بیان کیا جاتا ہے)
ذیوس کی بیوی ہیرا کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئی اور اس نے ارادہ کیا کہ اس بچے کو قتل کر ڈالے۔ اس لیے القمینہ نے کسی پوشیدہ جگہ جاکر وہ بچہ جنا اور اسے چھپا دیا۔ (یسوع ناصری کی ولادت بھی اسی طرح خفیہ طور پر ایک غار کے اندر ہونا بیان کی جاتی ہے) ذیوس نے اپنی بیوی ہیرا کو سمجھا بجھاکر راضی کرلیا۔ اور اس نے اس شرط پر کہ اگر وہ لڑکا جوان ہوکر اس کی بارہ شرطیں پوری کردیگا تو وہ اس کی جان نہیں لے گی مفاہمت کرلی۔ اس کے بعد ہفتخوان رستم و اسفندیار کیطرح ہرکلیس نے بعض کارنامے

عظیم انجام دیے جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں لیکن ہم کو ہرقلیس کے انجام سے خاص تعلق ہے یعنی یہ کہ اسکی بیوی نے اسے زہر دیدیا۔ ہرقلیس نے ایک بڑی چتا بنائی۔ اور اسمیں بیٹھ کر ایک چرواہے سے کہا کہ وہ آگ لگادے۔ اس کے بعد آسمان سے ایک ابر اترا اور ہرقلیس کے شاگردوں نے دیکھا کہ وہ اس ابر میں بیٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا۔

اسی طرح صدیوں بعد فلسطین میں بنی اسرائیل کی ایک کنواری لڑکی کے بطن سے خفیہ طور پر غار کے اندر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جو بہت سے معجزہ دکھاتا ہے زہر دینے کے بجائے اسے صلیب دیجاتی ہے۔ وہ چتا پر بیٹھنے کے بجائے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہے جہاں ایک لکّہ ابر نمودار ہوتا ہے اور اسے اٹھالے جاتا ہے۔ اور وہ آسمان پر غائب ہوجاتا ہے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاعمال جلد نمبر ۱ باب نمبر ۹) یسوع ناصری کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کردیا کرتا تھا۔ لیکن حکیم اسقلیوس ( ) یونانی نے اتنے مردے زندہ کردیے تھے کہ خداوند ذیوس نے اس کو اس خیال سے مار ڈالا کہ کہیں تمام فانی انسان موت سے نہ بچ جائیں۔ اس کے بعد ذیوس نے اسقلیوس کو پھر زندہ کردیا اور دیوتاؤں میں رہنے کے لیے اسے آسمان پر اٹھالے گیا۔ (یسوع ناصری کا قصہ بھی بالکل ویسا ہی ہے۔)

الغرض جس زمانہ میں مسیحیت نے جنم لیا اسمیں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کے یہاں کسی دیوتا کی پر اسرار ولادت افسوسناک موت، احیاء ثانیہ و رفع الی السماء کا قصہ موجود نہ ہو۔ اور یونانیوں میں ہرقلیس کا قصہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ الغرض دنیا کی حالت یہ تھی کہ دفعتاً ایک جوشیلا اور زمانہ شناس یہودی مسمّی پولوس ساکن شہر طارسوس اٹھا اور اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ وہ یونانیوں سے کہتا ہے کہ ایک خدا کا بیٹا۔ کنواری لڑکی کے پیٹ سے پراسرار طور پر پیدا ہونیوالا خدا، چند سال ہوئے ملک یہودیہ میں ظہور پذیر ہوا۔ اس نے محیر العقل معجزے دکھائے۔ لوگوں نے اسے صلیب دیکر مار ڈالا۔ مگر وہ مرکر پھر زندہ ہوگیا۔ اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے لکّہ ابر میں بیٹھ کر اپنے باپ کے پاس آسمان پر چلا گیا۔ یونانیوں کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ انھوں نے ہرقلیس کی طرح اس افسانہ کو بھی سنا اور قبول کرلیا

یسوع کی طرح سے بہت سے دیوتا کنواریوں کے پیٹ سے پراسرار طور پر غاروں میں پیدا ہوچکے تھے۔ جس طرح یسوع ناصری پانی پر چلتے تھے اور ایک مرتبہ سواری کے لیے دو گدھے بھی طلب کیے تھے۔ اسی طرح صدیوں پیشتر یونانیوں کا دیوتا دیونیسوس پانی پر چلتا تھا۔ اور اس نے بھی ایک مرتبہ دریا کو عبور کرتے ہوئے دو گدھوں میں سے ایک طلب کیا تھا جو اسے سوار کرکے خشکی کی طرح

دریا کو عبور کر لیا تھا۔
یسوع کے احیاء ثانیہ کی کہانی بھی دیگر ہمسایہ مذاہب سے لے گئی ہے جس طرح ان کے دیوتا پاتال میں اتر گئے تھے اسی طرح یسوع بھی تین روز تک قبر میں رہے جس طرح ان دیوتاؤں کی موت پر گریہ وزاری کی گئی اسیطرح یسوع کی موت پر عورتوں نے ماتم کیا اب رہا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا۔ بادل میں سوار ہوتا اور آسمان پر چلا جاتا سو یہ قصہ لفظ بلفظ ہرقلیس یونانی کی روایات سے لیا گیا ہے

مرکز زندہ ہونیکا اصلی مطلب اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ناظرین کرام کو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس ملک میں بھی دین عیسوی پہنچا وہاں کسی کے مرکر زندہ ہونیکا عقیدہ ایک عام بات تھی مرکر زندہ ہونیو الا عموماً کوئی دیوتا ہوتا تھا۔ تمام سرزمین عراق میں کلدانیوں کے شہر اُور سے لیکر یروشلم تک اس دیوتا کا نام تموز تھا۔ فلسطین کے شمالی علاقہ اور اس سے بھی شمالی علاقوں میں اس دیوتا کو آتیس کہتے تھے۔ ایشیائے کوچک اور تمام فینیقی دنیا میں اس دیوتا کا نام ایڈونیس تھا اور ایرانی دنیا میں بھی دیوتا مترا کہلاتا تھا۔ اور ملک مصر میں اس دیوتا کو اوسیریز کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسکا حریف سیت تھا جسے لوگ ملک الظلمات اور خداوند شر کہتے تھے۔
دیوتاؤں کے مرکر دوبارہ زندہ ہونیکے متعلق جسقدر روایات اور خرافیات ہم نے درج کیے ہیں وہ دراصل تمثیلی قصے ہیں۔ جس کا اصلی مطلب نور و ظلمت اور خیر و شر کی ابدی جنگ ہے۔ جو دیوتا ہر سال مرکر زندہ ہوتا تھا وہ دراصل سورج ہے۔ جو موسم سرما میں مرجاتا ہے۔ یعنی خط استوا سے جانب جنوب یا پاتال کو چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہی دیوتا فصل بہار میں زندہ ہو جاتا ہے یعنی آفتاب خط استوا سے جانب شمال رجوع کرتا ہے۔ حیات و ممات کا دوسرا مطلب زمین کی قوت نمو کا سالانہ مرنا اور فصل بہار میں پھر عود کر آنا ہے۔
اسوقت ہمارے سامنے دو باتیں زیر غور ہیں یعنی آفتاب کا عروج و زوال اور اس کے ساتھ قوت نمو کی کمی زیادتی۔ بعض اقوام پر ان دونوں میں سے ایک نے بمقابلہ دوسری کے زیادہ اثر کیا مثلاً ایرانی دیوتا مترا کی موت و حیات ثانیہ صاف طور پر "شمسی روایت" ہے اور دیمیتر اور اس کی بیٹی کی کہانی صاف طور پر زمین کی قوت نمو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح تموز۔ فائیکلہ۔ آتیس کی روایات بھی صاف ہیں اوسیریز مصری خود سورج دیوتا تھا۔ اب غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ان مختلف دیوتاؤں کے تہوار مختلف ممالک میں مختلف مہینوں میں کیوں منائے جاتے تھے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ قدرت کی کارفرمائیاں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی شمالی ملک یا مرتفع معتدل ملک کا

رہنے والا ہے۔ اسکے لیے سورج کا زوال جس کے باعث جاڑے کی شدت ہوجاتی ہے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو لوگ جنوب میں رہتے ہیں ان کے لیے زوال آفتاب کسیقدر راحت بخش ہے اور سال کے زیادہ حصہ میں نباتات کا مردہ رہکر فصل بہار میں دفعتًا پھولوں کا نکلنا اور اناج کا پیدا ہونا انکے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا ہمکو یہاں دونوں قسم کی روایات کا مرکب قصہ ملتا ہے اور چونکہ مختلف ممالک میں بہار اور برسات کا موسم مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف ممالک میں یہ تہوار باوقات مختلف منائے جاتے تھے۔

یسوع ناصری کی اصلیت ہم اس سے قبل یہ بیان کرچکے ہیں کہ فی زمانا بہت سے فلسفی ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو یسوع ناصری کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ اور دیوتاؤں کے مرکر زندہ ہونے اور آسمان پر چلے جانےکی روایات پر جو استدلال ہم نے کیا ہے اس سے یقینًا یسوع کا وجود ہی غائب ہوجاتا ہے مگر اس "دیوتا نژاد" یسوع کا وجود غائب ہوتا ہے جسے عیسائی خدا مانتے ہیں جس کی سوانح عمری اناجیل اربع میں لکھی ہے۔ اگر کسی یسوع ناصری کا دنیا میں وجود تھا تو وہ کوئی دوسرا انسان تھا۔

قبل اس کے کہ حقیقت یسوع پر مزید بحث کریں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یسوع سے بیشتر بھی دنیا میں زہد واتقا۔ تجرد ورہبانیت تقوی و پرہیزگاری۔ اور نفس کشی کا مذہب ومشرب موجود تھا۔ یہی باعث تھا کہ ملک یہودیہ میں یسوع ناصری سے بھی پیشتر ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جو ترک دنیا اور رزادیہ نشینی کے ساتھ زہد وریاضت اور تجرد کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اس فرقہ کا نام عیسینی (ESSENE) تھا (ممکن ہے اسی سے لفظ عیسیٰ اور عیسائی نکلا ہوا) زوال بابل کے بعد جب یہودیوں پر ایرانیوں کا اثر پڑا تو غالبًا اس وقت یہ فرقہ پیدا ہوا تھا۔ ایرانی مذہب میں پاکیزگی اور صفائی پر سخت زور دیا جاتا ہے۔ اور یسوع ناصری سے یقینًا پیشتر مذہب بودیت (BUDHA) ملک یہودیہ میں ہوچکیا تھا۔ جس کا یہودیوں اور یونانیوں اور بعد ازاں عیسائیوں پر بہت اثر پڑا تھا۔ الغرض یسوع مسیح سے زمانہ میں فلسطین کی سرحد پر ان عیسینی راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں اور اس فرقہ کے بہت سے آدمی شہروں میں بھی رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مورخ جوزفیس ( ) نے اپنی کتاب "تحاریہ یہود" جلد دوم باب ہشتم صفحات ۲ لغایت ۱۴ میں اس فرقہ کا حسب ذیل حال درج کیا ہے۔

"یہ عیسینی فرقہ عیش وعشرت کو گناہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا ہے۔ صبر وضبط تجرد ورہبانیت اور نفس پر غلبہ حاصل کرنے کو نیکی سمجھتا ہے۔ یہ لوگ شادی نہیں کرتے۔۔۔۔ لیکن شادی بیاہ کے فوائد سے وہ منکر بھی

نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سے بقائے نسل انسانی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ یہ لوگ مال و دولت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور
ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بمقابلہ دوسرے ہم مشرب کے زیادہ دولتمند ہو۔ یہ لوگ کسی خاص شہر میں
نہیں رہتے بلکہ ہر شہر میں رہتے ہیں اور جب کبھی ان کا کوئی ہم مشرب کسی دوسرے شہر سے مہمان
آتا ہے تو جو کچھ میزبان کے پاس ہوتا ہے وہ سب پیش کر دیتا ہے گویا وہ اسی کا مال ہے۔۔۔۔ اسی
وجہ سے یہ لوگ سفر میں اپنے ساتھ کچھ بھی لیکر نہیں نکلتے۔ خواہ انکو کتنا ہی طویل سفر درپیش ہو جو کپڑا انکے
تن پر یا جوتہ انکے پاؤں میں ہوتا ہے وہ جبتک پھٹ نہ جائے بدلا نہیں جاتا۔ یہ لوگ آپس میں خرید
و فروخت نہیں کرتے بلکہ ہر شخص کے پاس جو چیز ہوتی ہے اُس سے حسب ضرورت دوسرا شخص کام لے سکتا ہے
یہ لوگ بہت سادہ غذا کھاتے ہیں۔ کئی کئی بار غسل کرتے ہیں۔ محنت سے جان نہیں چراتے اور نماز
و دعا میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے وفادار ہوتے ہیں، جو بات ایک بار اپنی زبان سے کہدیتے
ہیں اس سے کبھی نہیں ٹلتے۔ لیکن یہ لوگ قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اسے برا سمجھتے ہیں جب
کوئی نیا شخص اس فرقہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے دو سال تک امیدواری کرنا پڑتی ہے
پھر اسے اصطباغ دیکر دو سال تک مزید امتحان لیا جاتا ہے اس کے بعد مرید کیا جاتا ہے۔ اور
قبل اس کے کہ نئے آدمی کو وہ اپنے دسترخوان پر بٹھائیں یا کھانے کو ہاتھ لگانے دیں وہ اس شخص سے
سخت حلف لیتے ہیں کہ ———— (۱) میں خدا سے ڈرونگا۔ اسمیں کسی کو شریک
نہ کرونگا۔ یعنی حقوق اللہ پوری طرح سے ادا کرونگا۔ (۲) آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ نیکی اور انصاف سے
پیش آؤنگا۔ یعنی حقوق العباد ادا کروں گا (۳) کسی شخص کو خود اپنے دل سے یا کسی دوسرے کے
کہنے سے ہرگز نقصان نہیں پہچاؤنگا (۴) بدوں سے ہمیشہ نفرت اور نیکوں کی اعانت کرونگا (۵) ہر
شخص سے محبت و وفاداری سے پیش آؤنگا۔ خصوصاً ارباب حل وعقد کی ہمیشہ اطاعت کروں گا۔
کیونکہ بغیر تائید ایزدی کے کسی شخص کو حکومت نصیب نہیں ہوتی (۶) اگر میں خود صاحب الامر
ہونگا تو میں اپنے اختیارات سے ہرگز کوئی خلاف کام نہ کرونگا (۷) ہمیشہ سچائی سے محبت کرونگا (۸)
جھوٹ بولنے والوں کی ہمیشہ تادیب کرونگا (۹) اپنا ہاتھ چوری سے اور اپنی روح کو ناجائز خواہشوں سے
پاک رکھوں گا۔

مندرجہ بالا تعلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یسوع کی تعلیم نے انہیں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔
جو طور طریق اور جو مشغلہ ان عیسینی راہبوں کا بتایا گیا ہے وہی زندگی اور وہی مشغلہ یسوع ناصری
کا تھا۔ دولت سے نفرت، عصمت و طہارت، تجرد و رہبانیت، غریبوں کی مدد، محبت بنی نوع انسان

وغیرہ وغیرہ بھی تعلیم یسوع نے دی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ اس فرقہ کا ایک شخص آزادانہ روح رکھتا ہے، لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ خدا کی حکومت قریب ہے۔ یعنی قیامت آنیوالی ہے۔ جبکہ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے۔ اس لئے گناہوں سے توبہ کرو۔ مجھے خدا نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ تو یہ شخص یقیناً یسوع ناصری تھا۔ یسوع ناصری بھی لوگوں کو قسمیں کھانے سے منع کرتا تھا۔

الغرض حقیقت مسیح یہ ہے کہ شہر ناصرہ کے رہنے والے ایک شخص یوسف نجار کا ایک بیٹا یسوع نامی بچپن ہی میں فرقہ عیسینی کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں سے یسوع نے ترک لذات، نفس کشی، نفرت کرنا سیکھا۔ ہمیشہ ایک لبادہ پہنے ہوئے قلندرانہ طور پر زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نہ کوئی مقررہ گھر تھا نہ ٹھکانا۔ وہ کبھی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ لوگوں سے اسے اس قدر محبت تھی کہ وہ بیماروں کا علاج کرتا تھا۔ اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا دوسروں کو دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتا تھا۔

اس یسوع کی طبیعت کسی قدر جوشیلی واقع ہوئی تھی۔ عیسینی فرقہ کے راہب اگرچہ رسمی قربانیوں سے انکار کرتے تھے لیکن یسوع ایسی رسموں سے سخت متنفر تھا۔ اس نے ان یہودیوں کے خلاف وعظ وتلقین کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اسے خود دولت سے نفرت تھی۔ اسلئے وہ بعض اوقات دولتمندوں کے خلاف بھی زہر اگلنے لگا تھا اور چونکہ وعظ ونصیحت سے اسے کسی فائدہ کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے ایسے بیغرض شخص کی باتیں سننے کے لئے مجمع کثیر جمع ہو جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو قرب قیامت سے ڈرا کر ان میں متقیانہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اپنی روحوں کو یوم الحساب کے لئے تیار کرو۔ ممکن ہو کہ اپنی نفس کشی اور زہد وتقوے کی بنا پر وہ خود کو خدا کا بیٹا بھی کہہ بیٹھا ہو۔ اور یہی بہانہ لوگوں کو اسے سزا دینے کا ہاتھ آیا۔ یہودیوں نے اسے ستانا شروع کر دیا۔ اس لئے وہ رمتے جوگی کی طرح فلسطین سے غائب ہو گیا۔ نہ اسے کسی نے صلیب پر چڑھایا نہ کسی نے قتل کیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک صحیح تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اناجیل اربع کی کہانیاں تصنیف کرکے اس متقی وپرہیزگار ناصح مشفق کو خدا کا بیٹا بلکہ خدا بنا دیا۔ اور اسکے سوانح حیات طلسم ہوشربا کے افسانے بنا دئے گئے۔

اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس تحقیق کے بعد بھی ایک مسلمان اس بات کا قائل رہیگا کہ قرآن میں مسیح کے حالات وہی ہیں جو انجیل میں بیان کئے گئے ہیں
یاد ہوگی سال ماسبق کے نگار میں یہ عرض کئے تھے
نیاز

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۸)

بہرحال اس دورِ نامرادی میں یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے - کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا - اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیندہ کے لئے ہمارا "لائحہ عمل" کیا ہونا چاہیئے - سو اس کا جواب تم مولویوں سے نہ چاہو جو تبلیغ کے نام سے نہایت ہی غیر مصلحانہ فضا پیدا کر رہے ہیں - نہ اُن مدعیان ترقی و اصلاح سے جو تنظیم کانفرنس وغیرہ کی مضرت رساں تحریک سے حکومت کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں - اس کا جواب خود اپنے آپ سے چاہو، اس جذبۂ انسانیت سے طلب کرو جو سب سے پہلے انسان کو رشتۂ وطنیت سے والبستہ کرتا ہے -

مذہب اور مذہبیت کا دور ختم ہو گیا، اب صرف زمانہ وطن پرستی کا ہے - اس لئے اگر مسلمان اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ کر ملک کی دوسری قوموں سے مل جانا چاہیئے اور ہر اس تحریک میں پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے جو ملک کی ترقی و آزادی کی ضامن ہے - مذہب بالکل ذاتی و انفرادی اطمینان کا نام ہے، اس لئے اسکو ہیئت اجتماعی کی بنیاد نہ بناؤ اور اس کو استخوان جنگ قرار نہ دو کہ مذہب کی گزشتہ تاریخ پہلے ہی بہت کافی خون سے رنگین نظر آتی ہے اور اس میں اب کسی اور خونیں اضافہ کی ضرورت نہیں -

---

ماہ مارچ کے بعد سے جب ہم نے بہ سلسلۂ ملاحظات گاندھی ارون مفاہمت کی پیشنگوئی کی تھی - بہت سے واقعات و حالات ملک میں ایسے رونما ہوئے کہ ان پر رائے زنی ضروری معلوم ہوتی ہے -

مہاتما گاندھی نے جس حسنِ تدبیر و خوش سلیقگی کے ساتھ سابق والسرائے (لارڈ ارون) سے گفتگو کر کے ملک کے اضطراب میں تبدیلی پیدا کی، اس کا اعتراف اُن دشمنوں کو بھی ہے جو سرزمین ہند سے باہر، یہاں کے مسائل کو نہایت غیر متاثرانہ انداز سے دیکھنے کے عادی ہیں اور غالباً تاریخ برطانیۂ ہند کا یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ اس نے ملک کی کسی جماعت سے اس انداز سے صلح کی ہو کہ اگر کوئی چاہے تو اُسے مغلوبیت سے بھی تعبیر کر سکتی ہے - بہرحال یہ فتح کانگرس کی ہو یا برطانیہ کی مصلحت اندیشی و صلح کوشی کی، یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں کیجا سکتی کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس کی تمام گھما گھمی، اکابر ہند کی جملہ فصاحتیں اور بلاغتیں جو ولایت میں صرف کی گئیں، اسوقت تک کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکیں، جب تک ہندوستان کے اس ضعیف و نزار شخص کی مدد نہ چاہی گئی - جس کو مقیدر کھتے ہوئے، ولایت کی اُس تاریخی کانفرنس کی کامیابی کا خواب ملک کے ہر گوشہ میں دیکھا جا رہا تھا - حقیقتاً گاندھی کی عظیم الشان

شخصیت کی یہ اتنی بڑی فتح ہے کہ مشکل ہی سے اس کی کوئی دوسری نظیر مل سکتی ہے

جن شرائط پر یہ صلح طے پائی تھی، ان کی توثیق کے لئے ضرورت تھی کہ کانگرس کا اجلاس جلد سے جلد منعقد کیا جائے، اور غالباً اس سے زیادہ اہل کانگرس کی زندگی اور قوت عمل کا ثبوت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ گاندھی ارون مصالحت کے تقریباً بیس دن کے اندر ہی کراچی میں چالیس پچاس ہزار نفوس کا اجتماع ہو گیا۔

ہر چند مہاتما گاندھی نے یہ صلح جمعیت عاملہ کے مشورہ سے کی تھی، لیکن اس کا یقین کامل نہیں تھا کہ کانگرس کے کھلے اجلاس میں آسانی کے ساتھ شرائط صلح کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور اس اندیشہ کو بھگت سنگھ کے قصاص نے اور زیادہ قوی بنا دیا۔ چنانچہ جو خدشہ تھا وہ ظاہر ہو کر رہا۔ اور ایک جماعت ایسی رونما ہو گئی جو صلح کے شرائط پر راضی نہ تھی اور اس نے مہاتما گاندھی کا خیر مقدم کراچی میں سیاہ جھنڈوں کو بیک کے نعروں سے کیا اور انسانی خون کا بھرا ہوا پیالہ اُن کے سامنے پیش کر کے انتہائی بیزاری کا اظہار کیا۔ لیکن اس کوہ راسخ اور آہنی عزم والے انسان نے جس کا نام گاندھی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی مایوسی کو راہ نہ دی اور آخر کار یہاں بھی فضا کے بادل چھٹ کر رہے اور کانگرس کے کھلے اجلاس نے شرائط صلح پر توثیق ثبت کر دی۔

لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ کراچی میں آزادی ملک کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ دہلی میں بدنصیب مسلمانوں کے بعض ناعاقبت اندیش افراد آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے آزادی کی قبر کھودنے میں مصروف تھے، حریت کا جنازہ نکالنے کی طیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں کیا کیا۔ اس کی داستان گو طویل ہے لیکن جدید نہیں ہے، وہی مطالبات کا رونا، وہی دریدہ حکومت کی کاسہ لیسی اور وہی بزدلی و کم ہمتی جو ہمیشہ اس رجعت پسند جماعت نے ظاہر کی۔ کراچی سے مہاتما گاندھی کو بھی شرکت کی دعوت دی اور جب انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہدیا کہ میں ہر اس مطالبہ کے ماننے کے لئے تیار ہوں۔ جس کو مسلمان متفقہ طور پر پیش کریں، تو ان کے تمام جوش و خروش پر اوس پڑ گئی اور یہاں سے نکلکر بمبئی وغیرہ میں پھر وہی کائیں کائیں شروع کر دی جو اس جماعت کی قدیم بزدلانہ عادت ہے۔

یقیناً بنارس اور خصوصیت کے ساتھ کانپور کے فسادنے اس جماعت کی امیدوں کو تھوڑے دنوں کے لئے اور زندہ کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ ملک کی جس آبادی نے یہ فساد برپا کیا وہ سخت ملامت کے قابل ہے۔ لیکن کیا یہ واقعات ملک کا صحیح نصب العین بدل سکتے ہیں، کیا ہم چند درندوں کی وحشیانہ حرکات سے متاثر ہو کر آزادی ملک کے حصول سے باز رہ سکتے ہیں۔ جب

کسی ملک میں انقلاب رونما ہونے لگتا ہے تو ضعیف ترین عناصر کو بھی ایک بار خروش میں آنے کا موقعہ ملجاتا ہے اس لئے اس نوع کے ہنگامے قابل افسوس ضرور ہیں، لیکن ہمکو منزل مقصود سے تو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت میں ہمارا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس نوع کے اختلافات سے بالکل بے نیاز انہ گزر جائیں۔ اور جلد سے جلد اس سررشتہ کو اپنے ہاتھ میں لیلیں جو ہمیشہ کے لئے اس اختلاف و تصادم کو مٹا دینے والا ہے۔ لیکن ہمارے بعض ناعاقبت اندیش اکابر نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر نہایت سخت مکروہ و مسموم قسم کا پروپاگنڈا شروع کر دیا جو اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دینے والا ہے۔

یہ حضرات ان واقعات کو اس امر کی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اگر مخلوط انتخاب تسلیم کر لیا گیا تو ہندوؤں کی اکثریت ہمیشہ مسلمانوں کو اسی طرح تباہ و برباد کرتی رہیگی۔ اور ان کی تمام مذہبی و معاشرتی آزادیاں چھن جائیں گی۔ حالانکہ اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو ہندو مسلم اتحاد کی صورت اگر کوئی نظر آسکتی ہے تو وہ صرف مخلوط انتخاب ہے۔

اب سے تقریباً ایک ربع صدی قبل جب منٹو مارلے رفارم ہندوستان کو مرحمت نہ ہوا تھا یہاں جداگانہ انتخاب کا خیال تک کسی کے ذہن میں بھی نہ تھا اور اُسوقت کی فضا جیسی صلح کوش اور امن پرور تھی کسی سے مخفی نہیں۔ نہ باہم قربانی پر کہیں جھگڑا ہوتا تھا، نہ مسجد، و مندر کے سامنے باجہ و ناقوس پر کوئی نزاع ہوتی تھی، ہر فریق نہایت امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن جب جدید رفارم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے وفد کو شملہ بلاکر ان کے کان میں جداگانہ انتخاب کا افسوں پھونکا گیا، تو دفعتاً صورت حال بدل گئی اور پھر گزشتہ بیس سال کی تاریخ ہند اُٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ فساد و ہنگامہ اسی زمانہ میں ہوا اور ہندو مسلمانوں کے درمیان باہم اختلاف و عصبیت پیدا ہونے کا دور یہی تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اقلیت کے لئے مخصوص و متعین نشستیں طے کر دی گئی ہیں تو مخلوط انتخاب سے کیوں خوف کھایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے جتنی جگہیں مقرر ہیں وہ انھیں سے پُر کی جائیگی اور مخلوط انتخاب انمیں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا فائدہ جو ملک کو پہونچے گا وہ یہ ہو کہ ہر ہندو اور ہر مسلمان باہمدگر تعلقات صلح و آشتی قائم کرنے پر مجبور ہوگا، کیونکہ نہ کوئی ہندو بغیر مسلمانوں کی رائے کے ممبر منتخب ہو سکیگا۔ اور نہ کوئی مسلمان بغیر ہندو آرا کے۔ اسطرح گویا دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور معاشری، مذہبی، تمدنی جذبات کا احترام کرنے پر مجبور رہونگی اور رفتہ رفتہ وطنیت کی وہ صحیح روح پیدا ہو جائیگی، جس کو اس وقت تک جداگانہ انتخاب کی لعنت نے فنا کر رکھا تھا۔

جداگانہ انتخاب کی سب سے بڑی مضرت جس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یہ ہو کہ جب ہر فریق

کے رائے دہندگان جدا جدا ہونگے تو ہر ممبر اپنی جماعت کے سامنے اسباب تفوق میں سب سے زیادہ جس استحقاق کو نمایاں کریگا وہ فریق ثانی کی مخالفت ہوگی، یعنی ایک مسلمان صرف اس دلیل کی بنا پر کثرت رائے حاصل کرے گا کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی پوری حمایت کرے گا اور اسی طرح ایک ہندو صرف اس حجت پر نامزد کیا جائیگا کہ وہ مسلمانوں کو اُبھرنے نہ دیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں جماعتوں کے صرف وہی افراد نامزد ہونگے جو حد درجہ متعصب اور فرقہ وارانہ جذبات رکھنے والے ہیں اور اس طرح ملک میں رفتہ رفتہ ایسا اختلاف و انشقاق پیدا ہو جائیگا کہ ایک لمحہ بھی امن و سکون کا ملنا دشوار ہو جائے گا۔ برخلاف اسکے مخلوط انتخاب ہمیں مجبور کریگا کہ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور تدریجاً وہ ذہنیت محو ہو جائے جو "ہندو چاء" اور "مسلمان پانی" کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔

ایک شبہ مخلوط انتخاب کے مخالفین کا یہ بھی ہے کہ اس صورت میں جو مسلمان نامزد ہونگے وہ ہندوؤں کی کثرت رائے کی وجہ سے وہی ہونگے جو ہندوؤں کا ساتھ دیں۔ اول تو یہ الزام ایسا ہے جو بجائے ہندوؤں کے خود اپنے ہی افراد پر قائم ہوتا ہے اور خود ہمیں اپنے آپ سے اس باب میں شرم کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ وہ کون سے ایسے مسائل ہیں جن کے طے کرنے کے لئے ہمکو نہایت سخت کٹر قسم کے مسلمان ممبروں کی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ کونسل میں اکثر مسائل وہ ہونگے جن میں ہندو و مسلم مفاد مشترک ہوگا۔ اگر پانچ فی صدی ایسے مسائل پیش بھی ہوئے جنکا تعلق خالص مذہب سے ہے تو کیا کسی مسلمان کی طرف سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب کے خلاف کوشش کریگا۔ خواہ وہ ہندوؤں ہی کی کثرت آراء سے کیوں نہ منتخب ہوا ہو۔ پھر اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر یو۔ پی کے مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے اس امر کا اندیشہ کرتے ہیں تو کیا پنجاب، بنگال، سندھ، اور سرحد کے ہندوؤں کو یہ اندیشہ نہ پیدا ہوگا اور کیا ہندو مسلمان دونوں کے لئے یہ قدرتی تحفظ پہلے سے موجود نہیں ہے۔ اگر یو پی کے ہندو یہاں کے مسلمانوں کے حقوق پامال کرینگے کیا تو انھیں یہ خوف نہ ہوگا کہ اسکی پاداش میں پنجاب وغیرہ کے ہندوؤں کے حقوق اسی طرح تلف کئے جا سکتے ہیں۔

الغرض میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ مخلوط انتخاب سے مسلمانوں کو کیوں مخالف ہونا چاہیئے۔ اور جداگانہ انتخاب میں ان کے لئے کیا نفع ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اندیشہ مسلمانوں میں کس رکیک و ادنےٰ ذہنیت کے ماتحت پیدا ہوا ہے اور اُنکے مستقبل کو کس درجہ تاریک اور پُر از خوف بنا دینے والا ہے تو میرے سامنے اسی جماعت کے وہ پُر جوش اقوال و مواعظ سامنے آجاتے ہیں۔ جب وہ اپنی قوم کے دس افراد کو بھی فریق مخالف کے ہزار نفوس پر بھاری ظاہر کرتے تھے۔

کیا دنیا میں کوئی قوت ایسی ہو سکتی ہے جو کہ ۷ کروڑ نفوس کو تباہ و برباد کردے، کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش پورے جوش وطنیت کے ساتھ آمادۂ کار ہو جائیں۔ اور وہ

سارے ملک پر نہ چھا جائیں، حیرت ہے کہ مسلمانوں کی عزت و خودداری کیا ہوئی، ان کی شجاعت و بسالت کی روایات کیونکر محو ہو گئیں اور وہ کیوں اسقدر بزدل و ذلیل ہو گئے ہیں، کہ اپنی نجات صرف جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے چاہتے ہیں، جسکی بنیاد ہی خوف و تذبذب، کم ہمتی اور جبن پر قائم ہوتی ہے۔

ہمکو معلوم ہے کہ جو جماعت آجکل مسلمانوں میں اس تحریک کو قوی کر رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی بدخواہ ہو بلکہ حکومت کی طرفدار ہے اور محض اغراض ذاتی و نفسانی کی بنا پر ملک و قوم کو تباہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی ہے۔

یہ وقت وہ ہے کہ مسلمانوں کو صرف یہ درس دینا چاہیئے کہ

شیر شو شیرانہ، در صحرائے شیریں پائی نہ

تاکہ وہ دوسری بیدار قوموں کے ساتھ زندہ رہنے کے اہلیت پیدا کر سکیں، لیکن ہمارے بعض ناعاقبت اندیش اور خود غرض اکابر یہ درس دے رہے ہیں کہ نجات صرف اسی میں ہے کہ حکومت کے ہات کو قوی بنایا جائے اور حکومت ہی سے طلب امن و نجات کیجائے۔ درآنحالیکہ کانپور کے ہنگامہ نے اس خواب کی تعبیر کو بھی جن الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ بہت کچھ درس عبرت اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔

جداگانہ انتخاب والوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندو افراد بہت زیادہ عصبیت سے کام لیتے ہیں۔ اور جن محکموں میں وہ پہونچ جاتے ہیں، وہاں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک ہونے لگتا ہے۔ اس لئے آئندہ مخلوط انتخاب کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع قائم کی جاسکتی ہے۔ اول تو اس دلیل کے دونوں اجزاء میں باہم کوئی ربط نہیں اگر وہ عصبیت سے کام لیتے ہیں تو مخلوط انتخاب کیوں مضر ثابت ہو گا، بلکہ وہ تو مفید ثابت ہو گا کیونکہ ہندو بھی مسلمان آرار کے محتاج ہوں گے اور مجبوراً ان کو اپنی عصبیت ترک کرنا پڑے گی۔ علاوہ اس کے یوں بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہندو عصبیت اسی وقت سے پیدا ہوئی ہے جب سے منٹو مارلے اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جداگانہ حق انتخاب پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اختلاف کے اصل سبب کو تو قائم رکھا جائے اور اس کے دور کرنے کی بھی خواہش کیجائے۔

حال ہی میں جو جلسہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں میں بھی شریک تھا، متفقہ طور پر مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اسی پر آخیر وقت تک قائم رہنا چاہیئے۔

بعض مخالفین جماعتوں کی طرف سے جو پروپاگنڈا کیا جا رہا ہے وہ سخت غیر دانشمندانہ ہے اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینے، یا اس پر عمل کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیئے۔

جب تک ہندوستان کی آبادی قائم ہے۔ ہندو مسلمانوں کو باہم ملکر یہیں زندگی بسر کرنا ہے

اور وہ مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور صلح و آشتی کے ساتھ برادرانہ سلوک کو روا رکھیں۔ اس لئے نہ یہ عارض ہنگامے قابل لحاظ ہیں اور نہ ایسی تحریکیں جو نفاق و اختلاف کی پرورش کرنیوالی ہیں۔ اُن کو بھی آخر کار مٹ کر رہنا ہے اور اِن کو بھی فنا ہو جانا۔ اس لئے آپ آج ہی وہ کام کیوں نہ کریں۔ جسے کل مجبوراً اختیار کرنا ہے۔

"ہنگامۂ کانپور"

اسقدر بیداد، اتنا ظلم، ایسا قتلِ عام — خواب آزادی کی یہ تعبیر! اے ہندی غلام
کاش دُنیا اژدہا بن کر چبا لیتی تجھے — آسماں سے برق گرتی اور جلا دیتی تجھے

ننگ ہے اقدامِ عالم کے لئے تیرا وجود — موت سے بدتر، تری خوابیدہ ہستی کی نمود!
جانتا ہے قلعۂ ظلمات کو قصرِ ضیا — سمِّ قاتل پر گمانِ بادۂ نابِ بقا

آہ، بیجرم و خطا بچوں کی یہ چیخیں نہیں — ترے قدموں پر نہیں مظلوم ماؤں کی جبیں
خاک خوں میں یہ نہیں غلطاں شہیدانِ ستم — روئے گردوں پر نہیں یہ تیرہ تر گردِ الم

خونِ انسانی کی یہ موجیں نہیں، اے بد شعار — جن سے تو نے دامنِ گیتی کیا ہے داغدار
سُن کہ ہر ذرے سے اُٹھتی ہے صدائے الاماں — ہیں یہ آزادی کی ظالم! حشر پرور سسکیاں

عقل کے دشمن، رہینِ جہل، معمورِ جنوں — کر رہا ہے اپنے ہاتھوں آپ آزادی کا خون
اُڑ رہی ہیں جامۂ قومی کی پیہم دھجیاں — تو کہاں، نادان! اور پیکارِ آزادی کہاں!

ہر قدم، وحشت خرامی، کج نگاہی، خودسری — اس قدر گمراہیوں پہ نازشِ منزل رسی
دوسری اقوام چھیڑیں نغمۂ شانِ وطن — اور تُو ہو مجرمِ خونِ عزیزانِ وطن

اس کمالِ بزدلی پر خواہشِ فتحِ مبیں — بھائیوں کے خون سے رنگیں ہے تیری آستیں
کسکا شکوہ، دہر میں جب آپ تو پامال ہے — تجھ سے کیوں دُنیا کو ہمدردی ہو، گر حال ہے

تو اور آزادی کے ایوانِ گرامی کیلئے
تو بنا ہے حلقۂ دامِ غلامی کیلئے

علی اختر

جھوٹ اور سچ کا مناظرہ

چاہا جو جھوٹ نے کہ کروں سچ کو لاجواب
کہنے لگا کہ آج کہاں ہے مرا جواب

ذرہ سے آفتاب تلک راج ہے مرا
دیکھو جسے جہان میں محتاج ہے مرا

امکاں مری کمندِ رسا میں اسیر ہے
عالم مرے وجود سے رونق پذیر ہے

اس انجمن میں اہلِ سخن کی زبان ہوں
ایمان واعظوں کا حسینوں کی جان ہوں

بازارِ زندگی میں مرا فیض عام ہے
کاریگروں کو شام و سحر مجھ سے کام ہے

کس مولوی کے واسطے روزی رساں نہیں
کس نکتہ رس وکیل کا زورِ بیاں نہیں

سلطاں مری مدد سے رعیت فریب ہے
مزدور مجھ سے واقفِ اوج و نشیب ہے

بزمِ حیات میں مرے جلوے ہزار ہیں
میں ایک جنس، نام مرے بے شمار ہیں

طرزِ عمل کہیں ہوں کہیں ہوں طریقِ کار
الہام ہوں کہیں کہیں پیغامِ کردگار

دینِ مبیں کہیں، کہیں مذہب ہے میرا نام
مہر و وفا کہیں، کہیں الفت ہے میرا نام

پیرانِ خانقاہ کا ارشاد ہوں کہیں
عطار اور طبیب کا استاد ہوں کہیں

معشوق کی زبان کا پیغام ہوں کبھی
عاشق کی جانِ زار کا آرام ہوں کبھی

کرتا ہوں اک نگاہ سے روباہ کو پلنگ
پاتا ہوں فتح جنگ میں بے تیغ و بے تفنگ

قانون میرے بحر کی موجِ رواں ہے ایک
تاریخ میرے دشت کی جوئے رواں ہے ایک

میری ہی چاشنی سے فسانے ہیں دلپسند
مجھ سے ہی پُر اثر ہے سخنور کا بند بند

ملتا نہیں نشان مرا کس دیار میں
دنیا کا خشک و تر ہے مرے اختیار میں

تو ہے کہ جانتا ہی نہیں دوستی ہے کیا
غم سے کسی غریب کی جاں پر بنی ہے کیا

افعی ہے تو عقاب ہے شاہیں ہے سر بسر
تیرا لباس خون سے رنگیں ہے سر بسر

شمشیر زن ہے تو کبھی مذہب کے نام پر
خنجر بکف کبھی ہے حلال و حرام پر

انصاف کے لباس میں جنگ آزما کبھی — اخلاق کے جنوں میں غضب آشنا کبھی
رحمت تری زباں نہیں ہے تیغ دو دم کا نام — رکھا ہے تونے حق کی حمایت ستم کا نام
مجرم کی بے بسی پہ نہیں اشکبار تو — ناصح تو ہے نہیں ہے مگر غمگسار تو
تعزیر سے کسی کو بچایا بھی ہے کبھی — تونے کسی کا عیب چھپایا بھی ہے کبھی
کوئی ستم نصیب ترا مدح خواں نہیں — تیری زباں پہ دار و رسن ہے اماں نہیں
شر سے قریب لطف و مروت سے دور ہے — ہر روز تیرے واسطے یوم النشور ہے
تیرے جلو میں آگ ہے آب بقا نہیں — تیرے عمل میں قہر ہے لطف و عطا نہیں
تیرے سبب سے طوق و رسن کا رواج ہے — گر تو نہ ہو تو جیل کی کیا احتیاج ہے

ساری زمیں ہے تیری عنایت سے لالہ گوں
دنیا میں تیرے نام پہ بہتا ہے کتنا خوں

یہ بات سن کے سچ نے کہا اے شریر جھوٹ — اتنا نہ سر اٹھا تہ گردوں حقیر جھوٹ
یہ کیا کہا کہ کوئی مرا قدرداں نہیں — دوزخ سے کم نہیں وہ زمیں میں جہاں نہیں
میں روح کائنات ہوں تو ایک مشت گل — بزدل ترے غلام مرے دوست شیر دل
رہتا نہیں ہے تیری امانت میں ایک تار — دنیا میں کس غریب کو ہے تجھ پہ اعتبار
اس کو کبھی جہاں میں نہ دیکھا فروغ پہ — جس کام کی اساس ہے کذب و دروغ پہ
کاریگروں نے لی جو مدد تجھ سے ایک بار — پھر عمر بھر چلا نہ کبھی ان کا کاروبار
عسرت کا بیج دہر میں بوتا ہے اور کون — تجار کے جہاز ڈبوتا ہے اور کون
تیرے سبب سے دامن آفاق ہے سیاہ — پلتا ہے تیری گود میں ہر جرم ہر گناہ
دنیا میں باعث ستم و جور کون ہے — زندانیوں میں تیرے سوا اور کون ہے
عزت اسی کی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے — کیا اس کا احترام کہ جھوٹا کہیں جسے
تجھ سے تو اضطراب میں ہے پیر زال بھی — بچتا نہیں ہے تجھ سے یتیموں کا مال بھی
جس شعر یا خیال کی تو نے رکھی بناء — فطرت کے ذوق نے اسے اچھا نہیں کہا
دنیا میں مولوی کبھی ہوتا نہ کامگار — کرتا نہ گر تجھے مرے پردہ میں آشکار
کچھ روز کے لئے ہے وہاں تیرا احترام — جس جا گیا ہے پہلے تجھے دیکے میرا نام
گر ہے تو میرے بھیس میں اہل حشم ہے تو — کیا اپنے نام سے بھی کہیں محترم ہے تو

کب ہے کسی کے وعدہ پہ عاشق کو اعتماد
یعنی کسی کے وعدہ پہ ہوتا جو اعتبار
زیرِ فلک ہوا و ہوس میں ہے تو اسیر
ہوتا ہے جب جہاں میں تیرا فریب عام
تیرے ستم سے امنِ جہاں میں خلل ہو جب

تجھ کو نہیں ہے حضرتِ غالب کا قول یاد
فرطِ خوشی سے مر گئے ہوتے وفا شعار
پیدا ہوئے ہیں تیرے ہی دم سے تفنگ و تیر
مجبور ہو کے تیغ کو کرتا ہوں بے نیام
ہر سمت شش جہات میں تیرا عمل ہو جب

اُس وقت میں تفنگ سے خنجر سے نار سے
کرتا ہوں ہمکنار جہاں کو بہار سے

اصغر حسین خاں نظیر لودہیانوی

محبّت کی شام!

(۱)

جبرِ دنیائے تمنّا پر کئے بیٹھا ہوں میں !
حسرتوں کے داغ — پہلو میں لئے بیٹھا ہوں میں !
نامرادی! — خون کے آنسو پئے بیٹھا ہوں میں !
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۲)

وہ فریبِ غمزہ ہائے حُسنِ بے پروا کہاں ؟
وہ طلسمِ انتظارِ وعدۂ فردا — کہاں ؟
میری دنیا اب "نیازِ عشق کی دنیا — کہاں ؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۳)

اب کہاں ؟ وہ محشرِ امید و بیمِ آرزو !
اب کہاں ؟ جذبات کو بیتابیوں کی جستجو !
اب تو میں ہوں، اور گریباں کے لئے شغلِ رفو !
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۴)

التفاتِ حُسنِ ہرجائی کو — مدت ہو چکی !
حسرتوں کی محفل آرائی کو — مدت ہو چکی !
داغِ الفت — تیری رسوائی کو مدت ہو چکی !!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۵)

آہ! وہ آغازِ الفت کا زمانہ ـــــ اب کہاں؟
اور انجامِ محبت کا فسانہ ـــــ اب کہاں؟
وہ "محبت"! وہ "محبت کا بہانہ"!! اب کہاں؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۶)

شعلہ ہائے شمع ہستی میں تپش باقی نہیں!
کائناتِ دل کو ارمانِ خلش ـــــ باقی نہیں!
"درد" میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۷)

منظرِ بربادیٔ دُنیائے الفت! یاد ہے!
کسطرح سے ہو گیا تھا خونِ حسرت! یاد ہے!!
یاد ہے ـــــ وہ اُن کا "انکارِ محبت"! یاد ہے!!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۸)

روح افسردہ ہے ـــــ ارمانِ محبت کی طرح!
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے، پیمانِ محبت کی طرح!
جی رہا ہوں! اک پشیمانِ محبت کی طرح!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

روش صدیقی

تیتری

اے حسن کی شانِ اجتماعی   پروردۂ صد بہارِ خوبی
نقاش کی صنعتِ مکمل   اے پیکرِ جنبشِ مسلسل،
یہ نقش ہیں پروں پہ تیرے   جیسے کوئی حور مسکرا دے
بے باک چمن میں گھومتی ہے   پھولوں کے لبوں کو چومتی ہے
یہ بادِ صبا کے نرم جھونکے   فردوس کے کھل گئے دریچے
ایسے میں ترے پروں کی جنبش   ہوتی ہے بجلیوں کی بارش
پھرتی ہے چمن کی ہر روش پر   شبنم سے بدن بچا بچا کر
اللہ رے ترا غرورِ کافر   رکھتی نہیں پاؤں بھی زمیں پر
شفاف بدن۔ لباس رنگیں   اُس پر یہ ترا خرامِ رنگیں
اِک پیکرِ حسن رنگ و بو ہے   یا بابہمہ آب و تاب تو ہے
بدمست شمیم ہو نہ جانا   دامن میں گلوں کے سو نہ جانا

منظور حسین ماہر انصاری

دردِ زندگی

(۱)

یہ مانا رازِ ہستی فہم انسانی سے باہر ہے   تو آخر میرے دردِ زندگی کی ہو دوا کیونکر؟
مگر بھولے سے بھی درماں نہ دنیا سے طلب کرنا   مجازی، یاد رکھ، ایسی دوا سے درد ہی بہتر!

(۲)

گر تجھ کو میں چاہوں، اے دنیا، تو تیری مری سب جھگڑے ہیں   گر تجھ کو میں چھوڑوں، اے دنیا، تو چھوڑ کے تجھکو جاؤں کدھر؟
ہے تیری خمیر سے یہ فطرت، فطرت نے مجھے مجبور کیا   ہستی ہی نہ ہوتی کاش مری، یا تو ہی نہ ہوتی فتنہ گر!!

مجازی لکھنوی

میکشانِ فطرت

شراب ناب تجلی کے پینے والے ہیں!
وہ رند ہم ہیں مہ و مہر جنکے پیالے ہیں

ہمارے حلق میں گرتی ہے تک انجم سے
ہمارے عیش کے سامان ہی نرالے ہیں

خزاں کے نام سے ناآشنا ہے جنکی بہار
ہمارے سامنے شام و سحر کے لالے ہیں

ستارہ صبح کا رقصاں ہے جنکو سن سن کر
رباب دل ہی کے وہ پرسرور نالے ہیں

ہمیں زمان و مکاں کی ہے ماہیت معلوم
کہ ہم جہانِ تخیل کے رہنے والے ہیں

خودی کا نام نہ لو، ماسوا کو رہنے دو،
برب کعبہ یہ بت سب ہمیں نے ڈھالے ہیں

نگاہ اپنی ہے انجامِ خندۂ گل پر
ابھی چمن کا تبسم ہمیں سنبھالے ہیں

امین حزیں

غزل ضیا مانک پوری

ہر چند خطرۂ ستم باغباں نہیں — لیکن یہ جانتا ہوں قفس آشیاں نہیں
سو اضطراب پر بھی ہوں مجبورِ خامشی — اللہ کیا ہمارے دہن میں زباں نہیں
اک دورِ کشمکش تھا جو آخر گزر گیا — اب یاد قصۂ قفس و آشیاں نہیں

بسم اللہ

نگار

جلد (۱۹) فہرست مضامین ماہ جون ۱۹۳۱ء شمار (۶)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۹) جون سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۶)

ملاحظات

نگار کی گزشتہ دس سال کی تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی زمانہ ایسا سخت آیا ہو، جیسا اب گزر رہا ہے۔ دنیا کی اقتصادی دشواریاں، جنھوں نے شاہ سے لے کر گدا تک سب کو یکساں طور پر مضطرب کر رکھا ہے، نگار کے سامنے بھی ہیں، اور میں پریشان ہوں کہ اگر ناظرین نگار نے احساس فرض شناسی سے کام نہ لیا تو تنہا مجھ سے کیا ہوگا۔ میں آپ سے سوائے اس کے کوئی اعانت نہیں چاہتا، کہ اپنے حلقۂ احباب میں زیادہ نہیں تو کم از کم ایک خریدار ضرور پیدا کیجئے۔ یہ صورت ایسی ہے کہ آپ پر اس کا کوئی بار بھی نہ ہوگا اور نگار کی موجودہ مالی دشواریاں بڑی حد تک دور ہو جائیں گی۔

نگار اس نوع کی اپیل کرنے کا عادی نہیں ہے اور اس نے ہمیشہ اس قسم کی التجاؤں سے احتراز کیا۔ لیکن اب کہ ملک کی موجودہ تجارتی و اقتصادی دشواریاں ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی ہیں، میں مجبور ہوں کہ ناظرین کرام کو ان کے اُس فرض کی طرف متوجہ کروں جس کے ادا کرنے کا یہی وقت ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ فرمائی تو میں کیونکر اس کشاکش کا مقابلہ کر سکوں گا۔

یہ رسالہ انیسویں جلد کا خاتم رسالہ ہے اور آئندہ ماہ سے بیسویں جلد کا آغاز ہوتا ہے
اکثر اور بعض کے درمیان ایک حصہ ناظرین نگار کا ایسا ہے جن کا چندہ اس ماہ کے رسالہ کے
ساتھ ختم ہو جاتا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی خریداری کو بدستور جاری رکھیں، کیونکہ جولائی کے رسالہ
میں فراست التحریر کا دوسرا حصہ (جو انگریزی سواد خط سے متعلق ہے) تمام و کمال شائع کیا جائے گا۔ اردو
فراست التحریر کا حصہ جنوری میں دیا جا چکا ہے اور اب جولائی میں دوسرا حصہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ جس کے
معنی یہ ہیں کہ اگر آپ نے خریداری کا سلسلہ بدستور قائم رکھا تو پوری کتاب آپکو مفت حاصل ہو جائیگی۔

وہ جدید حضرات جو جنوری کے بعد سے خریدار ہوئے ہیں اُن کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی ہے
کہ جنوری میں جو حصہ فراست التحریر کا شائع ہوا ہے، وہ آٹھ آنے میں اُن کو فراہم کر دیا جائے۔ سوائے
اس کے فی الحال کوئی اور صورت اس مفید و دلچسپ کتاب کے حاصل کرنے کی نہیں ہے۔

نگار کے اول سال اشاعت میں طامس مور کی مشہور مثنوی لالہ رخ کا ترجمہ بالاقساط شائع
ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ ادیب شہیر جناب لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی نے کیا تھا اور اس قدر مقبول
تھا کہ اُسی زمانہ میں اسکو کتابی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہ ارادہ اسوقت تک تکمیل
کو نہ پہونچ سکا تھا۔ اب یہ کتاب نہایت خوبصورت سائز میں دفتر نگار سے شائع کی جا رہی ہے۔ اور غالباً
۲۲۵ صفحات پر محیط ہے۔

جنھوں نے انگریزی زبان میں اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسکو کسی اور زبان میں
منتقل کرنا کس قدر دشوار امر تھا، لیکن جنھوں نے اسکے ترجمہ کو دیکھا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ اگر طامس اور
لالہ رخ لکھ سکتا تھا، تو اس کا ترجمہ بھی صرف لطیف ہی کر سکتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نزاکت خیال، بلندی مفہوم
پاکیزگی جذبات جوش بیان اور ندرت ادا اس سے زیادہ تکمیل کے ساتھ کہیں اور پائی جا سکتی ہے۔ اس مجموعہ
میں چار فسانے (ابن مقنع۔ بہشت اور پری۔ آتش پرستاران فارس اور نور محل) فرامرز کی زبان سے
شاہزادی لالہ رخ کے سامنے بیان کرائے گئے ہیں اور ہر فسانہ اپنی جگہ شاعری اور آرٹ کا ایسا بے مثل نمونہ
ہے کہ انسان اُس کے مطالعہ کے بعد "کھو جانے" پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ دار الاشاعت نگار نے ایک
مجموعہ میرے اُن افسانوں کا بھی شائع کیا ہے جو سنہ ۲۵ و سنہ ۲۶ و سنہ ۲۷ میں اس نظریہ کے ماتحت شائع
ہوئے تھے کہ ہماری بعض سمجھی ہوئی حقیقتیں "نقاب اُٹھ جانیکے بعد" کیا نظر آتی ہیں۔ اگر جی چاہے تو اس کو بھی
طلب فرما کر ایک نگاہ دیکھ لیجئے، ممکن ہے یہ سودا گراں نظر نہ آئے۔

جس زمانہ میں کانپور کا خونیں ہنگامہ رونما ہوا، میں حیدرآباد میں تھا اور اخبار ملی کے بیانات دیکھ کر سخت متردد تھا کہ دیکھئے یہ فرقہ وارانہ آویزش اس وقت جبکہ ہندوستان کو حصول آزادی کے لئے ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کی ضرورت ہے کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب سب سے آخر میں ٹائمس آف انڈیا نے ایک انگریز کے چشم دید واقعات شائع کئے اور ہندوؤں کے ہاتھ سے مسلمان بچوں اور عورتوں کے سفاکانہ و بہیمانہ ذبح و قتل کے حالات معلوم ہوئے، تو میں رات بھر بے چین رہا اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک شدید جذبہ نفرت و انتقام میرے اندر پیدا ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے میں اس حقیقی مقصود کو بھی بھول گیا جو یقیناً اس نوع کے جذبات سے زیادہ بلند ہے۔

اس کے چند دن بعد جب میں لکھنؤ واپس آیا تو مختلف ذرائع سے واقعی حالات معلوم کرنے کی سعی کرتا رہا اور آخرکار خود بھی کانپور پہونچ کر اُن مقامات و مکانات کو دیکھا جنکی تباہیاں و بربادیاں ناصیۂ انسانیت کا بدترین داغ کہی جا سکتی ہیں۔ میں وہاں مزدوری پیشہ جماعت سے لے کر حکمراں طبقہ کے افراد تک سب سے ملا اور آخرکار اس نتیجہ پر پہونچا کہ کانپور کی داستان خونیں شکل ہی سے کبھی پوری بیان کی جا سکتی ہے اور اس واقعہ نے ملک کی فضا کو جس قدر خراب کر دیا ہے اُس کا مداوا آسان نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں نے قتل و ذبح میں کوئی حصہ نہیں لیا، یقیناً انھوں نے بھی کافی وحشت و درندگی کا ثبوت دیا، مکانوں کو جلایا، مندروں کو توڑا، انسانوں کو ہلاک کیا۔ لیکن معصوم بچوں اور بے دست و پا عورتوں کو انتہائی بیدردی کے ساتھ پارہ پارہ کرنے کا فخر صرف ہندوؤں ہی نے حاصل کیا۔ اور اگر اس ساری داستان میں کوئی ٹکڑا میرے لئے قابل مسرت ہے تو صرف اتنا ہی کہ مسلمانوں نے باوجود انتہائی غیظ و غضب کے کسی ایسی بہیمیت کا ثبوت پیش نہیں کیا جو اُن کی قدیم روایات اخلاق کے خلاف ہو۔ جس طرح بیشمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ اگر کسی ہندو نے الحاح و زاری سے کام لیکر جانبری چاہی تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا یا کچھ روپیہ لے کر اسکو جانے دیا، اسی طرح متعدد ثبوت اس تلخ حقیقت کے بھی مل سکتے ہیں کہ ہندوؤں نے عورتوں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بلا بلا کر، بچوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے اُنکے سروں پر دست شفقت پھیر پھیر کر، ایسی بیدردی کے ساتھ انھیں ہلاک کیا کہ سخت سے سخت قلب انسانی بھی اس کو سننے کے بعد کانپ اٹھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ پھر یہ درندگی صرف شہر ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ بعض دیہات تک پہونچ گئی۔ جہاں عموماً مسلمانوں کی آبادی چند گھروں سے زیادہ نہیں ہوتی، اور یہاں بھی ہندوؤں نے اُسی بے رحمی کے ساتھ اپنی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے بعض مسلمان خاندانوں کو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ذبح کرکے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا۔ یقیناً یہ جنگ تعلیم یا فتہ افراد کی نہ تھی، یہ بھی

برحق ہے کہ دونوں جماعتوں کے مہذب و شائستہ لوگ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے بہت سے برہمنوں اور پجاریوں نے بھی اس میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیا اور مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی شرافت حسب و نسب کا مدعی ہو۔ پھر کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ ایک طرف کے شریف ترین افراد بھی ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور دوسری طرف غیر شریف افراد بھی ایک پناہ چاہنے والے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، خواہ وہ اُن کے کسی عزیز ہی کا خون بہا کر کیوں نہ آیا ہو۔ دنیا اس کو جس نگاہ سے چاہے دیکھے، لیکن میں اس میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ایک عجیب و غریب جھلک امید کی پاتا ہوں اور مسرور ہوں کہ ہنوز اُن کی وہ خصوصیت لطف و رافت جو ایک شجاع قوم میں پائی جانا چاہیئے بدستور باقی ہے۔ پھر اگر آئندہ واقعی ہندوستان میں خانہ جنگی کی نوبت آئی (جسکا مجھے قوی اندیشہ ہے) اور اگر واقعی کسی جنگ میں حقیقی کامیابی اُسی فریق کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی اخلاقی فتحمندی کو دنیا سے تسلیم کرا سکے، تو میں مسلمانوں کی قسمت کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ انکے مقابلہ میں کبھی وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی، جس کی بہادری کا انتہائی کارنامہ عورتوں، بچوں، اور ضعیفوں کو ذبح کر دینا ہو۔

کانپور کے اس دردناک ہنگامہ کی تفصیل فراموش کیجا سکتی ہے، مندروں اور مسجدوں کے واقعات انہدام بھلائے جا سکتے ہیں، آتش زنی اور غارتگری کے واقعات بھی دلوں سے محو ہو سکتے ہیں، لیکن ہندو قوم کی اس داستان شجاعت کو کبھی صفحۂ تاریخ سے نہیں مٹایا جا سکے گا کہ اس نے مسلمان عورتوں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بلایا اور پھر مکان کے اندر بند کر کے ان کے بچوں کو انھیں کے سامنے ذبح کر کے انکو بھی انتہائی بیدردی و شقاوت کے ساتھ تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا، حیران ہوں کہ اگر ایک انسانی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونیوالی جماعت اس نوع کی دناءت و رذالت، اس قسم کا ذلیل کینہ پن، اور اسی طرح کی وحشت و درندگی کا اظہار کر سکتی ہے تو ایک بھیڑیے کی نسل سے پیدا ہونیوالے بچے اور کن خصوصیات کو لیکر پیدا ہوں گے اور دنیا ان دونوں کے درمیان کیونکر خط امتیاز کھینچ سکے گی۔

کانپور میں اس خونریزی کو حکومت نے کیوں جاری رہنے دیا، اس پر بحث کرنا بیکار ہے، کیونکہ دنیا اسکی حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ جستجو کہ ہندو مسلمانوں میں زیادہ اتلاف جان کس فریق کا ہوا، اب کوئی معنی نہیں رکھتی، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں ضرور توجہ کی مستحق ہیں ایک یہ کہ ہندوستان کی تمام ہندو جماعت نے اس واقعہ کو کس نگاہ سے دیکھا اور دوسرے یہ کہ اس ہنگامہ کے صحیح اسباب کیا تھے۔ امر اول کے متعلق مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں نے تو ذبح و قتل میں بیدردی سے کام لیا ہی تھا، لیکن ہندوستان کے

اور ہندوؤں نے بھی اپنی خاموشی وسکوت سے کام لیکر کچھ کم شقاوت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں نے کسی ہندو اخبار یا قائد و رہنما کو اس درندگی پر اظہار ملامت کرتے نہیں دیکھا بلکہ برخلاف اسکے جو بیانات اُدھر سے دئے گئے ہیں اور جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، ان میں حقیقت کو چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ٹھیک جس وقت کانپور میں یہ ہنگامہ برپا ہو رہا تھا۔ کانگرس میں تمام قائدین کا اجتماع ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا لیکن اُنمیں سے کسی نے اس واقعہ کی اہمیت پر اظہار خیال نہیں کیا اور اُن ہندو افراد کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی۔ جنھوں نے اس کمینہ فطرت کا ثبوت دیا۔

اب رہا دوسرا امر جو اس فساد کے اسباب سے متعلق ہے، وہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور اس کا اصل سراغ معلوم کرنے کے لئے ہمکو اب سے ۲۳ سال قبل پہونچنا پڑے گا جب ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کے وفد کو جداگانہ انتخاب کی لعنت کا طوق مرحمت ہوا تھا۔ یہ حکومت کی اتنی زبردست چال تھی کہ نہ اُسوقت مسلمانوں نے اسکو سمجھا اور نہ اب سمجھنے کے لئے طیار ہیں۔ یوں تو بہ ظاہر مسلمانوں کے لئے نہایت امید افزا بات معلوم ہوتی ہے کہ کونسلوں کی نیابت میں اُن کا انتخاب بالکل جداگانہ کر دیا گیا اور اُنکی آبادی کو اس طرح گویا مخصوص اہمیت دی گئی، لیکن یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ رعایت حقیقتاً اسی قسم کی رعایت تھی جو ایک مریض کے لئے اس کو ایک مضر غذا کھانے کی اجازت دیکر روا رکھی جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم جماعتوں میں آہستہ آہستہ باہم اختلاف پیدا ہونے لگا اور عصبیت و فرقہ داری مستحکم ہونے لگی۔ پھر چونکہ ہندوؤں کی جماعت یہاں زیادہ ہے اسلئے انکو زیادہ موقع ستانے کا ملا اور چند ونوں میں عام طور پر مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے عدم رواداری اور عصبیت و تشدد کی شکایت پیدا ہونے لگی۔ ۱۹۰۸ء سے قبل جب جداگانہ انتخاب کا وجود نہ تھا، نہ کبھی ناقوس و اذان پر جھگڑا ہوتا تھا نہ باجہ اور قربانی پر کہیں نزاع ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک کے مفاد دوسرے سے متعلق تھے اور ہر فریق مجبور تھا کہ دوسرے فریق کے ساتھ صلح و آشتی سے کام لے۔

پھر چونکہ کانپور میں ہندوؤں کی جماعت تعداد و اقتصاد ہر لحاظ سے زیادہ قوی ہے، اس لئے یہاں کے مسلمانوں کو زیادہ تکلیفیں پہونچیں اور برابر ۱۲ سال تک وہ انکو برداشت کرتے رہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ابھی اور کتنے عرصہ تک ضبط سے کام لیتے رہتے، اگر اسی دوران میں تنظیم کانفرنس کی ملعون تحریک نے ان کے جذبات کو مشتعل نہ کر دیا ہوتا۔ فساد سے چند دن قبل کانپور کے گلی کوچوں میں اس کانفرنس کے جلوس مسلمانوں کی طرف سے نکالے جاتے تھے اور علانیہ "ہم کفر کی ہستی کو دنیا سے مٹا دینگے" کے نعرے بلند کئے جاتے تھے۔ پھر اس وقت کفر کی تاویل خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں لفظ کفر کے

کے اصطلاحی معنے صرف "ہندویت" کے ہیں اور وہ جماعت جو اس نعرہ کو بلند کرتی تھی وہ یقیناً اس سے ہندوؤں کی جماعت کو مراد لیتی تھی۔ پھر چونکہ کلکتہ، بمبئی کے بعد کانپور ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں کارخانوں کے مزدور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندو مسلمانوں کے درمیان یہاں زیادہ ناگوار صورت اختلاف کی پیدا ہو گئی تھی اور وہی غیر ذمہ دارانہ جوش جو مزدوروں کی جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے، یہاں دونوں جماعتوں میں کافی خطرناک حد تک پہونچ گیا تھا۔ ایک طرف یہ تمام آتش گیر مادہ جمع ہو چکا تھا کہ سوء اتفاق سے بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھایا گیا اور ہندوؤں میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت ہندوؤں نے بھگت سنگھ کی پھانسی کے خلاف مظاہرہ اور ہڑتال کرنے کا ارادہ کیا، ان کا ارادہ براہ راست مسلمانوں پر حملہ کرنے کا نہیں تھا اور وہ صرف اس حد تک تشدد برتنا چاہتے تھے کہ ہڑتال ہر نہج سے کامیاب ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لوگوں کو سائکل سے اتارتے تھے، موٹروں کو روک دیتے تھے۔ ٹراموے کو چلنے سے باز رکھتے تھے، لیکن بعد کو جب یہ خیال عوام میں زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلا تو فرط جوش میں مال روڈ پر انگریزی مال فروخت کرنے والوں کی دوکانوں پر پتھر پھینکے گئے اور بعض فرنگیوں پر حملے بھی کئے گئے۔ ٹھیک یہ وقت تھا کہ اگر مقامی حکومت عسکری قوت سے کام لیکر اس گروہ کو منتشر کر دیتی یا گرفتار کر لیتی تو فساد وہیں کا وہیں ختم ہو جاتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا ایسا کرنا محض اضطراب و بزدلی کا نتیجہ تھا یا کسی اور مصلحت کا، بہرحال سبب جو بھی ہو، عوام کے اس جوش کو بڑھنے دیا گیا۔ اور جب عین اسی عالم غیظ و غضب میں کسی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا ہے تو ہندوؤں کا رُخ مال روڈ اور فرنگی آبادی کی طرف سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور آخر کار وہ آگ جو گزشتہ ۲۲ سال سے دبی ہوئی چلی آ رہی تھی دفعتاً بھڑک اٹھی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جداگانہ انتخاب ہندوستان کے لئے کیا کیا برکتیں اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ ایک انسان کو درندگی کی کس حد تک پہونچا سکتا ہے۔

اس کے بعد کانپور میں کیا ہوا اسکی تفصیل نہایت دردناک ہے، مختصراً یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ تین دن تک مسلسل وہاں سوائے دہشت و بربریت کے کسی کی حکومت نہ تھی اور ایک انسان دوسرے انسان کو اس طرح پھاڑ کر کھاتا رہا گویا جنگل سے بھیڑیوں کی جماعت شہر میں گھس آئی ہے اور سوائے خون پینے کے انھیں اور کوئی مشغلہ ہی نہیں ہے۔

پھر کس قدر حیرتناک امر ہے کہ بنارس میں ہندو مسلم فساد رونما ہوتا ہے، مرزاپور میں بھی آویزش نظر آتی ہے، اور پھر کانپور میں یہ محشر قائم ہوتا ہے، لیکن اب بھی ملک میں بعض ایسے صاحب فہم و تدبیر انسان موجود ہیں جو جداگانہ انتخاب کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں، اگر یہ لوگ ہمارے دوست ہیں

تو خدا ایسے دوستوں سے بچائے اور اگر دشمن ہیں تو خدا ہم پر رحم کرے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔

لکھنؤ میں مسلمانوں کی نشنلسٹ جماعت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے اس قدر مکمل اور اطمینان بخش ہے کہ کسی کو اختلاف ہونا ہی نہ چاہئیے۔ لیکن اس کے بعد بھی بعض لوگ جداگانہ انتخاب کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ جس کے معنے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے اس ریزولیوشن کے مطالبات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ نظام حکومت ملک کے اُن بنیادی و اصولی حقوق سے متعلق ہوگا جو تمام باشندگان ملک کی تہذیب، زبان، رسم خط، پیشہ، فرائض مذہبی اور اقتصادی حالات پر حاوی ہو۔

۲۔ نظام حکومت میں پرسنل لا اور اساسی حقوق کی خاص دفعات کے ذریعہ سے موثر حفاظت کی جائے گی۔

۳۔ ملک کا آئندہ نظام حکومت وفاقی (فیڈرل) ہوگا۔

۴۔ جملہ ملازمتوں پر بہ لحاظ کم از کم معیار قابلیت اسطرح تقرر کیا جائے تاکہ اس سے کوئی فرقہ اپنے تناسب حقوق سے محروم نہ رہے اور ادنےٰ ملازمتوں میں کسی خاص جماعت کو اجارہ حاصل نہ ہو جائے۔

۵۔ سندھ ایک علیحدہ بنایا جائے۔

۶۔ صوبہ سرحد و بلوچستان کا نظام حکومت دیگر صوبجات ہند کی طرح ہو۔

۷۔ مرکزی اور صوبجاتی مجالس مقننہ میں بہ لحاظ تناسب آبادی اقلیت کی نشستوں کی تعیین کر دی جائے اور ان کو یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کر سکیں۔

۸۔ انتخاب مخلوط ہوگا اور ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔

ان تمام دفعات پر غور کرنے کے بعد کون ایسا شخص ہے جو ان کی مخالفت کر سکتا ہے اور اس سے زیادہ تحفظ حقوق کی صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔

ماہ آئندہ میں ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ ان تمام دلائل کو بیان کرینگے جو جداگانہ انتخاب کے حامیوں کی طرف سے بیان کیجاتی ہیں۔ اور ان پر تنقید کر کے بتائیں گے کہ وہ کس حد تک قابل قبول ہیں۔

ہمارے عزیز دوست اور ملک کے مشہور فسانہ نگار حضرت مجنوں گورکھپوری بی۔اے نے ایم۔اے

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۸۸ پر)

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

۴۔ قتل مرتد

میرا دعوےٰ ہے اور یہ دعوےٰ مذاہب و تاریخ کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد کر رہا ہوں کہ دنیا کے کسی قانون و شریعت نے مرتد یا مخالف مذہب کے لئے کوئی جگہ بجز قتل کے نہیں رکھی۔ یہ صرف قرآن تھا جس نے دنیائے مذہب میں سب سے پہلے مذہبی رواداری کا سبق سکھایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے مذہب کا بالکل نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ قرآن ہی کا اثر تھا کہ عبدالملک کے دربار میں یوحنا نحوی دمشقی اور مامون رشید کے دربار میں الکندی اپنے مذہب کی حمایت میں مسلمانوں سے مناظرہ کرتے ہیں اور برملا مسلمانوں کے مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ان کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ اکثر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ارتداد اختیار کیا جس میں سے ایک مثال عبداللہ بن جحش کی ہے جو حبش میں جاکر نصرانی ہو گئے تھے۔ مگر ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اگر قرآن کے بعد کسی قوم نے ان کی تقلید کی ہے تو وہ ہمارے ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ ہے مگر وہ ایک سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی مذہبی امر کے ماتحت۔ ورنہ خود انگلستان میں ابھی سو برس کی بات ہے کہ رومن کیتھولک مذہب پر سختی ہوتی تھی اور اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے ایک شخص کو صرف اس قدر کہہ دینے پر کہ محمدؐ کی شریعت مسیح کے اقوال سے بہتر ہے۔ پھانسی کی سزا دی گئی۔ قرآن کی اسی رواداری کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے جہاں جبر دی سلطنت سالہا سال کی ہے وہاں غیر مذاہب کی تعداد ضرورت سے زیادہ باقی رہ گئی ہے۔ صرف ہندوستان میں دیکھ لو اور اسی کے مقابل اسی ہندوستان میں پرتگال والوں کی کالونی گوا کا حال دیکھو کہ انھوں نے ایک ہندو کو بھی اپنی کمزور محدود سلطنت میں باقی نہ چھوڑا اور جس ہندو نے بپتسمہ لینے سے انکار کیا اس کو سمندر میں غرقابی کا بپتسمہ دیا گیا۔

میں قرآن کی چند آیتیں جا بجا سے نقل کرونگا۔ جن سے قطعی ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کی رو سے ایک شخص اپنے مذہبی اعتقاد کے لئے صرف خدا کا مسئول و جواب دہ ہے اور کسی بندے کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ ایسے لوگوں کو ستائے یا عذاب دے۔ جبتک کہ وہ قوم میں فتنہ و شر کا باعث نہ ہو۔

۱۔ قل یا ایہا الکفرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عبدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔

کہدو اے کفار ہم اسکی عبادت کرتے ہیں جسکی تم عبادت نہیں کرتے اور جسکی تم عبادت کرتے ہو ہم عبادت نہیں کرتے اور نہ جسکی عبادت ہم کیا کرتے ہیں اسکی عبادت تم کیا کرتے ہو۔ ہمارا دین ہمارے لئے ہے اور تمہارا دین تمہارے لئے۔

۲۔ لا یحب اللہ الجہر بالسوء من القول الا من ظلم وکان اللہ سمیعًا علیما۔ ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا۔ (۴ ۱۴۸ / ۱۴۹)

۲۔ اللہ تعالےٰ اسکو پسند نہیں کرتا کہ تقریر بری باتیں کی جایئں۔ مگر وہ لوگ معذور ہیں جن کا دل دکھایا گیا ہو اور اللہ تعالےٰ سننے والا اور جاننے والا ہے اگر تم کوئی نیک کام ظاہر طور سے یا چھپا کر کرو یا اورکسی کے قصور کو معاف کرو تو اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش کی قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا۔ فینبئکم بما کنتم تعملون۔ (۵ - ۱۰۵)

۳۔ اے ایمان لانیوالو۔ تم اپنی خبر لو۔ دوسرونکا بھٹکنا تم کو نقصان نہ پہونچائیگا اگر تم راہ راست پر ہو اور تم سبھوں کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اسوقت جو جو تمہارے اعمال ہونگے تمکو بتادئے جائینگے۔

۴۔ ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیئا۔ فتطردھم فتکون من الظالمین۔ (۶ - ۵۲)

۴۔ اور جو لوگ صبح و شام خدا کی عبادت (اپنے طور پر) کرتے ہیں اور جس انکی غرض خدا کی خوشنودی ہو انکی سرزنش نہ کرو۔ انکے اعمال کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور نہ تمہارے اعمال کی ذمہ داری ان پر ہے اگر تم انکی سرزنش کروگے تو تمہارا اشمار ظالموں میں ہوگا۔

۵۔ وما علی الذین یتقون من حسابھم من شیء ولکن ذکری لعلھم یتقون۔ وذر الذین اتخذوا دینھم لعبا ولھوا وغرتھم الحیوٰۃ الدنیا وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع وان تعدل کل عدل لا یؤخذ منھا اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا لھم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون۔ (۶ - ۶۹ / ۷۰)

۵۔ اور انکے برے کاموں کی ذمہ داری ان پر نہ ہوگی جو نیک ہیں لیکن انکو نصیحت کرنا چاہیئے۔ شاید وہ اپنی برائی سے باز آجاویں۔ اور جن لوگوں نے اپنے مذہب کو ایک کھیل بنا رکھا ہو اور جنکو دنیاوی زندگی نے مغرور کر دیا ہے۔ انکو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ہاں انکو سمجھاؤ الیسا نہ ہو کہ ان کے برے اعمال انکی بربادی کا سبب ہوں۔ کیونکہ سوائے خدا کے انکا کوئی شفیع و وکیل نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے تباہ ہونگے ان کو گرم پانی پینا ہوگا۔ اور اپنے بے ایمانی کیوجہ سے سخت عذاب میں مبتلا ہونگے۔

۶- قل یا قوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار انہ لا یفلح الظالمون (۶-۱۳۶)

کہدو اے قوم تم اپنے مقدور بھر کام کرو اور ہم اپنے مقدور بھر کام کرتے ہیں۔ تم کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں کس کا ٹھکانا اچھا ہے۔ یقیناً ظالموں کے لئے کوئی فلاح نہیں ہے۔

۷- ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ہی احسن ان ربک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وہو اعلم بالمھتدین وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔ (۱۶- $\frac{125}{128}$)

۷- اور خدا کی راہ کی طرف لوگوں کو معقول باتوں اور اچھی نصیحتوں سے بلاؤ۔ اور مناظرہ کرنے میں بہترین روش اختیار کرو۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے کون گمراہ ہوا اور کون راہ راست پر ہے۔ اگر تم برائیوں کا بدلہ لو تو اسی قدر جتنی تم پر زیادتی کی گئی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کا پھل اچھا ہے۔ اور صبر کرو۔ کیونکہ تمہارا صبر خدا کے واسطے ہے اور ان پر افسوس نہ کرو۔ اور ان کے مکروں سے پریشان نہ ہو یقیناً اللہ انکے ساتھ ہے جو برائیوں سے بچتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔

۸- ولا تجادلوا اہل الکتاب الا بالتی ہی احسن الا الذین ظلموا منھم وقولوا آمنا بالذی انزل الینا وانزل الیکم والھنا والھکم واحد ونحن لہ مسلمون۔ (۲۹-۴۶)

۸- اور اہل کتاب سے جھگڑا مت کرو البتہ پسندیدہ طور پر اور ان سے جو زیادتی کریں اور کہو کہ ہم تو اس پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور جو تم پر اترا ہے اور ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہے اور ہم تو مسلمان ہیں۔

۹- لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم۔ (۲-۲۵۶)

۹- اور دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ البتہ راہ راست کج سے ظاہر ہو گئی پس جس نے شیطان سے انحراف کیا اور خدا پر ایمان لایا اس نے نہایت مضبوط گرفت کی جو ٹوٹنے والی نہیں۔ اور اللہ سمیع و علیم ہے۔

شاید معترض اس پر یہ کہے کہ غیر مذہب والوں سے رواداری اور بات ہے اور مرتد کی صورت اور ہے۔ اس کا بھی قرآن سے جواب مل سکتا ہے۔ مدینہ میں بعض یہودی اپنے خبث باطنی سے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یہ کیا کرتے تھے کہ جھوٹ موٹ مسلمان بن جاتے تھے۔ اور تھوڑے دن کے بعد مرتد ہو جاتے تھے۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب اسلام مدینہ میں باقوت و صاحب سیاست تھا۔ کیا کسی ایسے یہودی کو مرتد ہونے کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ اور وہ منافقین کون تھے جو منہ پر کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور پیٹھ پیچھے پیغمبر اور اسلام کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ کیا کوئی منافق اس پاداش میں قتل کیا گیا۔ یاد رہے کہ منافقوں کی جماعت مکہ میں نہ تھی بلکہ مدینہ میں تھی۔ رسول اللہ صلعم ان کے نام اور ان کی حرکتوں کو جانتے تھے لیکن قرآن نے صرف اس قدر کیا کہ سرگروہ منافق پر جب رسول اللہ صلعم

نے نماز پڑھی تو قرآن نے اس رافتِ بیجا کو پسند نہیں کیا۔ زرقانی نے موطا کی شرح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں عیسائی یا یہودی جب مسلمان ہو کر مرتد ہو جاتا تھا تو قتل کیا جاتا تھا۔ لیکن بالکل بے سند اور خلاف واقعہ ہے۔ نہ کوئی مرتد ہوا اور نہ قتل ہوا۔

مگر افسوس کسقدر عبرتناک امر ہے کہ قرآن کے اس طرۂ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین کے دلوں میں بھی رشک وحسد کی آگ بھڑکاتا رہے گا حدیث نے چھین لیا۔ اور ابن عباس کے ایک غیر ذمہ دارانہ قول نے قتل مرتد کی ایک بدعت پیدا کر دی کہ کتنی جانیں اس خطرناک قول کے صدقے فنا ہوئیں۔ کتنے لوگ اسلام ہی سے بدظن ہو گئے۔ کتنوں نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا اور یہ واقعہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ پستی کی ذمہ داری صرف اسی ایک مسئلے پر ہے۔ اگر ایک مجہول حدیث نے کچھ کمی چھوڑی تھی تو اسکی تکمیل فقہ کے ہاتھوں سے ہوئی۔ افغانستان میں ایک مسلمان پر ارتداد کا اتہام لگایا جاتا ہے۔ اور کابل کا قاضی اس پر پہلا پتھر چلاتا ہے۔ لیکن خدائی انتقام کو دیکھو کہ اس کے چند دنوں کے بعد وہ قاضی اور وہ بادشاہ دونوں صفحہ ہستی و تاریخ سے معدوم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ واقعہ سنہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ جبکہ دنیا وحشت و جہالت سے دور ہو چکی ہے۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں جب ترکی پر افغانستان کی سی جہالت کا سایہ تھا۔ وہاں بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک ارمنی جو پہلے مسلمان ہو گیا تھا۔ بعد کو پھر اپنے مذہب پر واپس ہو گیا۔ شیخ الاسلام نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔

سر اسٹریٹفورڈ ریڈکلف اس وقت انگریزی سلطنت کے سفیر ہیں۔ انھوں نے خود قرآن کا مطالعہ کر ڈالا اور جب ان کو قتل مرتد کے جواز میں کوئی آیت نظر نہ آئی تو بڑے خوش ہو کر سلطان کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ یہ اصول اسلام کا نہیں ہے۔ سلطان کو یقین نہ آیا۔ شیخ الاسلام سے دریافت کیا گیا۔ اول تو انھوں نے بڑے شد و مد سے انکار کیا کہ قرآن کا حکم یہی ہے۔ لیکن جب ان پر اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو کہا کہ قرآن مذہب اسلام کے لئے کافی نہیں۔ حدیث و فقہ بھی قرآن کا درجہ رکھتے ہیں۔ بالآخر ارمنی قتل کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس۔ جرمنی۔ فرانس و انگلستان نے ترکی کو الٹی میٹم دیا کہ یا تو ایسا حکم منسوخ کیا جائے۔ ورنہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات ختم کرتے ہیں۔ اس پر عرصے تک وزارت خارجیہ ترکی اور سفراء دول سے خط و کتابت رہی۔ وزیر اعظم ترکی نے جو خط وزیر خارجہ انگلستان کو اس مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کا اقتباس بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

لہ EASTERN QUESTION

فرماتے ہیں :۔ "قرآن کے احکام کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتے۔ لیکن ایسے معاملے میں جب کہ مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی شخص علانیہ اسلام لاکر پھر مذہب کا انکار کرے تو قرآن کا حکم ایسے لوگوں کے قتل پر ناطق ہے۔ کوئی تاویل ایسے شخص کو موت سے بچا نہیں سکتی اور شریعت کے حکم کی تعمیل بلا کسی رحم کے عمل میں لائی جائیگی"

معلوم نہیں وزیر اعظم کے پاس کون سا قرآن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اب تک ترکوں کے پاس ایک مقفل کتاب رہی ہے۔ باوجود اس کے بالآخر شریعت کا حکم سلطان عبدالمجید کے نومبر ۱۸۴۳ء کے ارادے سے منسوخ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ قرآن کا حکم نہ تھا۔ بلکہ یورپ کے خوف سے۔ اس سے زیادہ اسلام کی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ مگر ۱۸۷۵ء میں ایک ترک کو انجیل کے ترجمہ کرنے پر سزائے موت دی گئی تو یورپ میں پھر جوش وخروش یا بقول ہمارے (اخبارات کی اصطلاح کے) صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اور بالآخر یہ طے پایا کہ جبتک ٹرکی کی سلطنت میں اس قسم کے وحشیانہ قوانین پر عملدرآمد ہے یورپ کسی طرح اپنی رعیت کے حقوق کی ذمہ داری چھوڑ نہیں سکتا۔

سوال یہ ہے کہ ابن عباس کا یہ قول کہ "جو اپنا مذہب بدلے قتل کر دیا جائے" واقعی رسول اللہ صلعم کا قول ہے۔ مجھے یہ حدیث ابن ماجہ میں ملی ہے۔ مسلم میں موجود نہیں۔ اور ابن ماجہ میں کثرت سے منکر وموضوع حدیثیں ہیں۔ اس کی چند مثالیں میں دوں گا۔

پہلی مثال :۔ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا افضل ہے دن کے روزہ رکھنے سے اور رات کو عبادت کرنے سے اپنے گھر میں ہزار برس تک۔ ایک برس میں تین سو ساٹھ دن اور ہر دن ہزار برس کے برابر"

(اس روایت کے اسناد میں ایک شخص سعید بن خالد ہے جو کذاب ہے)

دوسری مثال :۔ "داود بن مجلدن سے روایت ہے "میں نے طواف کیا ابو عقال کے ساتھ بارش میں جب ہم طواف کر چکے تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے۔ اوسوقت ابو عقال نے کہا میں نے انس بن مالک کے ساتھ طواف کیا۔ بارش میں جب ہم طواف کر چکے تو مقام ابراہیم میں آئے۔ وہاں دو رکعتیں پڑھیں انس نے ہم سے کہا اپنے عمل کا حساب اب نئے سرے سے سمجھو کیونکہ اگلے گناہ تمہارے بخش دئے گئے۔ اور ایسا ہی فرمایا ہم سے رسولخدا صلعم نے اور ہم نے ان کے ساتھ طواف کیا بارش میں۔

(یہ حدیث باوجودیکہ اس کا راوی ابو عقال جس کا اصلی نام ہلال میں زید ہے کذاب اور متروک ہے۔ عوام میں اس درجہ مشہور ہے کہ ہر حاجی جب وہ حجر اسود کا بوسہ لیکر گھر آتا ہے تو اپنے گناہوں کا کھاتہ

پھر سے لکھنا شروع کرتا ہے)

تیسری مثال :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص حج کا مقصد رکھتا ہو وہ جلدی کرے۔ کیونکہ کبھی کوئی آدمی بیمار ہو جاتا ہے اور کبھی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے اور کبھی کوئی ضرورت پیش ہو جاتی ہے۔

(امام احمد کی سند میں یہ حدیث مرفوع ہے اور اسکی اسناد میں اسمٰعیل بن خلیفہ ابو اسرائیل کذاب ہے)

چوتھی مثال :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رمضان کا مہینہ پاوے اور روزے رکھے اور رات کو عبادت کرے جتنی اس سے ہو سکے۔ تو اللہ تعالےٰ اس کے لئے ایک لاکھ رمضان کا ثواب لکھے گا اور ہر ایک روزے کے بدلے ایک بردہ آزاد کرنے کا ثواب ہو گا اور ہر ایک رات کے بدلے ایک بردہ آزاد کرنے کا۔ اور ہر ایک دن کے بدلے ایک گھوڑے کا ثواب ہو گا جو اللہ کی راہ میں سواری کے لئے دیا جاوے اور ہر دن کو ایک نیکی لکھی جاویگی اور ہر رات کو ایک نیکی۔

(اسکے اسناد میں عبدالرحیم اور انکے باپ زید دونوں متروک ہیں۔ ابن معین نے عبد الرحیم کو کاذب کہا ہے اور اس کے باپ کو ضعیف)

پانچویں مثال :۔ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریب ہے وہ زمانہ جب کئی ملک تم فتح کروگے اور ایک شہر کو تم فتح کروگے جس کا نام قزوین ہو گا۔ جو شخص وہاں رباط کرے چالیس دن یا چالیس راتوں تک اس کو جنت میں ایک ستون ملے گا سونے کا اس پر سبز زمرد لگا ہو گا اور اس پر ایک قبہ ہو گا سرخ یاقوت کا۔ اس قبے میں ستر ہزار چوکھٹے ہوں گے سونے کے۔ ہر چوکھٹے پر ایک پری ہو گی حوروں میں سے جو بڑی آنکھ والیاں ہیں۔

(شوکانی نے کہا ہے۔ اس کے اسناد میں ایک داود بن محبر ہے جو وضاع و کذاب ہے دوسرا ربیع بن صبیح ہے جو ضعیف ہے اور تیسرا ابن زیان متروک ہے۔ علماء نے اس قسم کی حدیثوں کی وجہ سے ابن ماجہ پر طعن کیا ہے اور ان کے سنن کو صحاح سے خارج سمجھا ہے۔ ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں شمار کیا ہے)

ایسے ہی ابن ماجہ کی بہت مشہور حدیث تھی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور نالایق کو تعلیم دینا ایسا ہی ہے جیسے موتی اور سونے کا ہار سوروں کے گلے میں ڈالنا۔ وہ نودی کے نزدیک ضعیف ہے۔ مگر ان کے شاگردوں کے نزدیک یہ حسن کے درجے تک بوجہ کثرت روایت کے پہونچتی ہے۔

لہذا ابن ماجہ ایک مشکوک کتاب ہے اور اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ترمذی نسائی و ابو داؤد وہ اس سے زیادہ مشکوک ہیں۔ کیونکہ حدیث میں اکثر ما قبل کتابوں کی روایت موخر کتابوں میں لیلی گئی ہیں۔ ابن ماجہ کی پہلی کتابوں میں یعنی مسلم و موطا میں یہ حدیث مجھکو نہیں ملی۔ بخاری میں البتہ اس کا ذکر ایک اور انداز سے ہے۔

" عکرمہ نے کہا حضرت علی کے سامنے کچھ منافقین (خوارج؟) لائے گئے آپ نے ان کو زندہ جلانے کا حکم دیا۔ یہ خبر ابن عباس کو پہونچی تو انھوں نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو میں ان کو زندہ نہ جلواتا۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کے عذاب کا سا عذاب مت دو۔ ہاں میں ان کو قتل کرتا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جو شخص اپنے دین کو بدلے اُس کو قتل کر دو۔

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت علیؑ کا فعل خود خلاف سنت و قرآن نہ تھا۔ کیا ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے کہ کوئی منافق رسول اللہ صلعم کے وقت میں زندہ جلایا گیا ہو۔ لیکن حضرت علیؑ کا فعل بعض سیاسی مصلحت و حالت اضطرار کا نتیجہ رہا ہوگا۔ اور نہ ان کے قتل کی کوئی سند لیجا سکتی ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے انھوں نے یہ قول کب اور کس موقع پر سُنا۔

۲۔ اس وقت انکی عمر کیا تھی؟

۳۔ اس کے سننے والے اور کون اصحاب تھے؟

۴۔ اگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا تھا تو کیا یہ ان کا ذاتی اجتہاد تھا۔

۵۔ کیا ان کے اجتہاد پر کلام کیا گیا ہے۔

۶۔ مذہب بدلنے سے کیا مراد ہے۔ کیا اس فقرے میں مسلمان کا غیر مسلم ہونا مراد ہے یا عام طور سے جو مذہب بدلے قتل کر دیا جائے۔

۷۔ کیا قرآن سے قتل مرتد کا جواز مل سکتا ہے۔

۸۔ اگر قرآن اور سنت رسول سے اس کا جواز نہیں ملتا تو یہ اجتہاد کسطرح قابل اعتبار ہے۔

۹۔ فقہا کا اجتہاد کس حدیث پر مبنی ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں صرف ایک واقعہ ارتداد کا ملتا ہے اور وہ واقعہ عرینیہ کا تھا۔ اس کا قصہ یوں ہے۔

(میں انس کی روایت صحیحین سے نقل کرتا ہوں۔

عرینیہ کے کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آئے تو ان کو مدینہ کی ہوا موافق

نہ آئی۔ آپ نے فرمایا کاش تم ہمارے اونٹوں میں چلے جاؤ اور ان کا دودھ پیو اور موت پیو (یہ عربی محاورہ ہے اونٹوں کی خدمت کرنے کے لئے) انھوں نے ایسا ہی کیا (اور جب وہ اچھے ہو گئے) تو مرتد ہو گئے اور آنحضرت صلعم کے چرواہے کو مار ڈالا اور اونٹوں کو بھی ہنکالے گئے۔ آپ نے ان کو پکڑنے کے لئے لوگوں کو بھیجا وہ لائے گئے۔ آپ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور ان کی آنکھوں میں سلائی پھیری۔ اور انکو جلتی زمین پر ڈال دیا۔

اس قصے کو کئی طریقہ سے بخاری و مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔ اور سب روایتوں کو سامنے رکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ لوگ آپ کے سامنے لائے گئے اور ان کو عذاب دیا گیا جو لوگ انکے تعاقب میں گئے تھے۔ انھوں نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ میرے نزدیک آخری صورت زیادہ قرین قیاس و صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ارتداد کی وجہ سے قتل کئے گئے یا قصاصًا۔ حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا قتل بدلہ مثلہ تھا۔ اور ارتداد کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ واقعہ ۵ھ ہجری کا ہے۔ اگر رسول اللہ صلعم نے مرتد کے بارے میں کوئی حکم دیا ہوگا تو یہ ہی موقع رہا ہوگا۔

۲۔ ابن عباس کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔

۳۔ سوائے ابن عباس کے کسی اور صحابی سے یہ قول منقول نہیں ہے۔ کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔

۴۔ ابن عباس کا پانچ برس کی عمر میں ایسا حکم سننا خلاف قیاس ہے۔ صرف ان کا ذاتی اجتہاد ہے۔

۵۔ ابن عباس کی حدیثوں پر اور زیادہ تر ان کے اجتہاد پر (اس لئے کہ بہ لحاظ سن وہ حدیثوں کے سننے اور یاد رکھنے کے قابل آنحضرت کے زمانے میں نہیں تھے) کثرت سے کلام کیا گیا ہے۔ میں اس کی چند مثالیں حدیث سے ہی دوں گا۔

اول۔ ابن عباس سے پوچھا گیا اگر غلام اپنی عورت کو دو طلاق دیوے پھر دونوں آزاد ہو جاویں کیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ ابن عباس نے کہا ہاں پوچھا گیا یہ فیصلہ کس نے کیا۔ انھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

(عبداللہ ابن مبارک نے کہا ابوالحسن اس حدیث کے راوی نے اس حدیث کی روایت سے ایک بڑا پتھر اپنی گردن پہ اٹھا لیا ہے۔ شافعی اور ابو حنیفہ دونوں کو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ شافعی کے نزدیک طلاق مردوں سے متعلق ہے اور یہاں خاوند غلام تھا۔ بس دو طلاق میں وہ عورت بائنہ ہو گئی۔ ابو حنیفہ کے نزدیک طلاق عورتوں سے متعلق ہے اور عورت لونڈی تھی بائن ہو گئی۔ اور اصل یہ ہے کہ قرآن میں مطلق حکم ہے اور غلام اور آزاد کی تخصیص نہیں ہے)

دوم - ابن عباس نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ دیا قسم کا ایک صاع کھجور دے کر اور لوگوں کو بھی ایسا ہی حکم دیا - اگر کسی کو ایک صاع کھجور کا نہ ملے تو نصف صاع گیہوں کا دے (قرآن شریف میں دس مسکینوں کو پیٹ بھر کھانا کھلانا شرط ہے - اسلئے ابو حنیفہ نے قیاس کیا ہے کہ ایک صاع کھجور ہر ایک مسکین کے لئے ہے - مگر شافعی کا قول ہے کہ ہر ایک مسکین کو ایک مد (چوتھائی صاع) کافی ہے - زہری نے اسکی تاویل یوں کی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے - کیونکہ اسکی اسناد میں عمر بن عبداللہ فاسق ہے)

سوم - ابن عباس کا قول ہے کہ جو شخص اناج خریدے اس کو نہ بیچے - جبتک کہ اس پر قبضہ نہ کرلیوے اور ابو عوانہ کی روایت میں ہر چیز پر یہ حکم ہے -

(ابو حنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے - خصوصاً گھر اور زمین کی بیع میں تو انھوں نے قطعی انکار کیا ہے)

ایسے ہی ان کی روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کو حلال نہیں کہ دیکر پھیر لیوے مگر باپ کو جو وہ اپنی اولاد کو دے -

(باوجودیکہ ترمذی نے اس کی تصدیق کی ہے - ابو حنیفہ نے اس حدیث سے انکار کیا ہے)

ابن عباس کا فتوے تھا کہ متعہ جائز ہے - ابن شہاب زہری نے کہا کہ عروہ بن زبیر نے مجھکو خبر دی کہ عبداللہ بن زبیر مکہ میں کھڑے ہوئے خطبہ پڑھنے کو اور کہا کہ بعض لوگوں کے دل اللہ تعالے نے اندھے کردئے ہیں - جیسے ان کی آنکھیں اندھی کردی ہیں - (یہ اشارہ ابن عباس کی طرف تھا جو آخر میں اندھے ہو گئے تھے) فتوے دیتے ہیں متعہ کے جواز کا اور وہ اس شخص پر طعن کر رہے تھے اتنے میں اس شخص نے پکارا اور کہا تم کم فہم - بے ادب نادان ہو اور قسم ہے میری جان کی کہ متعہ کیا جاتا تھا زمانے میں امام المتقین کے - سو ابن زبیر نے کہا کہ تم اپنے کو آزما دیکھو کہ قسم اللہ کی اگر تم نے متعہ کیا تو بے شک میں تم کو تمہاری ہی پتھروں سے ماروں گا - ابن شہاب نے کہا کہ خالد بن مہاجر بن سیف اللہ نے مجھے خبر دی کہ میں ایک شخص کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے متعہ کا فتوے پوچھا تو انھوں نے حکم دیا متعہ کا - سو ابن عمرہ انصاری نے کہا ذرا ٹھہرو - انھوں نے کہا کیوں اللہ کی قسم میں نے کیا ہے امام المتقین کے زمانہ میں - تب ابن ابی عمرہ نے کہا کہ اول اسلام میں جائز تھا - اسکے لئے جو نہایت درجہ بے قرار ہو جیسے مضطر کو مردہ اور خون اور سور کا گوشت حلال ہے - پھر اللہ پاک نے اپنے دین کو مضبوط کیا اور اس سے منع فرمایا -

ظاہر ہے کہ ابن عمرہ کی تاویل لغو و باطل ہے - کہاں بھوکوں مرنا - اور کہاں عورت کے بغیر

مرنا۔ اللہ اکبر۔ پھر تو شراب بھی جائز اور تمامی منکرات جائز۔

اسی طرح ابن عباس کا یہ قول کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن مسعود سے کہ تمہارے ساتھ پانی ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ مگر کھجور کا شربت ایک چھاگل میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کھجور پاک ہے اور پانی پاک کرنیوالا ہے۔ میرے اوپر ڈالو سو میں نے ڈالا اور آپ نے وضو کیا۔

(تمام فقہا متفق ہیں کہ انگور کے عرق سے وضو درست نہیں)

ایسے ہی ابن عباس کا قول جو ربیع نے بیان کیا ہے یعنی ابن عباس آئے اور مجھ سے وہ حدیث پوچھی کہ رسول اللہ صلعم نے وضو کیا اور دونوں پیر دھوئے۔ ابن عباس نے کہا کہ لوگ پیروں کا غسل ہی کئے جائیں گے۔ حالانکہ میں کتاب اللہ میں نہیں پاتا مگر مسح کو۔

(تمام فقہا کے نزدیک پیر دھونا شرط وضو ہے۔ طحاوی اور ابن حزم نے اس حدیث کو منسوخ سمجھا ہے۔ جریر طبری ابن حیان اور حسن بصری کا قول ہے کہ آدمی چاہے پیر دھووے (اگر پیر میلا ہو) یا مسح کرے۔ بعض علما نے غسل اور مسح کو دونوں کو واجب سمجھا ہے)

یا ابن عباس کا یہ قول کہ سیاہ کتا اور عورت نماز کو توڑ دیتی ہے (اگر وہ سامنے سے نکل جاوے)

حضرت عائشہ نے اس حدیث اور قول سے انکار کیا ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم قطعی مبہم ہے۔ کیا ایسی کوئی مثال تاریخ اسلام میں ہے کہ ایک یہودی مسلمان یا عیسائی ہونیکی پاداش میں قتل کیا گیا۔

۶۔ قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے۔ البتہ ان آیتوں سے مفسرین نے کچھ استدلال کیا ہے۔ وہ آیتیں یہ ہیں:۔

۱۔ فما لکم فی المنافقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل اللہ فلن تجد لہٗ سبیلا۔ ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سوآءً فلا تتخذوا منھم اولیآء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیا ولا نصیرا۔ (۴-۹۰)

۲۔ یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہٗ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔ (۵-۵۶)

۳۔ ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ و اولئک اصحٰب النار ھم فیھا خلدون (۲-۲۱۷)

ان آیات کے مطالب حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو رائے ہو گئے ہو۔ حالانکہ خدا نے ان کو ان کے اعمال کی پاداش میں پلٹ دیا ہے۔ کیا تمہارے لئے ممکن ہے کہ آپ کو راہ راست پر لاؤ۔ جب کہ خدا نے گمراہ کر دیا ہے۔ اور جس کو خدا گمراہ کرتا ہے۔ اس کو صحیح راستہ نہ ملے گا۔ کیا چاہتے ہو کہ ان کی طرح تم بھی کفر کرو کہ تم بھی ان کی طرح ہو جاؤ۔ ان کو تم اپنا مولا اور والی مت بناؤ۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کو نکلیں۔ اور اس وقت اگر وہ پیٹھ پھیریں تو ان کو پکڑو جہاں کہیں پاؤ۔ پھر نہ ان سے مدد لو اور نہ ان سے حمایت کی توقع رکھو۔

۲۔ اے مومنو۔ جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایک قوم کو لائے گا جو اس سے راضی ہوں گے اور وہ ان سے راضی ہو گا۔ مسلمانوں پر مسکین اور کافروں پر سخت ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرینگے نہیں۔ اور یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے جسکو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور روزی کا کشادہ کرنے والا ہے۔

۳۔ اور جو کوئی تم میں اپنے دین سے پھر جائے۔ اور کافر ہو کر مرے تو اس کے اعمال اکارت گئے خواہ دنیاوی ہوں یا اخروی اور اصحاب نار سے ہونگے جہاں ان کو ہمیشہ رہنا ہو گا۔

معمولی سمجھ کا آدمی بھی کتنی ہی کھینچ تان ان آیتوں کی کرے قتل مرتد کا جواز ان سے نکال نہیں سکتا۔ لیکن آفرین ہے ہمارے مفسرین پر کہ انھوں نے ابن عباس کے مزعومہ قول کو نبھایا ہے۔ بیضاوی نے پہلی آیت کی تفسیر میں خدا جانے یہ بات کہاں سے لکھ ماری ہے کہ "جو شخص علانیہ یا خفیہ ارتداد کرے ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ملیں۔ ان سے بالکل الگ تھلگ رہو اور ان کے بارے میں کسی قسم کی رعایت یا سفارش نہ سنو۔" لیکن یہ تاویل بالکل اسی طرح ہے جیسا اہل ایذ نے فسبحٰن اللہ حین تمسون کی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت کی ہے۔ دوسری آیت درحقیقت حضرت ابوبکر کی خلافت کے واقعہ کی پیشین گوئی ہے۔ اور مفسرین کا قول ہے کہ چونکہ ابوبکر صدیق نے مرتدین سے قتال کیا تھا اور ان کا فعل قطعی قرآن کے ماتحت تھا۔ اس لئے مرتد کا قتل جائز ہے مگر سوال یہ ہے کہ عرب کے باغیوں سے قتال کی بنا صرف ارتداد تھی یا کچھ اور۔ کیا فتنہ و بغاوت ظاہر نہ ہو چکی تھی۔ اور اس پر اگر ابوبکر نے قتال کیا تو کیا بیجا کیا۔ تیسری آیت تو اس قدر صاف ہے کہ تعجب معلوم ہوتا ہے

کہ مفسرین نے اس کی تاویل میں کیوں ایسی راہ اختیار کی جو عربیت ہی کے خلاف ہے۔ چنانچہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اس آیت سے اور خود امام رازی نے اس آیت سے قتل مرتد کا استدلال کیا ہے۔ ہر شخص جسکو تھوڑی سی بھی عربی آتی ہے سمجھ سکتا ہے کہ اس کی تاویل کس قدر لغو اور خالی از عقل و انصاف ہے۔

۸۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور سنت سے اس کا جواز نہیں ملتا۔ جو کچھ ہے وہ فقہا کا اجتہاد و قیاس اور ہم اس کے پابند نہیں۔

۹۔ فقہا نے قتل مرتد میں کیا حدیثیں کی ہیں۔ اس کو تو میں بعد کو دیکھوں گا۔ پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ قتل مرتد پر فقہا کا ہم آراہونا کس مصلحت پر مبنی تھا۔

تم دنیا میں کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ قوموں کے افکار و قلوب پر ہمیشہ مذہب کی حکمرانی رہی ہے اور عوام کو اپنے مقصد کی طرف لانے کے لئے ایک اولوالعزم کی کامیابی کا راستہ مذہب سے ہو کر گذرا ہے۔ خواہ وہ اولوالعزمی ترقی و جاہ کے لئے ہو یا سیاسی و قومی تفوق کے لئے۔ لہذا اس کا سمجھنا آسان ہے کہ رئیس یا پیر یا لیڈر کی کامیابی کی پہلی منزل تو یہ ہوتی ہے کہ عوام کے مذہبی شعور پر حملہ کیا جائے۔ اور اس کے لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اول تو عوام کے ذہن نشین یہ بات کردی جائے کہ مذہب یا مذہبی کتاب تمہاری معمولی سمجھ سے باہر ہے تم کو خواہ مخواہ ایسے لوگوں کی تقلید کرنا چاہیئے جو دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔ جب قوم کے قلوب پر یہ بات پوری طرح جاگزیں ہو جائے تو دوسری منزل یہ ہے کہ اپنے کو مذہب کا مفتی و مجتہد ظاہر کیا جائے اور یہ اجاریت یا پریسٹ ہڈ (PRIESTHOOD) کی اصل تاریخ ہے۔ پھر تیسری منزل یہ ہے کہ عوام کے ہاتھ سے وہ تمام ذرائع چھین لئے جائیں۔ جس سے وہ دین کی سمجھ خود بخود پیدا کر سکیں اسکے بعد راستہ صاف ہے۔ قوم تمہارے ہاتھ میں آ گئی۔ اب جس طرف چاہو اس کو لیجاؤ اب نہ ان کو تمہاری روایت پر اعتراض۔ نہ تمہارے قیاس پر اور نہ تمہارے اجتہاد پر اور نہ تمہارے عمل پر۔ چنانچہ ہر مذہب میں نبوت کے تھوڑے دنوں کے بعد اجاریت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور قوم جب اجاریت کے گرداب میں پھنس جاتی ہے تو مشکل ہی سے باہر نکلتی ہے۔ مذہب اسلام کی تاریخ میں بھی ہم کو وہی دور نظر آتا ہے۔ نبوت و قرآن کا پہلا دور بہت جلد فقہا و فلسفیوں (محدثین) کے دور سے بدل گیا۔ یہ بالکل قانون فطرت کے مطابق ہوا۔ اسلام کی اصل دستاویز قرآن کے ساتھ فقہا اور محدثین نے جو سلوک کیا وہ علیحدہ داستان ہے جو میں پھر کسی وقت بیان

کردوں گا۔ مگر چونکہ ان کی قدرت سے قرآن کا معدوم کرنا باہر تھا اور خوف تھا کہ کہیں کوئی بھیڑ گلے سے نکل نہ جائے ان کو لازماً حکومت وقت سے سازش کرنی پڑی۔ اور اجاریت کا وہ حربہ استعمال کیا گیا۔ جو ہر قوم و زمانے میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی اختلاف رکھنے والے کی زبان بندی کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کے پاس وہ چیز ہی نہ رہنے دو جس میں زبان ہے یعنی سر کو قلم کر دو۔ کیونکہ دراصل اگر اسلام میں ارتداد کے معنی دیکھنا چاہو تو ان کلمات کفر پر نظر ڈالو۔ جو ہمارے آسانی کے لئے فتاوے بر ہانی میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ارتداد درحقیقت محض معمولی اختلاف رائے سے بھی کم ہے اور مسلمانوں نے ایام ظلمت و جہالت میں غالباً عیسائیوں سے زیادہ اس راہ میں خون بہائے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر صاحب ہدایہ ملا برہان الدین علی مسئلہ ارتداد میں یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں (دیکھو باب نہم ہدایہ)

"جب ایک مسلمان دین سے پھر جائے۔ اس کے سامنے اس بات کو صاف وصراحت و تحقیق سے پیش کرنا چاہئے جس کی وجہ سے اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے تاکہ وہ پھر سے ایمان لائے۔ اُسکے سامنے تحقیق کو پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر اتمام حجت ہو جائے کیونکہ اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی رہجاتی ہیں۔ اسلام یا قتل۔ اور چونکہ قتل سے اسلام بہتر ہے۔ اس لئے برائی کے مٹانے کے لئے دین کی تعلیم یاد دلانا بہتر ہے۔ لیکن یہ تعلیم ضروری نہیں۔ اسواسطے کہ اس کو مذہب کی تعلیم پہلے ہی مل چکی ہے۔

مرتد کو تین دن تک قید رکھا جائے۔ اور اگر اس تین دن کے اندر وہ اپنے عقیدہ سے توبہ کرلے تو بہتر ہے۔ ورنہ قتل کیا جاوے۔ جیسا جامع الصغیر میں کہا گیا ہے۔ کہ مرتد سے پہلے اتمام حجت کیا جائے۔ اور اگر وہ ارتداد پر قائم رہے تو قتل کیا جائے۔ اور جو یہ کہا گیا ہے کہ اسکو تین دن قید رکھنا چاہیئے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ڈھیل محض اس کو دوبارہ غور کرنے کے لئے ہے۔

ابو حنیفہ اور ابو یوسف کا قول ہے کہ تین دن کی مہلت دینا مستحب ہے۔ خواہ مرتد اسکو قبول کرے یا نہ کرے اور شافعی کا قول ہے کہ امام پر تین دن کا وقفہ دینا واجب ہے اور یہ جائز نہ ہوگا کہ مرتد کو بغیر وقفہ دئے ہوئے قتل کر دیا جاوے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مسلمان کا ارتداد محض اس بنا پر ہو کہ اس کو بعض مسائل سے ناواقفیت یا شک یا گمان ہو گیا ہو۔ اور جسکے لئے اس کو سمجھنے کا موقعہ دینا ضروری ہے۔ ہمارے علماء نے اس پہلو پر دو حیثیت سے بحث کی ہے۔ اول کی تو یہ رائے ہے کہ قرآن میں ہے کہ کافروں کو فوراً قتل کر ڈالو۔ اور ان کو کوئی مہلت نہ دو اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ

جو اپنا مذہب بدلے اسکو قتل کر ڈالو۔ دوسرے یہ کہ مرتد دشمن دین ہے۔ جسکو اسلام کی دعوت مل چکی ہو اس لئے اس کے قتل میں دیر نہ لگانی چاہیئے۔ یہاں پر مرتد دشمن دین ہے اور اس کی حالت دین کی سی نہیں۔ کیونکہ نہ اس نے کوئی جزیہ دیا ہے اور نہ اس سے جزیہ قبول کیا گیا ہے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ مرتد کے لئے غلام اور آزاد کی قید نہیں۔ دونوں پر یہ بحث حاوی ہے۔

"اگر ایک مرتد ہو جائے یا قتل ہو جائے۔ تو اس کا مال ان وارثوں کو ملیگا جو مسلمان ہیں اور جو کچھ اس نے اپنے ارتداد کے زمانہ میں پیدا کیا ہے وہ بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ یہ قول ابو حنیفہ کا ہے۔

مرتد کے تمام معاملات جو اس نے اپنے ارتداد کے زمانہ میں کئے ہیں یعنی بیع و شریٰ ہبہ اعتاق۔ رہن وغیرہ وہ سب کالعدم ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو وہ معاملات بحال رہیں گے ورنہ نہیں۔ لیکن اگر وہ مرجائے ارتداد میں تو وہ سب کالعدم ہیں۔

اگر کوئی شخص مرتد کو قتل کردے۔ قبل اسکے کہ اس پر اتمام حجت کیجائے تو یہ مکروہ ہے۔ لیکن قاتل کو کوئی سزا نہ دیجائے گی۔ کیونکہ مرتد کا قتل جائز ہے اور اتمام حجت ضروری نہیں۔

"اگر ایک مسلمان عورت مرتد ہو تو اس کو قید کیا جائے۔ یہانتک کہ وہ اپنے عقیدہ سے توبہ کرے۔ شافعی نے کہا ہے کہ اس کو بھی قتل کردینا چاہیئے۔ بموجب اس حدیث کے جو اوپر بیان کیگئی ہے۔ اگر مرد مرتد ہو جائے اور دارالحرب کو بھاگ جائے تو اس کا نکاح فسخ ہے اسی طرح عورت کا۔ اور اگر مرد اور عورت دونوں مرتد ہو جائیں اور دارالحرب کو بھاگ جائیں اور عورت وہاں حاملہ ہو کر بچہ جنے اور اس بچے کے بھی بچہ ہوں تو جب مسلمان اس ملک پر حملہ کریں تو مرتد کی یہ اولاد غلام بنائی جائے گی حسن نے کہا ہے کہ ان کو زبردستی مسلمان کیا جائے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ غریب ملا برہان الدین کے خیال میں یہ نہ آیا کہ جہاں مسلمانوں کے ہاتھ میں سلطنت نہ ہوگی۔ جیسے ہندوستان۔ چین۔ روس وغیرہ۔ وہاں بیچارے کیا ترکیب کرینگے۔ مولوی اشرف علی کا قول ہے کہ وہاں نکاح فسخ کردینا کافی ہے۔ علماء اسلام سے یہ سوال ہے کہ "کیا اسی اسلام کی تبلیغ کا حوصلہ یورپ میں ہے"

"حق گو"

تلاشِ سکون

سلیمہ کی شادی کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھی کہ اس پر تعجب کیا جاتا۔ لیکن ایک پہلو اس کا ضرور عجیب و غریب تھا کہ "سلیمہ باوجود علیم سے منسوب ہوجانیکے کیوں پہلی بھیت کے تعلقدار کو بیاہ دی گئی"

علیم بار بار صفدر کے تار کو پڑھتا۔ لیکن کچھ اُس کی سمجھ میں نہ آتا۔ کل کا آیا ہوا خط اُس کے پاس موجود تھا۔ لیکن اس میں کہیں شادی کا تذکرہ نہ تھا۔ رفع شک کی غرض سے علیم نے صفدر کو جوابی تار روانہ کیا۔ ۴ گھنٹے کے بعد جواب آیا کہ "سلیمہ کی شادی کل ہو گئی۔ جیساکہ میں لکھ چکا ہوں" واقعہ کی نوعیت جب غیر معمولی ہو تو انسان مشاہدات کا بھی منکر ہوجاتا ہے۔ علیم کو صفدر کے اس تار پر بھی کلی اعتماد نہ ہوا۔ وہ پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ غصہ سے کانپنے لگتا۔ جب اُسے یہ خیال پیدا ہوتا کہ اُسکے چچا اُس کو یوں برباد کردیں گے اور برسوں کے طے شدہ فیصلہ کو یوں توڑ دیں گے۔ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اُس نے خود سلیمہ کو لکھا۔

" عزیزہ، ممکن تھا کہ میں تمکو تمہارے پُرانے خطاب سے مخاطب کرتا۔ لیکن صفدر کی اطلاع اسقدر حیرت زا ہے کہ اُس کے تصور سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ تار ملفوف کر رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہو تو میرا خط بغیر پڑھے پھاڑ ڈالئے۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے حق خطاب نہیں رہتا" 　　علیم

چار دن جواب کے انتظار میں علیم نے نہایت بیچینی سے کاٹے۔ پانچویں دن جواب آیا۔

" بھائی جان۔ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ "ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے" جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں اپنے متعلق کچھ نہیں کہتی۔ کیونکہ بناوٹ پر محمول کیا جائے گا۔ مگر آپ کے متعلق ضرور کہوں گی کہ خدا آپ کو اس حادثہ کے برداشت کی طاقت دے" 　　سلیمہ

(۲)

اجمیر کا عرس اپنی گوناگونی کی وجہ سے اپنے اندر ایک عجیب دلکشی رکھتا ہے۔ اور شاید غالب نے اسی قسم کے اجتماع کو دیکھکر کہا ہوگا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ فصل بہاری کا

علیم ابھی اس خیال سے آیا تھا کہ شاید اُن لوگوں کی صحبت میں جو دنیا چھوڑ دینے کا اعلان کر چکے ہیں۔ وہ بھی دنیا اور دنیا والوں سے آزاد ہو جائے گا۔ قاعدہ ہے کہ وہ ہستیاں جو ساری عمر خدا کی طرف رُخ نہیں کرتیں اور مذہب کو دقیانوسی توہمات خیال کرتی ہیں۔ ان کو جب سکونِ قلب کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر مجبوراً اسی "دقیانوسی توہمات" کی طرف آتی ہیں۔ علیم باوجود اپنے "کفر پرور" دماغ کے رات دن ریاضت اور عبادت میں گذارتا تاکہ اسکا ذہن سلیمہ کے تصور سے خالی رہے۔ لیکن اُس کا دماغ سکون سے یکسر خالی تھا۔ اُس کی ریاضتیں اُس کی چلہ کشیاں، جنکو وہ ترکِ حیوانات اور فاقے کر کرکے پوری کر رہا تھا حضورِ قلب سے معرا تھے۔ اور ان وظائف میں جن کو وہ کمر کمر پانی میں کھڑا ہو کر پڑھتا انہیں ایک منٹ کے لئے سلیمہ کے روح فرسا خیال سے اُس کو نجات نہ ملتی۔ اُس کو ایسا معلوم ہوتا کہ سلیمہ سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ہے۔ پہاڑوں کے تاریک و دہشتناک غاروں میں سلیمہ کا تصور نور کی طرح ضو فگن رہا کرتا۔ غرضکہ جنگل کا پتہ پتہ اور دریا کی ہر موج اُس کو سلیمہ کا پیغام سناتی۔ گھبرا کر کسی درخت سے لپٹ جاتا۔ اور دہاڑیں مار مار کر روتا۔ یا جنگل کی تاریک اور گھنی جھاڑیوں میں گم ہو جاتا۔ لیکن سلیمہ کا خیالی خاکہ کہیں اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

اس زندگی میں علیم کا واہمہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ اُس کو کائنات کا ذرّہ ذرّہ سلیمہ کی محبت کا پیغام سناتا معلوم ہوتا۔ کالج چھوڑنے کے بعد علیم اپنی زندگی کو یوں ہی مزاروں خانقاہوں میں تباہ کرتا رہا۔ اُس نے اسی پریشانی میں حج بھی کیا۔ کہ شاید وہاں اُس کو سکون مل سکے مگر افسوس کہ اُس کی یہ امید وہاں بھی پوری نہ ہوئی۔ وہ مضطرب اور دیوانہ وار کعبہ کے در و دیوار سے سلیمہ کے خیال سے نجات مانگتا۔ لیکن اُس کی یہ "التجائے نجات" صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہ رکھتی۔

مدینہ میں علیم کو قدرے ضرور سکون ملا۔ وہ جس وقت روضۂ اطہر کی جالی تھام کر اپنی پر درد داستان زبان سے نہیں بلکہ دل سے کہتا تو اُس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا دل منور ہو رہا ہے اور غم کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ لیکن یہ حالت عارضی ہوتی تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس کی حالت وہی ہو جاتی۔

(۴)

بمبئی پہونچکر علیم نے اپنی زندگی کو بالکل بدل لیا۔

قابلیت اور ذہانت انسان کو عمر میں ایک موقع ضرور بہم پہونچاتی ہے کہ اگر اس میں قوتِ پرواز ہو تو سربلند ہو سکے۔ علیم جیسے تعلیم یافتہ کا بمبئی میں کامیاب ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ وہ نہایت معمولی کوشش سے ایک کارخانہ کا منیجر ہو گیا۔ مگر باوجود اپنی لامتناہی ذمہ داریوں کے اُس کی زندگی بسر

مدہوش تھی۔ اگرچہ وہ کارخانہ میں کبھی دلچسپی نہ لیتا تھا۔ لیکن اُس کا سخت طرزِ عمل کارخانہ کے مزدوروں اور ملازموں کو ہر وقت لرزہ بر اندام رکھتا تھا۔ کیونکہ معمولی باتوں پر گالیاں دینا اور نوکروں کو برطرف کر دینا اُس کے نزدیک نہایت معمولی بات تھی۔ وہ بالکل نہ جانتا تھا کہ رحم کیا چیز ہے۔ اُس کا قول تھا کہ جب خدا خود رحیم نہیں ہے تو وہ ہستی کیوں رحیم ہو جو اُس کی ذات کی مظہر ہے۔ اُس کے نزدیک مصیبت زدہ مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ عنایت و مہربانی یہ ہے کہ ان کو مزید تباہیوں کی طرف ڈھکیل دیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد اپنی اس مصیبت ناک زندگی سے نجات حاصل کر سکیں۔ وہ خدا ایک ایسی طاقت کو کہتا تھا جو رحمٰن و رحیم نہیں بلکہ ظالم و جابر ہے۔ اُس کو لوگوں کی اس خود فراموشی پر بڑی ہنسی آتی جو خدا کی ان تباہ کاریوں کے باوجود اُس کو کریم مانتے ہیں۔ عبادت اُس کے نزدیک ایک بھینٹ تھی۔ جس کو مخلوق خدا کے خون آشام جذبات فرد کرنے کے لئے اُس کے سامنے چڑھاتی رہتی ہے۔

علیم کے سخت گیر برتاؤں سے کارخانہ کا کام چمک اٹھا۔ اور مالک کو اُس سے بے انتہا فوائد پہونچے۔ اور مالک کارخانہ کے خاندان میں اُس کی جلد پذیرائی ہو گئی۔

ثریا مالک کارخانہ کی لڑکی اپنی تعلیم ختم کر کے پونا سے آئی تھی۔ چند روز کی یکجائی نے ایک دوسرے کو روشناس کر دیا۔ علیم نے حصولِ سکون کی خاطر اپنی زندگی ثریا کے قدموں میں ڈالدی۔ اور اُسے اُس کو واقعی اضطراب سے نجات مل گئی۔ اور علیم و ثریا نہایت گرویدگی سے زندگی گذارنے لگے۔

ایک دن کارخانہ میں کسی غلطی پر علیم نے میٹ کو بُری طرح مارا اور کارخانہ سے نکال بھی دیا۔ کارخانہ میں اس واقعہ سے ایسی آگ لگی کہ دوسرے دن تمام مزدوروں نے اسٹرائک کر دی۔ مالک کو خبر ہوئی دوڑا آیا۔ مزدوروں سے وجہ دریافت کی۔ انھوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ "اس منیجر کو نکال دیا جائے ورنہ ہم کارخانہ کو پھونک دیں گے۔" مالک نے فیصلہ کے لئے دو گھنٹے کی مہلت چاہی۔ مزدوروں نے کہا کہ "نہیں ہم تو ابھی فیصلہ چاہتے ہیں۔" ادھر یا ادھر۔ مجبوراً مالک کو علیم کی علحدگی کا اعلان کرنا پڑا۔

مالک بہت پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔ ثریا کی علیم سے مجنونانہ محبت اب راز نہیں رہی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ثریا جو کچھ نہ کر گذرے تھوڑا ہے۔ اس لئے اُس نے علیم کو ثریا کی اتالیقی سپرد کر دی اور کہدیا کہ "ثریا مزید تعلیم کے لئے لندن جانا چاہتی ہے۔ آپ اُس کی تعلیم کا انتظام فرمایئے۔" علیم اس واقعہ سے بالکل دلگیر نہیں ہوا۔ بلکہ اُسے خوشی ہوئی کہ اُس کی ذمہ داریاں کم ہو گئیں۔

علیم نے ۳ مہینے ثریا کے ساتھ نہایت انہماک سے گذارے لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل اچاٹ ہو چلا اور چند روز کے بعد تو پھر اُس کی وہی حالت ہو گئی۔ وہی عدم سکون، وہی اضطراب، وہی پریشانی۔ ثریا اب

اس کے لئے بالکل جاذب نظر نہیں رہی۔

اضطراب کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ علیم تقریباً دیوانہ ہو گیا۔ اور اُسی عالم میں مے نوشی کی عادت ڈال لی۔

ثریا جو ہر وقت علیم کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اب دنوں علیم اُس کو نہ ملتا۔ وہ حیران و پریشان اُس کو مدہوشی کے عالم میں کسی ہوٹل یا کسی کوٹھے سے لاتی۔

ثریا اس تغیر پر حیران تھی اس نے کوئی کوشش علیم کو پھر وہی گذشتہ علیم بنانے کے لئے نہ اٹھا رکھی۔ لیکن علیم کی حالت روز بروز گرتی ہی گئی۔

کبھی ثریا کو اپنے حسن پر ناز تھا۔ لیکن اب علیم کے انداز کو دیکھ کر اُس سے بھی بدگمان ہو گئی تھی۔

(۴)

صفدر نے نہایت تعجب سے تار پڑھا لکھا تھا کہ

"صبح کی ٹرین سے پہونچ رہا ہوں۔" علیم

صفدر کو علیم کی گمشدگی کی وجہ سے اُس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ تار نے ایک نئی روح اسمیں دوڑا دی اور وہ نہایت بیچینی سے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ صفدر کو زیادہ تلاش نہ کرنا پڑا۔ اُس کو جلد علیم کا ڈبہ مل گیا۔ صفدر نے چاہا کہ دوڑ کر علیم سے لپٹ جائے۔ مگر ثریا نے نہایت تیزی سے کہا کہ " یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ ایسا غضب نہ کیجئے ڈاکٹر نے تو زیادہ بات کرنے کی بھی ممانعت کر دی ہے۔" ثریا کو دیکھکر صفدر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اور پھر جلدی جلدی سوالات کرنے لگا۔ ثریا نے پھر کہا کہ " واقعات کا علم پھر بھی ہو سکتا ہے۔ اسوقت تو سب سے مقدم گھر پہونچنا ہے۔" صفدر مردوں کی طرح علیم کو گاڑی میں ڈال کر گھر لایا۔

اُسی وقت علیم کی آمد کی خبر سلیمہ کے والد کو پہونچی دوڑے آئے۔ خیریت پوچھی گھر لیجانے پر مصر رہے۔ لیکن علیم کسی طرح جانے پر راضی نہ ہوا۔

علیم کے بیچانے گھر پہونچکر سلیمہ کو تار دیا کہ " علیم سخت بیمار ہو کر آیا ہے آکر آخری دیدار کر لو۔" اور جب دوسرے دن علیم سے ملنے گئے۔ تو اس کو اطلاع دیدی کہ " سلیمہ کل صبح تک آجائے گی۔"

میرٹھ پہونچکر علیم کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تھی لیکن سلیمہ کی آمد کی خبر سے پھر اس پر دورہ پڑا۔ اور گھنٹوں کیلئے وہ بیکار ہو گیا۔

مہینوں گذر گئے تھے کہ ثریا پٹی سے لگی علیم کی خدمت میں مصروف تھی۔ اور دنوں سے نہ سوئی تھی۔ علیم کے سوجانیکی وجہ سے وہ پٹی پر سر رکھ کر اونگھ گئی۔ علیم پچھلی رات کو ایک دم جاگ اٹھا اور

ثریا کو جگا کر پانی مانگا۔ پانی پی کر علیم نے عجیب نظروں سے ثریا کو دیکھا۔ علیم کی نظر میں وہ کیف اور لذت تھی کہ جس کو ثریا نے ساری عمر محسوس نہیں کیا تھا۔ بہت دیر تک محویت کے عالم میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر علیم نے ثریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سینہ سے لگایا۔ اور کہا "ثریا میری جو حالت ہے اُس سے تم بخوبی واقف ہو۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا مگر ناشکری ہوگی۔ اگر میں تمہارے خلوص، تمہاری محبت، تمہاری خدمت کا اعتراف نہ کروں۔ اور تم سے اپنے گناہوں کی معافی نہ چاہوں جو میں نے کئے ہیں اگرچہ میری نظر میں انسان دنیا میں صرف گناہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جس سے کسی کو مفر نہیں۔ انسان ایک مجبور و لاچار ہستی ہے۔ اُس کو اپنے متعلق بالکل علم نہیں کہ کہاں سے آیا۔ اور کیوں آیا۔ اور کہاں جائیگا اس لئے انسان سے جو کچھ اُس کی زندگی میں ہو جائے وہ ثواب کے ذیل میں آتا ہے نہ کہ عذاب کے۔

اپنے اس کلیہ کے تحت میں گو مجھکو یہ حق نہیں رہتا کہ تم سے کسی قسم کے معذرت خواہ الفاظ کہوں۔ لیکن نہیں دنیا کی ہر چیز میں استثنا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں تم سے عذر خواہ ہوں کہ میں نے تمکو جان کر دھوکا دیا۔ جو چیز میرے قبضہ میں نہ تھی اُس کو تمہاری خدمت میں پیش کیا۔ لیکن میں کرتا تو کیا کرتا جبکہ میری قلبی سوزش نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور میں نے جو کچھ کیا اُس آگ سے بچنے کیلئے کیا جو مجھ کو پھونکے دیتی تھی۔ تمہارے ساتھ میری فریفتگی مکر اور دھوکہ تھی۔ مگر آہ تم اپنی نادانی سے اُس کا شکار ہو گئیں۔ اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے متعلق وہی شعلہ برق افگن ہے جو مجھ کو پھونک رہا ہے۔ سلیمہ کی محبت نے مجھ کو اس منزل میں پہونچا دیا کہ مجھکو آج اپنا آخری وقت نظر آتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری موت تم پر کیا ستم ڈھائے گی۔ اور تمہارا کیا حال ہوگا۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ دنیا غم خانہ ہے جس میں کسی کو سکون نہیں اور اگر کبھی انسان کو کوئی مسرت نصیب ہو جاتی ہے تو "خون جگر کے ایک ایک قطرہ کا حساب" "ودیعت مژگان یار" ہونے کی وجہ سے دینا پڑتا ہے۔ تمہاری وہ خوشی کی زندگی جسکو تم نے مجھ سے ملاقات ہونے سے قبل گذارا تھا۔ تم کو صرف اس لئے دی گئی تھی کہ تم اس المناک زندگی کے برداشت کی طاقت اپنے اندر نہ پیدا کر سکو۔ اور خوب اچھی طریقہ سے تباہ و برباد ہو۔ میں تنہا مٹ رہا تھا مجھکو مٹ جانے دیا ہوتا۔ لیکن نہیں فطرت کو تو یہ منظور تھا کہ کوئی اور پُر مسرت زندگی بھی اس کے ساتھ تباہ کی جائے۔ "آہ ستم ظریفی" تو ملاحظہ ہو کہ اُس دوسری ہستی کی تباہی کا مجھکو ذریعہ بنایا۔ لہذا جو کچھ ہوا یا آئندہ ہو اس پر تم کو غم کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اور تم نے میری ایسی خدمت کی کہ اُس کے معاوضہ کے لئے میرے پاس کچھ نہیں کہ پیش کر سکوں۔ لہذا تم میرے پاس آجاؤ تاکہ میں تمکو گلے لگا کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر سکوں۔ اس وقت تمہاری محبت کے بدلہ

میں یہی ایک تحفہ ہے جس کو پیش کر سکتا ہوں۔

ثریا کی آواز جوشِ گریہ نے بند کر دی تھی اور علیم بھی بے اختیارانہ رو رہا تھا۔ ثریا نے بہ مشکل اتنا کہا "ایسی ناامیدی کی باتیں نہ کرو اب تم سو جاؤ" علیم نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ثریا کے منع کرنے سے آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد علیم سو گیا۔ مگر ثریا تمام رات جاگتی رہی۔ صبح ہوا چاہتی تھی کہ علیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت علیم کی طبیعت سخت خراب تھی۔ تشنج کا دورا پڑا۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ ثریا ابھی علیم کو سنبھال ہی رہی تھی کہ ماما نے سلیمہ کی آمد کی خبر کی۔ علیم ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس خبر کو سن کر بیہوش ہو گیا۔ ثریا گھبرا گئی اور صفدر کو آواز دی۔ صفدر نے آکر دیکھا تو علیم ختم ہو چکا تھا۔ صفدر چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ ثریا سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ لیکن اُس کی عجیب حالت تھی کبھی صفدر کو دیکھتی اور کبھی علیم کو۔ شدتِ غم اور حیرت نے اُس کی آنکھوں میں آنسو خشک کر دیئے تھے اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے بہزار دقت اپنے آپ کو سنبھالا اور علیم کو درست کرنے لگی۔ کہ اتنے میں ماما نے صفدر سے کہا کہ "آپ دوسرے کمرہ میں چلے جائے سلیمہ بی آنا چاہتی ہیں۔"

صفدر دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ صفدر کے جاتے ہی سلیمہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور "ہائے بھائی جان" کہکر علیم سے لپٹ گئی۔ زار و قطار روتی جاتی تھی اور کہتی تھی "بھیا تم نے اپنی اس گناہ گار بہن کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ کم از کم عذرِ گناہ تو کر سکتی۔" سلیمہ کے لاش سے لپٹنے سے لاش میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور فوراً بند ہو گیا۔

(۵)

علیم کے دفن کے بعد ثریا نے سلیمہ کو علیم کا خط دیا۔ سلیمہ نے اندازِ بیتابی سے کھولا لکھا تھا۔

سلیمہ!

"واقعات ہائلہ کے بعد گو حقِ تخاطب چھن جاتا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے ایک دوسری نسبت کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس لئے اتنی جسارت کرتا ہوں۔ اور اپنے قلبی تاثرات کو آپ تک پہنچا رہا ہوں۔"

"ممکن تھا کہ میں اس وقت قسمت کی شکایت کرتا۔ لیکن نہیں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ کیونکہ قسمت کا مفہوم میرے نزدیک "جبر" و "قہر" کے سوا کچھ نہیں پھر ظلم کی صورت میں "جبر" کے متعلق کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ "بر سرِ اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد۔"

"اس دوران میں گو میں آپ سے دور رہا لیکن آپ کے دل گداز خیال کو ہمیشہ اپنے سے قریب رکھا۔ اور آج اُسی کی وجہ سے اس دنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن افسوس کہ آپ نے مجھکو اس قابل بھی نہ

رکھا کہ قرب روحی کے خیال سے اپنے آپ کو کچھ مسرور رکھ سکوں۔ کیونکہ روح کا مفہوم میرے نزدیک اس سے زیادہ نہیں کہ ترکیب جسمی سے ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ اور میرے خیال میں یہی ہر شئے کی معراج ہے کہ جو ذرّے کسی وقت انجذابی حالت پیدا کرلیں۔ انتشار کے عالم میں پھر اُسی فضائے لامحدود میں محو رقص ہوں۔"

"آپ کو میری باتیں عجیب معلوم ہوں گی لیکن چونکہ میں نے آپ کو اسقدر تعلیم دیدی تھی کہ آپ ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں گی۔ میرے خیالات دماغی فریب نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جنکو میں نے تجربہ کی کسوٹی پر کسا ہے۔ آپ کی محبت نے مجھکو ولی بھی بنایا اور رند مشرب بھی۔ لیکن مجھے دونوں صورتوں میں ایک ہی حالت نظر آئی۔ سکون نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ بلکہ دنیا میں ہر طرف دھوکہ اور فریب کا جال پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس دام کے اسیر مختلف الحیثیت ہیں۔ کوئی اسیرِ دامِ جبر ہو کر بھی اپنی متعلق خیال اسیری نہیں لاتا۔ اور کوئی پھڑ کتا ہے۔ اور مضطرب و بیقرار ہوتا ہے۔ ایسے اسیر کے لئے قیدِ حیات پہ قیدِ محبت بڑھا دیتے ہیں تاکہ مانوسِ قفس ہو جائے۔"

"میرے نزدیک اگر میری عمر میں فطرت نے کہیں رحم سے کام لیا ہے۔ تو یہ میری موت کا معاملہ ہے۔ میں ممنون ہوں اور بیحد ممنون۔ یہاں تک پہونچنے میں میرا گناہ صرف اتنا تھا کہ آپ کے مواعید پر یقین لے آیا۔ اور اپنے آپ کو ان کی رو میں بہا دیا۔ فقدانِ محبوب انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اور میری دانست میں کسی کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے زیادہ زبردست حربہ "غیر محسوس طاقت" کے پاس بھی افراقِ محبوب و محبّ ہے۔"

"میں آپ کو کسی قسم کا الزام نہیں دیتا۔ کیونکہ میں "ازل" سے "شرارِ آرزو" صرف جلنے کیلئے لایا تھا۔ میرے خیالات آپنے ملاحظہ فرمالئے۔ میں نے اُن کا اظہار نہایت دلیری سے محض اس وجہ سے کردیا کہ اگر آپ کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں میری محبت باقی ہو تو آپ اُس کو نکال دیں۔ اور خواہ مخواہ "دعا" یا "ثواب" کے نام سے میرے لئے زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ کیونکہ دعا کا مفہوم میرے نزدیک "دماغی فریب" سے زیادہ نہیں۔ اور میں آپ کی نظر میں اپنی اصلی صورت میں دکھائی دوں۔ اور کسی قسم کی عنایت کا مستحق قرار نہ پاؤں۔"

"علیم"

(۶)

خط دیکھ کر سلیمہ کی طبیعت اس قدر خراب ہوئی کہ پھر وہاں ایک منٹ نہ ٹھہر سکی۔ اور پہلی گاڑی سے پیلی بھیت روانہ ہو گئی۔

سیوم کے بعد ثریا نے بھی صفدر سے اجازتِ سفر چاہی۔ صفدر کا جی نہ چاہتا تھا لیکن ثریا کے اصرار نے اُس کو بھی مجبور کر دیا۔ وداع کا منظر نہایت دل خراش تھا اور ثریا کے ان الفاظ نے کہ "میں نے آپ کی امانت کو آپ تک پہونچا دیا۔ لیکن آپ مجھے خالی ہاتھ واپس کر رہے ہیں" صفدر کو سخت بیتاب بنا دیا تھا۔

ثریا جس وقت میرٹھ سے چلی اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ بمبئی پہونچتے پہونچتے شدید ہو گیا۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن بخار نہ اُترنا تھا نہ اترا۔ اور تیسرے دن ثریا نے بھی اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

محمد ذو الفقار کیفی

سمن بغرض قرار داد اُمور تنقیح طلب

(آرڈر ۵ قاعدہ ۲۰ ضابطہ دیوانی)

مقدمہ نمبر ۷۹ ۱۹۳۱ء ابتدائی معمولی

بعدالت جناب منصف صاحب بہادر بہرائچ مقام بہرائچ

رام کشن عمر تخمیناً ۵۰ سال ولد داوری قوم کوری ساکن موضع فتحپور رنگبی پرگنہ چردہ تحصیل نانپارہ ضلع بہرائچ مدعی

بنام { ۱۔ سردار کرم سنگھ تعلقدار ریاست جمدان ساکن موضع جمناں
۲۔ لال محمد عمر تخمیناً ۵۴ سال ولد بختاور قوم پٹھان ساکن موضع جمناں بھونیاں پور } پرگنہ چردہ تحصیل نانپارہ ضلع بہرائچ مدعا علیہم

واضح ہو کہ مسمی رام کشن مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ہرجہ پیداوار مالیتی $\frac{۵}{۳/۵}$ کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۲ ماہ جولائی ۱۹۳۱ء وقت ۱۰ بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جملہ دستاویزات کو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع ہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ تمہاری غیر حاضری میں مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۹ ماہ مئی ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

مہر عدالت

دستخط حاکم بخط انگریزی

زبان اُردو کے تنزل کے اسباب اور ہندوستانی اکاڈمی

(گزشتہ سے پیوستہ)

آج کل اُن انگریزی داں حضرات کے مضامین میں جنھیں زبان اُردو پر عبور نہیں ہے۔ بہت سی فروگذاشتیں اور غلطیاں نظر آتی ہیں۔ یہ غلطیاں عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(الف) غلطیاں جو زبان انگریزی میں سوچنے اور انگریزی محاورات پر عبور رکھنے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

(ب) غلطیاں جو زبان اُردو کے محاورات سے نابلد ہونے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

(الف) اول الذکر غلطیاں بہت رائج ہیں۔ بہ اعتبار نوعیت کے ان کی سات قسمیں ہیں۔

۱۔ پہلے انگریزی میں سوچ کر اپنے مفہوم کا اُردو میں ترجمہ کرنا اور کسی انگریزی لفظ کے وہ معنی قرار دیدینا جو عموماً مدارس انگریزی میں لڑکوں کو بتائے جاتے ہیں۔

مثلاً رسالہ ہندستانی بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲ سطر ۲ "یوں لکھا ہوا دیکھا ہے"۔ یہاں "لکھا ہوا" غالباً انگریزی لفظ (WRITTEN) کا ترجمہ ہے۔ اسکولوں میں اس لفظ کے معنی "لکھا ہوا" بتاتے ہیں۔

۲۔ ایک اردو لفظ کو کسی انگریزی لفظ کا ہر حیثیت سے مترادف قرار دیدینا اور یہ فرض کرلینا کہ جن محاوروں اور بندشوں میں انگریزی لفظ استعمال ہوتا ہے وہاں وہ اُردو لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ کسی دو زبانوں میں ایسے دو الفاظ کا ملنا ناممکن ہے جو ہر حیثیت سے ہر محاورہ میں اور ہر بندش میں ایک ہی مفہوم رکھتے ہوں۔

ملاحظہ ہو رسالہ ہندستانی بابت ماہ جنوری ۳۱ء۔ صفحہ ۲۔ سطر ۱۰

"ہر مقام پر اشارہ کردیا گیا ہے"۔ "Has been pointed out at all places"

صفحہ ۲ سطر ۱۱۔ "مختفی فارسی کی چیز ہے"۔ a thing of persian

۳۔ انگریزی بندشوں کا اُردو میں بغیر سمجھے بوجھے ترجمہ کردینا اور یہ فرض کرلینا کہ دو مختلف زبانوں کے الفاظ جو ایک محاورہ میں متحد المفہوم ہیں وہ ہر محاورہ میں متحد المفہوم ہیں۔

رسالہ ہندستانی صفحہ ۲ سطر ۱۶ "تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا" "Without any difficulty"

" صفحہ ۲ سطر ۱۷ فارسی والے " "The persians"

" صفحہ ۱ سطر ۱۴ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ کتاب اور رسالوں میں راہ پا گئی۔

WHEN A MISTAKE IS REPEATED IT FINDS ITS WAY INTO BOOKS AND JOURNOLS

۴۔ انگریزی محاورات اور ضرب المثل فقروں کا ہو بہو ترجمہ کر دینا۔

رسالہ ہندستانی صفحہ ۲ سطر ۱۴ عادت کے بندے "SLAVES of habits"

" صفحہ ۱ سطر ۱۴ راہ پا گئی found a way into

۵۔ متحد المفہوم اردو الفاظ کا غلط استعمال۔ مثلاً اگر کسی مفہوم کے ادا کرنے کیلئے انگریزی میں صرف ایک لفظ ہے اور اردو میں اس مفہوم کی نوعیت کے اعتبار سے دو یا زیادہ الفاظ ہیں تو ان الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کر دیا۔ مثلاً انگریزی لفظ Generations کے دو مترادف الفاظ ہیں۔

(A) پشت جسکا اطلاق پچھلی "Generation" پر ہوتا ہے۔

(B) نسل جسکا اطلاق اگلی "Generation" پر ہوتا ہے۔

نسل کو پشت کے معنی میں استعمال کرنا مذکورہ بالا غلطی ہے۔

انگریزی لفظ (SOME) کے دو مترادف ہیں کچھ اور کوئی۔ مگر انکا استعمال جدا جدا ہے۔

رسالہ ہندستانی صفحہ ۳ سطر ۲ "کوئی فرق نہ رہا" یہاں "کچھ" کا موقع ہے۔

۶۔ انگریزی (Figures of Speech) کا اردو میں نقل کرنا اور اردو کی صحت بندش کو بالکل نظر انداز کر دینا۔

رسالہ ہندستانی صفحہ ۱ سطر ۱۰ "غلطی کی پیروی کرنا" یہ جملہ غلطی کرنیوالوں کی پیروی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک وصف اضافی اسم ذات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۷۔ انگریزی تخیل کی وجہ سے اردو زبان کو محدود اور تنگ سمجھکر نئے نئے محاورات اور الفاظ گڑھنا اور صحیح الفاظ محاورات جو اردو زبان میں موجود ہیں ان سے قطعاً نابلد ہونا۔

ہندستانی بابت ماہ جنوری سنہ ۳۱ء صفحہ ۳ سطر ۲۰ آگے والے اگلے

" صفحہ ۱ سطر ۵ شائستہ زبان "شستہ زبان مضامین"

" صفحہ ۴ سطر ۲۲ اس حرف کا نمایندہ اس حرف کا قائمقام۔ اس حرف کی جگہ پر

(ب) وہ غلطیاں جو زبان اُردو سے نابلد ہونیکی وجہ سے ہوئی ہیں۔

(۱) املا کی غلطی۔ اس کی متعدد مثالیں ملیں گی۔ لہذا یہاں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ بعض انگریزی الفاظ جو اُردو کے خط میں لکھے جاتے ہیں۔ ان کے املا میں بھی غلطی کی جاتی ہے۔

مثلاً اکیڈمی (ACADEMY) جس کا تلفظ (ACADEMI) ہے اُس کو اکیڈمي لکھنا ظاہر ہے کہ اس املا میں دوسری (ی) بالکل غلط ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ "ہندستانی"

(۲) تذکیر و تانیث کا غلط استعمال۔ اس کی بھی متعدد مثالیں ملیں گی۔

ملاحظہ ہو ادبی دنیا بابت ماہ فروری ۳۰ء صفحہ ۱۴۰ کالم ۱ سطر ۲۔ "یہ تاریکی اُس کا رفیق تنہائی بن گئی تھی۔" اس میں "اس کی رفیق تنہائی" ہونا چاہیئے۔

(۳) حرف ربط اور حرف جار کا غلط استعمال

ملاحظہ ہو رسالہ ہندستانی بابت ماہ جنوری ۳۱ء صفحہ ۱ سطر ۱۵ "لکھاوٹ میں ترمیم" میں کی جگہ "کی" ہونا چاہیئے۔

(۴) صیغہ کا غلط استعمال

ملاحظہ ہو رسالہ ہندستانی صفحہ ۱ سطر ۸ "اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی میں سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔" اس جملہ کو یوں لکھنا چاہیئے۔ "اگر قاعدے معین نہ ہونگے ...... تو اندیشہ ہے۔"

(۵) واحد اور جمع کا غلط استعمال۔ مثلاً "مکھیا کی جمع مکھیوں لکھنا۔ اگر یہ جمع صحیح مان لی جائے تو دریا کی جمع دریوں ہو جائیں گی۔

(۶) اسماء کے ساتھ ایسے افعال کا استعمال جو خلاف محاورہ ہیں۔ مثلاً۔ رسالہ ہندستانی بابت ماہ جنوری ۳۱ء صفحہ ۳ سطر ۶ "تدبیر یہ ٹھری" اس کی جگہ پر تدبیر سوجھی یا تدبیر کی گئی استعمال ہوتا ہے۔

(۷) متروک اور عامیانہ الفاظ اور محاورات کا استعمال۔ مثلاً "پس"۔ "اپنے تئیں"۔ "بعضے لفظ" وغیرہ۔

(۸) حروف معنوی۔ ایسے۔ یہ۔ وہ۔ یہاں۔ وہاں ...... وغیرہ کا غلط استعمال۔

مثلاً میرے یہاں ایسا ہوتا ہے۔ جبکو یوں لکھنا چاہیئے "ہمارے دہاں ایسا ہوتا ہے۔"

(۹) کسی لفظ یا جملہ کو غلط معنوں میں استعمال کرنا۔

ملاحظہ ہو ہندستانی بابت ماہ جنوری ۳۱ء صفحہ ۳ سطر ۱۳ "سوا اس کے کہ اس موقع پر "البتہ" بولتے ہیں۔

(۱۰) ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرنا۔ اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔

(۱۱) اردو ونشست الفاظ کو نظر انداز کر کے اجنبی نامانوس اور ناموزوں الفاظ جمع کر دینا۔

ملاحظہ ہو ہندستانی بابت ماہ جنوری ۳۱ء صفحہ ۲ سطر ۱۱ "ابتدا اور ریچ"۔ اس موقع پر شروع یا درمیان ہونا چاہیئے۔

(۱۲) اردو محاورات اور الفاظ کا غلط مفہوم سمجھنا۔ اُن کو غلط معنوں میں استعمال کرنا اور ان کے استعمال میں غلطی کرنا۔

(۱۳) اردو محاورات صنائع بدائع اور خصوصیات زبان کو یک قلم بھول جانا اور اس وجہ سے انکو تحریر میں استعمال نہ کرنا۔ ایک انگریزی داں جب اردو کے بہت سے محاورات اور الفاظ بھول چکا ہے تو وہ ایک نیا محاورہ گڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کو توسیع زبان سمجھتا ہے۔ اور اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو یہ نیا محاورہ گڑھنا توسیع زبان نہیں ہے۔ بلکہ تخریب زبان ہے اگر دس محاورے بھول جانے کے بعد کسی نے ایک نیا محاورہ بنا بھی لیا تب بھی اُن سے نو محاوروں کا خون کیا۔

زبان کی ایسی غلطیوں سے بچنے کے لئے ہم سب لوگوں کا فرض منصبی ہے کہ ہم سب مل کر جس طرح ممکن ہو زبان اُردو کی اصلاح کریں۔ اس میں اپنے احباب کی خوشنودی مزاج کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ اور اپنی مادری زبان کے مقابلہ میں ہر ذاتی نفع کو قربان کر دینا چاہیئے۔

میرے خیال میں اگر حسب ذیل طریقوں پر عمل کیا جائے تو کچھ اصلاح ممکن ہے۔

(۱) انگریزی مدارس میں ہر مضمون کی تعلیم زبان اردو میں ہونا چاہیئے اور انگریزی کو بہ حیثیت ایک غیر زبان کے پڑھانا چاہیئے۔ یہ کام ہم لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔ اس کو صرف صیغۂ تعلیم کے معزز حضرات کر سکتے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ وہ مقتدر ہستیاں جنھوں نے تعلیم کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اُردو کی حالت پر رحم کھا کر اس زبان کو پستی سے اُٹھائیں گی۔ اور ہم لوگوں کو اظہار شکریہ کا موقع دینگی۔

(۲) اُردو لٹریچر کو اُردو کا لٹریچر سمجھکر پڑھنا چاہیئے۔ نثر و نظم کی تعلیم اُنھیں اُصول پر ہونا چاہیئے جن اصول پر زبان انگریزی کی تعلیم ہوئی ہے۔

(۳) صرف وہ استاد اردو پڑھانے کے لئے مقرر کئے جائیں جنکو زبان اردو کا مذاق سلیم ہو۔ جو اُردو میں سوچنے کے خوگر ہوں اور محاورات زبان پر عبور رکھتے ہوں۔

(۴) اُردو کی نئی اور غیر مانوس ترکیبوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

(۵) اردو زبان کے محاورات۔ بندش الفاظ۔ استعمال الفاظ۔ مفہوم الفاظ طرز ادا اور خصوصیات

زبان پر ایک جامع رسالہ تحریر کیا جائے۔ یہ کام اکاڈمی کی کوشش سے بآسانی ہو سکتا ہے۔

(۶) اردو زبان کی فیلو لوجی اور املا کے جدید طریقوں پر کوئی مضمون اکاڈمی کے رسالہ میں اُس وقت تک نہ شائع کیا جائے۔ جبتک اُس سے زبان کی ترقی نہ مقصود ہو۔ یہ غیر ضروری باتیں اُس وقت کیلئے اُٹھا رکھی جائیں۔ جب لوگوں میں مذاق سلیم پیدا ہو جائے۔ یہ عام باتیں تو ایک جرمنی کا باشندہ بغیر اردو زبان جانے ہوئے لکھ سکتا ہے۔

(۷) اصطلاحیں اور نئی بندشیں بالفعل نہ گڑھی جائیں۔ پہلے اپنی زبان کی موجودہ بندشوں اور اصطلاحوں کو باقاعدہ منضبط کیا جائے۔

(۸) جدید سائنس کے پڑھانے میں انگریزی اصطلاحات استعمال کیجائیں۔ جب زبان اُردو میں تعلیم ہو گی۔ اور استادوں میں مذاق سلیم پیدا ہو جائے گا تو نئی اصطلاحیں خود بخود عالم وجود میں آ جائیں گی اور ایسے باکمال حضرات ملجائیں گے جو اُن اصطلاحوں کی صحت اور فصاحت کا خیال رکھیں گے۔ کبھی کسی ملک کے باشندوں نے سائنس کے اصطلاحات ایک ساتھ نہیں وضع کئے۔ بلکہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود بخود نئے اصطلاحات زبان میں داخل ہو گئے۔

(۹) اکاڈمی کے اُصول میں حسب ذیل اصول کا اضافہ کر دیا جائے۔

(الف) اکیڈمی کے اُردو رسالہ میں صرف وہی مضامین شائع ہوں گے جن کی زبان اُردو ہو گی اور ان میں صرف اُردو کی بندشیں اور اُردو کے محاورات استعمال کئے جائیں گے۔

(ب) اکیڈمی کے بورڈ آف اڈیٹرس کسی نئے لفظ یا فقرے کو بغیر اردوداں حضرات کی منظوری کے رسالہ میں نہ استعمال کریں گے۔

(ج) چونکہ ڈرامہ کے ذریعہ سے اُردو زبان کی ترویج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیجا سکتی ہے اس لئے ڈرامہ پر ہر سال خاص توجہ کی جائے گی۔

اکاڈمی نے جو رسالہ بابت ماہ جنوری شائع کیا ہے۔ اُس میں زبان کی بہت زیادہ غلطیاں موجود ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس رسالہ کے قابل مضمون نگار حضرات کس طرح زبان انگریزی سے اس حد تک متاثر ہو گئے کہ اردو کی بندشیں قریب قریب بھول گئے۔

پہلے پانچ صفحوں میں زبان کی تنانوے غلطیاں ہیں۔ جن میں سے بعض یہاں تحریر کر رہا ہوں۔ باقی اور مضمون کی غلطیاں ان کو بھی میں عنقریب پیش کرونگا۔

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۱	۱	۱	ہندستانی	غلط لفظ ہے اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنیکے لئے "ہندوستانی" لکھتے ہیں۔ البتہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ محض نام ہی اور اسکے کوئی معنی نہیں ہیں تو "ہندستانی" بھی صحیح ہو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انگریزی لفظ Hindustan کا تلفظ استاد دماغ میں سما گیا ہے کہ اردو تلفظ بالکل فراموش ہو گیا۔ اسکی مثال ویسی ہو جیسے کوئی انگریز ہندوستانیوں کی صحبت میں رہ کر لفظ Engine کا تلفظ انجن کرنےلگے اور اُس کا املا Injan لکھے قافیہ کی ضرورت سے البتہ ہندستانی لکھ سکتے ہیں۔	ہندوستانی
۲	"	۲	تماہی	خود ساختہ لفظ جو اردو میں بالکل ناموزوں ہی اگر کسی کو زبان اُردو کا تھوڑا بھی مذاق سلیم ہو تو وہ بھول کر بھی فارسی لفظ ماہی کے ساتھ تے نہ استعمال کریگا۔ اس کی مثال ایسی ہو جیسے کوئی Triangular Field کی جگہ Three angular Field استعمال کرے یا (Bi-weekly) کی جگہ Bicycle-Halfweekly کی جگہ (Two Cycle (Biennial Plant) کی جگہ	

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
				(Two ennial Plant) کے۔ علاوہ بریں اردو میں لفظ "تہ ماہی" ضرور ہے گر وہ صرف مردے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔	سہ ماہی
۳	۱	۶	ہر زبان کے لئے ضروری ہے کہ اُسکے املا کے قاعدے منضبط ہوں۔	اس جملہ کی بندش انگریزی ہے جو زبان اردو کیلئے قطعاً ناموزوں ہے۔ لفظ ضروری کے لئے " یہ بات " " یہ امر" ہونا چاہیئے تھا۔	ہر زبان کیلئے اُسکے املا کے قاعدوں کا منضبط ہونا نہایت ضروری ہے ہر زبان کے لئے یہ امر....
۴	۱	۶	منضبط ہوں	اس فقرے کے دو معنی ہوسکتے ہیں (۱) قواعد پہلے سے موجود ہوں۔ (۲) از سرِ نو مرتب کئے جائیں۔ دونوں حالتوں میں طرزِ ادا ناموزوں ہے۔	(۱) موجود ہوں (۲) منضبط کئے جائیں۔
۵	"	۷	اگر قاعدے معین نہوں	صیغہ کا استعمال غلط ہے	اگر قاعدے معین نہونگے
۶	"	۸	یکسانی	یہ لفظ اردو میں نہیں استعمال ہوتا ہے۔ غالباً لفظ یکساں سے یائے مصدری لگا کر بنایا گیا ہے۔ ایسے نئے لفظوں کا استعمال بالکل غلط ہے۔ چونکہ جملے کی بندش انگریزی ہے۔ اسلئے اس عجیب لفظ کی ضرورت پڑ گئی ہے۔	یکجہتی (قریب قریب صحیح)
۷	"	۸	تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے	اس جملہ کے الفاظ نامانوس ہیں۔ بندش مہمل ہے۔ طرزِ ادا بالکل انگریزی ہے۔ یکرنگی کے لئے صدمہ پہنچنا نہیں استعمال ہوتا۔ اندیشہ ہوگا غالباً لفظ (Apprehended) کا ترجمہ ہے۔ صدمہ پہنچنا صرف مادی چیز کے لئے استعمال	تو اس بات کا امکان ہے کہ زبان کی یکرنگی میں نقص آجائے۔

اصلاح	اعتراضات	غلط الفاظ	سطر	صفحہ	نمبر
	ہوتا ہے۔ غالباً انگریزی زبان میں سوچنے کی وجہ سے اس جملہ کی بندش ایسی خراب ہوگئی ہے۔		۸	۱	
اندیشہ ہے۔	اردو زبان میں "اندیشہ ہوگا" کبھی نہیں استعمال ہوتا ہے۔	اندیشہ ہوگا	۹	۱	
اردو زبان اس سے مستثنیٰ نہیں	اس جملہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزز مضمون نگار صاحب خود اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ اب تک زبان میں کوئی نقص نہیں آیا مگر اندیشہ ہے کہ آگے چلکر پیدا ہو جائے۔ جب یہ امر تسلیم ہے۔ تو پھر قواعد کے منضبط کرنے کی کیا ضرورت۔ انگریزی زبان میں البتہ ایک محاورہ ہے۔ (Is in danger of) غالباً یہ جملہ بھی انگریزی تخیل کا نتیجہ ہے "اسوقت" کے بجائے "اس قسم" لکھنا غیر فصیح ہے۔ اگر اس وقت کی جگہ آجکل لکھا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔	اور اردو اسوقت اس قسم کے خطرے میں ہے۔	۹	۱	
شستہ۔ باقاعدہ	شائستہ بھی غالباً لفظ (Civilised) کا ترجمہ ہے ایک قوم کو (Civilised) کہہ سکتے ہیں اور اس مفہوم کے ادا کرنے میں "شائستہ" اس کا مترادف ہے۔ مگر یہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ "شائستہ" کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہو سکتا ہے جس کے لئے ہم (Civilised) استعمال کر سکتے ہیں۔	شائستہ زبان	۱۰	۱	
اردو داں حضرات	دیہاتی زبان ہو یا انگریزی نقل کرکے (The English	اردو والے	۱۱	۱	

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۱۱	۱	۱۱		The French کے طریقہ پر یہ لفظ بنا لیا گیا ہے۔	اردو بولنے والے
۱۲	۱		اپنے تئیں	متروک - بعض دیہاتوں میں البتہ بولتے ہیں	اپنے آپکو (دہلی) آپ کو - خود (لکھنؤ)
۱۳	"	۱۵	لکھاوٹ میں ترمیم	دو غلطیاں ہیں (۱) لکھاوٹ ٹھیٹ ہندی ہے اور ترمیم عربی۔ اس لئے یہ بندش بالکل ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔ (۲) حرف جار "میں" کا استعمال غلط ہوا ہے۔	لکھاوٹ کی ترمیم طرز تحریر کی اصلاح
۱۴	"	۱۸	غلطی کی پیروی	محاورہ کے خلاف ہے غلطی اور سچائی وغیرہ کی پیروی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ آدمی کی پیروی ہوتی ہے۔	(۱) وہی غلطی کرنے لگتی ہیں۔ (۲) اسی غلطی کا اعادہ کرنے لگیا۔
۱۵	"	۱۹	غلطی کی تکرار ہوئی	صحیح - مگر غیر فصیح	غلطی کا اعادہ ہوا غلطی بار بار کی گئی۔
۱۶	"	۱۹	اخباروں میں راہ پا گئی	یہ انگریزی Found Away Into کا لفظی ترجمہ ہے جو اردو میں غیر فصیح ہے۔	داخل ہو گئی
۱۷	"	۱۹	جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی	صیغہ کا استعمال غلط ہے۔ یہاں صیغہ ماضی کا موقع نہ تھا اردو میں اس موقع پر صیغہ حال استعمال کرتے ہیں۔ جملہ کی بندش بالکل ناموزوں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو کا مذاق مفقود ہو گیا ہے۔	جب ایک ہی غلطی بار بار کیجاتی ہے تو وہ اکثر کتابوں اور اخبار میں داخل ہو جاتی ہے
۱۸	"	۱۸	بغیر تحقیق کئے ہوئے	صیغہ کی غلطی "ہوئے" کا استعمال غلط ہے۔ اسکی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔	(۱) بغیر تحقیق کئے (۲) بغیر تحقیق کے (۳) بلا تحقیق۔

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۱۹	۲	۱	سند ہو گئی	غلط صیغہ	سند ہے یا سند ہوتی ہے
۲۰	"	۲	یوں لکھا ہوا دیکھا ہے	"ہوا" غلط ہے۔ غالباً زبان انگریزی میں سوچنے کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ یہ انگریزی فقرے Has seen written کا ترجمہ ہے۔ چونکہ written فعل write کا Past Participle ہے اور اس کے معنی مدارس میں لکھا ہوا بتائے جاتے ہیں اس لئے ترجمہ کرتے وقت اُس کے معنی لکھا ہوا قرار دئے گئے۔	یوں لکھا دیکھا ہے
۲	"	۱ اور ۲	عوام کیلئے یہ ایک بڑی سند ہو گئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔	اس جملے کی بندش مہمل ہے۔ اس میں ہر صنف کی غلطیاں موجود ہیں۔	جب عوام کسی غلط لفظ کا استعمال کسی کتاب یا اخبار میں دیکھتے ہیں تو اس کو سند سمجھنے لگتے ہیں۔
۲۲	"	۳	بہت کم ہوتی ہے	غلط صیغہ	بہت کم ہے
۲۳	"	۴	عادت کی بندگی کا ہوتا ہے	خود ساختہ محاورہ Slaves of their own habits کا ترجمہ ہے جیسے کوئی اس اُردو محاورہ کا "اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے" انگریزی میں ترجمہ کرے Parrots of his hands flew away علاوہ بریں Slave of habit کے معنی مقلد کے کسی طرح نہیں ہو سکتے اگر یہ جملہ صحیح بھی مان لیا جائے تو	

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
				تو اُس کا اطلاق اُس شخص پر ہو گا جو کسی کا پیرو نہ ہو بلکہ اپنی عادت کے موافق کام کرتا ہو۔	
۲۴	۲	۵	پس	متروک	لہذا۔ اسواسطے۔ اسلئے
۲۵	۲	۷	ہر ممکن ذریعہ سے	غلط محاورہ All possible methods کا ترجمہ	جسطرح بھی ممکن ہو۔ ہر امکانی طریقے سے
۲۶	۲	۹	مختفی ہ	غلط محاورہ۔ ایک ثقیل عربی حرف "ہ" کے پہلے بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔	ہائے مختفی
۲۷	۲	۱۰	تلفظ سے بحث ہو	اردو زبان میں بحث اس معنی میں نہیں استعمال ہوتا ہے۔	(۱) تلفظ کا تعلق ہو۔ (۲) تلفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے
۲۸	۲	۱۱	فارسی کی چیز ہے	"چیز" کو اس معنی میں استعمال کرنا بالکل غلط ہے۔ غالباً معزز مضمون نگار نے چیز کا وہی مفہوم سمجھا ہے جو انگریزی لفظ Thing کا ہے۔ یہ ویسی ہی غلطی ہے جو غیر اردو داں حضرات کیا کرتے ہیں۔ یعنی پہلے کسی خاص محاورے کی وجہ سے Thing کو چیز کا مترادف قرار دیکر "چیز" کو ہر اس جگہ پر استعمال کر دیا جہاں انگریزی لفظ Thing استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک بچہ A fat rat سے "Fat" کا مفہوم موٹا اخذ کرلے اور اس مفہوم کی بنا پر موٹی کتاب کا ترجمہ A fat book کردے۔	(۱) فارسی کا حرف ہے (۲) ایک حرف ہے جو فارسی کے لئے مخصوص ہے۔ (۳) اصل میں فارسی ہے۔

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۲۹	۲	۱۲	ابتدا یا بیچ	محاورہ کے خلاف ہے۔ عربی اور ٹھیٹ ہندی الفاظ کو ایک ساتھ جمع کر دینا غیر فصیح ہے۔ علاوہ اس کے لفظ بیچ متروک ہے	شروع یا درمیان
۳۰	"	۱۴	بعضے فارسی لفظ	دیہاتیوں کی زبان ہے بعضے بالکل غلط ہے۔ لفظ کو جمع میں لکھنا چاہئیے۔	بعض فارسی الفاظ
۳۱	"	۱۴	کہ اُن کے	کہ۔ اُنکے سراسر غلط ہے۔ اردو میں یہ ترکیب ناجائز ہے۔	جن کے
۳۲	"	۱۵	آخر میں ایک ک تھا	ایک زائد ہے۔ غالباً INDEFINITE ARTICLE کا ترجمہ ہے۔	آخر میں ک تھا
۳۳	"	۱۴ اور ۱۵	البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پرانی فارسی زبان میں انکے آخر میں ایک ک تھا	نشست الفاظ ناموزوں ہے۔ اردو میں یہ ترکیب ناجائز ہے۔	البتہ فارسی قدیم پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض فارسی الفاظ کے آخر میں ک تھا
۳۴	"	۱۶	اور پھر گر گیا	اور پھر دونوں حروف عطف ہیں۔ انکا استعمال ایک ساتھ ناجائز ہے۔ گر گیا زیادہ فصیح نہیں ہے۔	پھر ساقط ہو گیا پھر گرا دیا گیا
۳۵	"	۱۶ اور ۱۷	تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا۔	دقت کا استعمال غیر ضروری ہے۔ اردو میں دقت کا مفہوم انگریزی لفظ دقت (DIFFICULTY) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ انگریزی میں کہہ سکتے ہیں WITH OUT ANY DIFFICULTY مگر اردو میں اس کا لفظی ترجمہ غیر فصیح ہے۔	تو وہ اسی طرح قائم رہا

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۳۶	″	۱۸	وقت ان لفظوں کی کتابت میں آپڑی	اول تو اس میں تعقید ہے۔ دوسرے "آپڑی" دیہاتی محاورہ ہے۔	ان لفظوں کی کتابت میں البتہ وقت ہوگی۔
۳۷	۲	۱۹	عام قاعدوں کے بموجب	یہ لفظ "حکم" کے ساتھ مستعمل ہے۔ بموجب حکم کے	عام قاعدوں کے موافق
۳۸	″	۲۰ ۲۱	مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لیجئے بندہ پرانی فارسی زبان میں بندگ تھا	یہ اس فقرے کا ترجمہ ہے۔ (FOR EXAMPLE TAKE A WORD) اردو میں ایسا کوئی محاورہ نہیں ہے "مثال کے طور پر" قطعاً غلط ہے۔ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "مثلاً" بولتے ہیں۔ اردو زبان میں لیجئے کبھی SUPPOSE کے معنی میں نہیں استعمال ہوتا۔ یہ بھی ویسے ہی غلطی ہے کہ ایک آدمی کسی خاص محاورے کی بنا پر "لینے کو" TAKE کا مترادف قرار دے۔ اس کے بعد لفظ "لینا" کو ہر اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے استعمال کرے جس کے واسطے زبان انگریزی میں (TAKE) استعمال ہوتا ہے مثلاً TAKE FOOD کا ترجمہ "کھانا لیجئے" کرے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "لفظ کو لیجئے" کی غلط ترکیب صحیح ہے تو محاورہ زبان کے اعتبار سے "کو" غلط ہو جائے گا۔ اس حالت میں یوں لکھیں گے۔ صرف ایک لفظ لیجئے۔	اس طویل اور غیر فصیح فقرے کی جگہ پر صرف ایک لفظ مثلاً کافی ہے۔ مثلاً "بندہ" پرانی فارسی میں .... تھا یا صرف ایک مثال لکھنا کافی ہے۔ بندہ پرانی فارسی میں ...... تھا۔
۳۹	۳	۲	کوئی فرق نہ رہا	کوئی کا استعمال خلاف محاورہ ہے۔ اردو زبان میں کچھ اور کوئی کے استعمال میں فرق ہے۔	کوئی فرق نہ باقی رہا کچھ فرق نہ رہا

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۴۰	۳	۴	عربی حرف اختیار کئے گئے۔	خلافِ محاورہ۔ "حرف" کو جمع میں لکھنا چاہیئے۔	(۱) عربی حروف اختیار کئے گئے (۲) جب کتابت عربی حروف میں ہونے لگی۔
۴۱	"	۴	تو فکر ہوئی	خلاف محاورہ۔ اس معنی میں فکر نہیں مستعمل ہے۔	(۱) تو خیال کیا گیا (۲) اس مسئلہ پر غور کیا گیا
۴۲	"	۴	اخیر حرف	دیہاتی زبان	آخری حرف
۴۳	"	۴ اور ۵	تو فکر ہوئی کہ اخیر حرف کی حرکت کو جو تلفظ کیا آتی ہے تحریر میں کیونکر ظاہر کریں	بندش بالکل غیر فصیح ہے۔ یہ غالباً زبان انگریزی کی اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ زبان اردو میں کیونکر اور کس طرح کے مفہوم میں فرق ہے۔ یہ موقع "کس طرح" کا ہے۔	تو اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ یہ آخری حرف حرکت جو تلفظ میں ادا کیجاتی ہے تحریر میں کسطرح ظاہر کیجائے
۴۴	"	۵ اور ۶	تدبیر یہ ٹھہری	خلاف محاورہ۔ لفظ تدبیر کے ساتھ "ٹھہرنا" نہیں استعمال ہوتا۔ البتہ صلاح کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً صلاح یہ ٹھہری"۔	یہ طریقہ اختیار کیا گیا یہ تدبیر سوجھی
۴۵	۳	۸	اصلی ہ	یہ ایک مبہم لفظ ہے۔ اصل میں ہائے مختفی اور نیز ہائے ملفوظ دونوں اصلی حروف ہیں۔ اس معنی میں لفظ "اصلی" کا استعمال کرنا سراسر غلط ہے۔	ہ جسکا تلفظ بہ حیثیت ایک علیحدہ حرف کے کیا جاتا ہے اسکو ہائے ملفوظ کہتے ہیں۔
۴۶	"	۹	ذکر نہیں آتا	غلط محاورہ	ذکر نہیں ہے

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۴۷	۳	۱۰	اشارہ کردیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے	اس میں دو فاش غلطیاں ہیں (۱) خلاف محاورہ ہے۔ غالبًا یہ انگریزی محاورہ It has been pointed out کا ہے اردو میں اشارہ اس معنی میں نہیں استعمال ہوتا (۲) اردو زبان میں ایسی شاید کوئی مثال نہ ملے گی۔ جس میں فعل کے بعد فاعل آتا ہو۔	یہ بات واضح کردی گئی ہے
۴۸	؍؍	۱۰ اور ۱۱	فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر اشارہ کردیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے آخر میں جو "ہ" ہے وہ "مختفی ہے یا ملفوظ"	بندش مہمل نشست الفاظ ناموزوں۔ عبارت بے ربط۔ یہ قطعًا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ زبان اردو ہے۔ البتہ موقع پہ لفظ "فلاں" استعمال کرکے مفہوم ادا کرنا بالکل نامناسب ہے اس مفہوم کو یوں ادا کرنا چاہیئے "فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں ہر اس لفظ کے سامنے جس کے آخر میں ہ ہوتی ہے یہ صاف صاف تحریر ہے کہ وہ "مختفی" ہے یا "ملفوظ"۔ اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں "فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں جب کسی لفظ کے آخر میں ہ ہوتی ہے تو اس کی نوعیت بھی تحریر کردیجاتی ہے۔ یعنی وہ (ہ) مختفی ہے یا ملفوظ۔	اعتراض کا کالم ملاحظہ ہو
۴۹	؍؍	۱۲	فارسی میں بھی املا کے متعلق احتیاط برتی جاتی ہے	لفظ "بھی" سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی املا کے متعلق احتیاط برتی جاتی ہے۔ اور چونکہ ان زبانوں کا ذکر اس فقرے میں نہیں ہے۔ اسلئے "بھی" کا استعمال غلط ہے اردو زبان میں "بھی" کے پہلے ایک دوسرے جملے کا ہونا ضروری ہے مثلاً لکھنؤ میں ایسا ہوتا ہے اور الہ آباد میں بھی ایسا ہوتا ہے۔	فارسی میں املا کے متعلق بہت احتیاط برتی جاتی ہے
۵۰	؍؍	۱۴	لکھدیا	غلط صیغہ	لکھدیا کرتے ہیں

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۵۱	۳	۲۵	اردو والے	ملاحظہ ہو اعتراض نمبر ۱۴	
۵۲	″	۱۵	خیال رکھتے تھے	جملہ غیر مکمل۔ اس کے بعد ایک اور فقرہ لیکن سے شروع ہونا چاہیئے۔	بہت خیال رکھتے تھے لیکن اب
۵۳	″	۱۶	لائق	خلاف محاورہ	قابل
۵۴		۱۷	فارسی والوں نے	ملاحظہ ہو اعتراض نمبر ۱ غالباً یہ بندش انگریزی لفظ BRITISHER کے تخیل کی وجہ سے گڑھی گئی ہے۔	اہل فارس۔ فارسی داں حضرات
۵۵	۳	۱۸	بہت سارے لفظ	(۱) لفظ "سارے" دیہاتی زبان ہے (۲) لفظ کو جمع میں لکھنا چاہیئے۔	بہت سے الفاظ
۵۶	″	۲۰	آگے والے حرف نے	انگریزوں کی زبان معلوم ہوتی ہے "اچھے والا" "بڑے والا" "اردو والے۔ آگے والے۔ پیچھے والے۔ یہ سب الفاظ غلط ہیں۔	اگلے حرف نے۔ بعد کے حرف نے
۵۷	″	۲۱	بہت سے معرب لفظوں میں دکھائی دیتا ہے۔	اردو زبان میں "دکھائی دیتا ہے" صرف آنکھوں سے دیکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اندھا ہے اُسے نہیں دکھائی دیتا ہے۔ اس موقع پر "دیکھا جاتا ہے" استعمال کرنا چاہیئے مگر یہ بھی بہت زیادہ فصیح نہیں۔	بہت سے معرب لفظوں میں پایا جاتا ہے۔
۵۸	″	۲۲	جو لفظ عربوں نے لئے	لفظ کو جمع میں لکھنا زیادہ فصیح ہے	جو الفاظ عربوں نے لئے

اصلاح	اعتراضات	غلط الفاظ	سطر	کالم	نمبر شمار
لہٰذا۔ اسلئے۔ اسواسطے	متروک	پس	۲۴	۳	۵۹
	اس فٹ نوٹ کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا بایوکم شاہسترج۔ کوسیج۔ رندج وغیرہ سب فضول ہیں۔	(فٹ نوٹ)	۱۸ تا ۲۵	//	۶۰
زبان عربی میں۔ زبان عربی کے طرز تحریر میں	خلاف محاورہ۔ غالباً AMONG THE ARABS کا ترجمہ ہے۔	عربوں کے ہاں	۲	۴	۶۱
وہاں	متروک	ہاں	۲	//	۶۲
بعض	دیہاتی زبان ہے	بعضے	۲	//	۶۳
آخر میں ہوتا ہے آخر میں آتا ہے	خلاف محاورہ۔ آپڑنا اُسوقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز اچانک ہو۔	آخر میں آپڑتا ہے	۵	//	۶۴
ہائے ملفوظ	غلط محاورہ	ملفوظ ہ	۶	۴	۶۵
زیادہ واضح نہیں ہوتا	خلاف محاورہ DEEP WELL DEEP WATERS میں "گہرا" اور DEEP کا مفہوم ایک ہے۔ لیکن اردو جملہ میں ایسا نہیں ہے۔	تلفظ گہرا نہیں ہوتا	۷	//	۶۶
چونکہ	عجیب بندش ہے اور بالکل خلاف محاورہ ہے۔ خدا جانے کس زبان کا ترجمہ ہے۔	کسواسطے کہ	۷	//	۶۷

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۶۸	"	۷	آواز کا زور اُس پر ختم ہوتا ہے	Force of the sound کا ترجمہ ہے اُردو میں ایسا کوئی محاورہ نہیں۔	چونکہ آواز اُس پر ختم ہوتی ہے۔
۶۹	"	۸	اور اس وجہ سے دھیما پڑ جاتا ہے	غالباً یہاں "زور" سے مطلب ہے۔ اس میں ذم کا پہلو ہے کسواسطے اور اسوجہ کی ترکیب بالکل غیر مانوس ہے	اصلاح نمبر ۶۷ میں ہے۔
۷۰	"	۷ اور ۸	کسواسطے کہ آواز کا زور اُس پر ختم ہوتا ہے اور اس وجہ سے دھیما پڑ جاتا ہے	بندش نامناسب ہے۔ الفاظ بے ربط ہیں۔ یہ جملہ اُردو کا نہیں معلوم ہوتا ہے۔	چونکہ آواز اُس پر ختم ہوتی ہے۔ اسلئے اسکا اثر بہت ضعیف اور ہلکا ہوتا ہے
۷۱	"	۹	یہ چیز انکی مختفی ہ سے نسبت ملتی جلتی ہے۔	اس جملہ میں بھی معزز مضمون نگار صاحب نے "چیز" کے وہی معنی سمجھے ہیں جو انگریزی لفظ Thing کے ہیں اُردو زبانیں اس مفہوم کی ادا کرنے کیلئے چیز کبھی نہیں استعمال کرتے ہیں	یہ بات اُن کی ہائے مختفی سے بہت ملتی جلتی ہے۔
۷۲	"	۱۲	کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچے میں ڈھالدیا	لفظ کے پہلے حرف اشارہ ہونا چاہیئے	کہیں کہیں ایسے لفظ کو سانچے میں ڈھال دیا۔
۷۳	"	۱۶	یہ منوس لفظ	غالباً چھپائی کی غلطی ہے "لفظ" کو جمع میں لکھنا چاہیئے۔	یہ مفرس الفاظ
۷۴	"	۱۷	جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا۔	(۱) فارسی والونکی ترکیب غلط ہے (۲) "اختیار کیا تھا" غیر فصیح ہے غالباً معزز مضمون نگار صاحب نے انگریزی جملہ Persian had adapted کا ترجمہ کیا ہے۔	جو اہل فارس کا تھا

نمبر شمار	صفحہ	سطر	الفاظ غلط	اعتراضات	اصلاح
[illegible]	۴	۱۸	اسطرح اُردو میں مختفی ہ فارسی در عربی لفظوں کے ساتھ مخصوص ہے	غالبًا معزز مضمون نگار صاحب نے یوں سوچا ہو THUS IT IS CLEAR) ورنہ اُردو میں تو کوئی جملہ "اس طرح" سے نہیں شروع ہوتا۔	اس سے یہ اندازہ ہو تا ہے کہ اُردو میں ہائے مختفی فارسی .... ہے۔
[illegible]	"	۲۰	کوئی ہنجار نہیں قائم کیا۔	"ہنجار" نامانوس لفظ ہے اور اُس پر طرہ یہ کہ "ہنجار" کے ساتھ "قائم" لکھا گیا ہے۔	کوئی طریقہ نہیں مقرر کیا
[illegible]	"	۲۰	نتیجہ یہ ہوا	غیر فصیح	جسکا یہ نتیجہ ہوا۔
[illegible]	"	۲۰	بد مذاقی پھیلی	یہ بد مذاقی نہیں ہے۔ کسی خوبی یا لطافت کے احساس میں کمی آجانے کا نام بد مذاقی ہے۔ یہاں لفظ "بدمذاقی" کا استعمال سراسر غلط ہے۔	
[illegible]	"	۲۲	اُس حرف کا نمائندہ	"حرف کا نمائندہ" کہنا بالکل غلط ہے۔ کسی انسان کا نمائندہ ہوتا ہے مگر کسی غیر مدرک چیز کا نمائندہ ہونا ناممکن ہے اگر کوئی شخص کسی کو منتخب کرکے اُس کو اس بات کا حق دیدے کہ وہ شخص اُس کی جگہ پر جو کارروائی کرے گا وہ اُسی منتخب کرنیوالے کی کارروائی سمجھی جائیگی تو ایسے منتخب شدہ شخص کو اُس آدمی کا نمائندہ کہیں گے۔ "حرف" میں انتخاب کرنیکی قابلیت نہیں ہے۔ اسلئے اسکا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ لفظ نمائندہ کو (SUBSTITUTE) کے معنی میں استعمال کرنا زبان اُردو کی فاش غلطی ہے۔	(۱) اس حرف کی جگہ (۲) اُسکا قائمقام

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۸۰	۴	۲۳	بعضے	اس پر اعتراض ہو چکا ہے	بعض
۸۱	"	۲۴	اردو والے	اعتراض ہو چکا ہے	اردو داں حضرات
۸۲	"	۲۴	سند نہیں پکڑ سکتے	"سند پکڑنا" خلاف محاورہ ہے۔	اسکو سند نہیں قرار دے سکتے۔ یہ اردو داں کیلئے سند نہیں ہو سکتی
۸۳	۵	۱	ہندی لفظ تو ایک طرف رہے۔	(۱) "لفظ" جمع میں لکھنا چاہیئے۔ (۲) "تو ایک طرف رہے" محاورہ کے خلاف ہے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کے ادا کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔ یہ عجیب فقرہ اس انگریزی فقرہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ LEAVING ASIDE ALL THE HINDI WORDS	اگر ہندی الفاظ ہائے مختفی سے لکھے گئے تو چنداں تعجب نہیں ہے۔
۸۴	"	۲	طرہ یہ کہ	اول تو اس محاورہ کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ اصل میں محاورہ یوں ہے "اُس پر طرہ یہ کہ" دوسرے یہاں پر اس محاورہ کا موقع نہ تھا۔ جب ایک مفہوم ادا کر دیا جاتا ہے تو اُس مفہوم کو پُرزور بنانے کے لئے یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ اسکی مثال یہ ہے "آپ اُردو نہیں جانتے اُس پر طرہ یہ کہ آپ قواعد زبان مرتب کر رہے ہیں۔"	(۱) لطف یہ ہے (۲) یہ عجیب تماشا ہے
۸۵	"	۳	جن کے آخر میں الف ہے وہ ے سے لکھے جانے لگے	پہلے جملے میں حال کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں ماضی کا یا تو "ہے" کو بدل کر "تھا" کیا جائے اور "یا جائینگے"	...تھا... جانے لگے ...ہے... لکھی جاتی ہیں

نمبر	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
				کی جگہ "یہ جاتے ہیں" لکھا جائے۔ عجیب بندش ہے جسکی نظیر اردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔	
۸	۵	۳	قاعدہ اس کا یوں ہے	اس فقرے میں قریب قریب ہر لفظ بے قاعدہ استعمال ہوا ہے (۱) تعقید "اس کا قاعدہ" یوں ہونا چاہیئے۔ (۲) ایسے موقع پر اسکی جگہ "یہ اس" بولتے ہیں۔ (۳) یوں کا استعمال غلط ہے۔ یہ ہونا چاہیئے۔ (۴) یہ جملہ مضمون کے اعتبار سے بھی غلط ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے سے نہ تھا۔ اسکو تو معزز مضمون نگار صاحب نے خود بنایا ہے۔ لہذا پورے جملے کے الفاظ کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ غرضکہ اس ایک چھوٹے سے فقرے میں زبان۔ قواعد اور مضمون تینوں کی غلطیاں موجود ہیں۔	میری رائے میں املا کا قاعدہ یہ ہونا چاہیئے۔
۸	"	۴	ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے	ہر کلیہ کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اُس کے الفاظ جامع ہوں۔ اور اُن میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔ اس قاعدے پر غور کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ایک ہندی لفظ کے شروع یا آخر میں کوئی حرف کیوں نہ ہو اُسکو ہمیشہ الف سے لکھنا چاہیئے۔ اب الف سے لکھنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اُس کے شروع میں الف لکھا جائے یا آخر میں۔ مثلاً کدو ایک ہندی لفظ ہے اسکو اس کلیہ کی بنا پر ہمیشہ الف سے لکھنا چاہیئے۔ چنانچہ "کدو" کو "کدوا" لکھنا چاہیئے۔ ہر قاعدے کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا چاہیئے کہ اُس سے کوئی دوسرے معنی نہ نکل سکیں۔ زبان پر قدرت رکھنے کے یہی معنی ہیں	وہ ہندی الفاظ جن کا تلفظ "آ" یا اُس کے ہم آہنگ آواز پر ختم ہوتا ہو اُن کو ہمیشہ الف سے لکھنا چاہیئے۔

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۸۸	״	۵	کسواسطے کہ یہ نام ہیں ہمیشہ سے یوں ہی لکھے جاتے ہیں	معزز مضمون نگار صاحب نے اس جملہ میں تو کمال کر دیا ہے وہ عجیب بندش اختیار کی ہے جس سے شاید کوئی اردو داں آج تک واقف نہ ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ اس جملہ میں جو دو فقرے ہیں اُنکے درمیان کوئی حرف عطف بھی نہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ عجیب جملہ عربی تخیل کا نتیجہ نہ ہو۔ لِاَنّ ھٰذہٖ اسماءُ تکتبُ دائماً ھکذا	جو اسم معرفہ ہونیکی وجہ سے ہمیشہ یوں ہی لکھے جاتے ہیں۔
۸۹	״	۷	جتنے لفظ ہیں	جمع میں لکھنا زیادہ فصیح ہے	الفاظ........
۹۰	״	۶	ناموں کے سوا	اس موقع پر "علاوہ" لکھنا چاہیئے	مقاموں کے ناموں کے علاوہ
۹۱	״	۴ لغایت ۷	(سوا بعض مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ۔ پٹنہ۔ کلکتہ کسواسطے کہ یہ نام ہیں ہمیشہ سے اسیطرح لکھے جاتے ہیں) مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ہیں انکو الف سے ہی لکھنا چاہیئے۔	یہ جملہ یوں لکھنا چاہیئے تھا:۔ وہ ہندی الفاظ جنکا تلفظ "آ" یا اُسکے ہم آہنگ آواز پر ختم ہوتا ہے۔ اُس کو ہمیشہ الف سے لکھنا چاہیئے۔ البتہ بعض مقاموں کے نام مثلاً آگرہ۔ پٹنہ۔ کلکتہ وغیرہ جن کو لوگ "ہ" سے لکھتے چلے آئے ہیں۔ ان کو اب بھی "ہ" ہی سے لکھنا چاہیئے۔ مقاموں کے علاوہ اور سب الفاظ کو الف سے لکھنا چاہیئے۔	
۹۲	״	۱۲	زیور جیسی عورتیں	زیور کیلئے باندھنا نہیں استعمال ہوتا بلکہ پہننا استعمال ہوتا	(۱) زیور جیسی عورتیں صرف

نمبر	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۹۱	۵	۱۲	صرف ایک ہی بازو پر باندھتی ہیں۔	ہے۔ عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزز مضمون نگار صاحب نے فیلو لوجی کی بنا پر لفظ ایک کے مفہوم سے یہ سمجھ لیا کہ عورتیں اکہ صرف ایک ہی بازو میں پہنتی ہیں۔ اصل میں اکہ میں صرف ایک نگ ہوتا ہے اسلئے اس کو اکہ کہتے ہیں۔ بعض عورتوں کے پاس دو دو اکے ہوتے ہیں۔ اور وہ انکو دونوں بازوؤں پر باندھتی ہیں بعض عورتیں ایک ہی بازو پر دو دو اکے باندھتی ہیں۔	ایک ہی بازو میں پہنتی ہیں یا (۲) اکہ ایک زیور ہے جسے عورتیں صرف ایک ہی بازو پر باندھتی ہیں۔ (نوٹ) دوسرے جملے میں باندھنا لکھ سکتے ہیں کیونکہ اس میں باندھنا اکہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔
۹۱	۵	۱۰	ہمارے اردو لفظ ایک سے بنا ہے	(۱) لفظ ہمارے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ لفظ بھرتی کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ جملہ کچھ بے ربط سا ہے۔ (۲) علاوہ بریں اس جملہ کا فاعل محذوف ہے۔ اسلئے بندش چست نہیں ہے۔	غالباً یہ اُردو لفظ ایک سے بنا ہے
۹…	"	۱۰	فارسی میں یہ لفظ گاڑی کے معنی میں موجود بھی نہیں	اس جملہ میں لفظ "موجود" کا غلط استعمال ہوا ہے۔ غالباً انگریزی لفظ (TO EXIST) کے مفہوم نے دھوکا دیا ہے۔	فارسی میں یہ لفظ گاڑی کے معنی میں مستعمل نہیں ہے۔
۹…	"	۱۳	جس میں ایک ہی بڑا نگینہ ہوتا ہے۔	اس فقرے سے اصلی مفہوم نہیں ادا ہو سکا۔ اس عبارت کے یہ معنی ہیں "کہ اُس میں نگینے تو بہت سے ہوتے ہیں مگر سب چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ البتہ ایک نگینہ بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اُردو میں اس مفہوم کو ادا کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔	جس میں ایک ہی نگینہ ہوتا ہے اور وہ کافی بڑا ہوتا ہے۔
۹…	۵	۱۶	مرکبوں میں بھی	اُردو زبان میں "مرکب" کبھی اس معنی میں نہیں استعمال	

شمار نمبر	صفحہ	سطر	غلط الفاظ	اعتراضات	اصلاح
۹۶	۵	۱۶	آتا ہے۔	ہوتا ہے۔ مرکب اُسے کہتے ہیں جو کئی مختلف مادی اشیاء سے ملکر بنے۔ اس کے پہلے لفظ "اسم" کہنا بہت ضروری ہے ورنہ معنی میں فرق آجائے گا۔	اسمائے مرکب میں بھی پایا جاتا ہے

خورشید احمد۔ ام اس سی

نوٹس نسبت دکھانے وجہ کی (نمونہ عام)

بعدالت جناب منصف صاحب بہادر قیصر گنج مقام بہرائچ

مقدمہ نمبر ۱۴۶ سنہ ۱۹۳۱ء متفرقات۔ خفیفہ

ٹھاکر غلام مصطفےٰ خاں ولد جنگی خاں
محمد فاروق ولد ٹھاکر عبدالواحد خاں
} اقوام پٹھان نومسلم ساکنان طاہرپور داخلی مغلہا پرگنہ قمرلود عذرداران

بنام۔ ۱۔ مسماۃ دربن دیبی بیوہ ملکچند شاہ قوم بقال ساکن بہرائچ محلہ مغل پورہ ڈگریدار

۲۔ الٰہی بخش ولد فتح محمد قوم پٹھان ساکن موضع حسین پور علاقہ ربلہ پرگنہ قمرلوپر مدیون

ہرگاہ مسمی ٹھاکر غلام مصطفےٰ خاں وغیرہ نے درخواست اس عدالت میں گذرانی ہے کہ جس کا تنقیہ منسلکہ ہے لہذا تم کو اطلاع دیجاتی ہے کہ تم اصالتاً یا معرفت کسی وکیل کے جو حالات مقدمہ سے بخوبی واقف ہو بوقت ۱۰ بجے دن بتاریخ ۴ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء اس عدالت میں حاضر ہوکر درخواست کے خلاف وجہ دکھاؤ۔ اگر ایسا نہ کروگے تو درخواست مذکور تمہاری غیرحاضری میں سماعت کی جاویگی۔

بتاریخ ۱۶ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء میری دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

مہر عدالت

دستخط حاکم بخط انگریزی

وقت حاضری بدفتر منصف صاحب بہادر بہرائچ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

ایثار

موسم سرما کی ایک تاریک رات میں، اتفاقاً، قاہرہ کے ایک بلند مرتبہ رئیس کا گزر ایک تنگ و تاریک گلی میں ہوا، اس نے ایک شکستہ دیوار کے نیچے ۱۴-۱۵ سال کی ایک نوعمر دوشیزہ کو سرگریباں دیکھا، اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس سخت سردی سے اسے محفوظ رکھ سکتی اس کے تقریباً عریاں جسم پر کچھ نشانات تھے، جو بظاہر کوڑوں کے معلوم ہوتے تھے۔

وہ رئیس یہ منظر دیکھ کر خاموش کھڑا ہوگیا، فقر و شکستگی کے اس دل ہلا دینے والے منظر نے اس کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر کیا، پھر وہ اس کی جانب بڑھا اور نہایت رفق و ملائمت سے اسنے اس نازک اندام لڑکی کا بازو ہلایا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا سر اٹھایا، اس طرح کہ وہ فرار پر بالکل تیار معلوم ہوتی تھی، اور نہ معلوم کیا سمجھ کر اس نے بیساختہ کہا۔

"میں اب واپس نہیں جاسکتی"

لیکن اس شخص کی تسکین و تسلی سے رفتہ رفتہ اس کا ڈر غائب ہوگیا اور کچھ کچھ اس کی وارفتہ طبیعت سکون پذیر نظر آئی، اس نے ایسا محسوس کیا کہ غالباً یہ شخص وہ نہیں ہے۔جس کے تخیل نے اس سے کہلوا دیا تھا کہ "میں اب واپس نہیں جاسکتی" اس احساس کے بعد اس نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن سے اطمینان ٹپک رہا تھا۔

"میں تمہارا نام دریافت کرسکتا ہوں؟"

"محترم بزرگ! میں نہیں جانتی کہ میرا نام کیا ہے؟"

"اچھا تمہیں کیا کہکر پکارتے ہیں؟"

"لوگ تو کہتے ہیں کہ مجھ مجہول الحال کو کہیں سے اٹھا لایا گیا تھا"

"کیا یہ صحیح ہے؟"

"میں نہیں کہہ سکتی، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنے ماں باپ سے صحیح طور سے واقف نہیں ہوں اور نہ یہ کہ وہ ہیں یا نہیں؟ مگر ایک آدمی سے واقف ہوں، جس نے میری پرورش کی، پالا، پوسا، اور اپنے

میں رکھا، اسی کو میں اپنا باپ سمجھتی تھی، اسے دیکھ کر میرا دل محبت و سرور کی لہروں سے لبریز ہو جاتا تھا، لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ مجھ پر طرح طرح کے عذاب توڑتا ہے، اور ایسی نت نئی تکلیفیں برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے جو کوئی باپ بھی اپنی اولاد کے ساتھ روا نہیں رکھ سکتا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کارگاہ عالم میں، میں تن تنہا ہوں، میرا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ والی ہے نہ وارث، نہ ہمدرد ہے نہ غمگسار، باہر جب کسی لڑکی کو میں دیکھتی تو اس سے پوچھتی تمہارے ماں ہے؟ وہ جواب دیتی "کیوں نہیں۔ ہماری اماں ہمیں بہت چاہتی ہیں، پیار کرتی ہیں، پیسے دیتی ہیں، اگر ہمیں کوئی مارتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتی ہیں، ہماری اماں بڑی اچھی ہیں۔" میں یہ افسانہ سنتی تو میرے غم و الم میں اور اضافہ ہو جاتا۔ میرا دل یاس و حرمان سے بھر جاتا، یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگتی کہ میرا وجود خود ایک مستقل عذاب ہے، کسی سخت گناہ کی پاداش میں، میں ننگ وجود بنا کر اس عالم آب و گل میں بھیجی گئی ہوں، اور شاید خدا اس کا انتقام میرے اس ناپاک وجود ہی سے لینا چاہتا ہے۔

ایک زمانہ ہو گیا، اور میں اپنی حالت پر قانع رہی، اس کا جور و ستم روز افزوں تھا، اور میرا صبر و شکر، آخر جب اس نے محسوس کر لیا کہ میری جبین نیاز اس سنگ در کے علاوہ کوئی اور سنگ آستان نہیں تلاش کر سکتی، تو اس کا جذبۂ جور پسندی اور ترقی کر گیا، یہاں تک کہ اب وہ مجھے سخت زد و کوب کرنے لگا، اگر معمولات کے ادا کرنے میں مجھ سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو میرا پٹنا ایک لازمی امر تھا، اس روح فرسا ستم کو بھی میں خاموشی سے برداشت کرتی رہی، تا آنکہ آج کی یہ رات درد و مصیبت کا خاص پیغام لے کر آئی، واقعہ یہ ہوا کہ آج وہ شخص کچھ ایسے سرمستی کے عالم میں آیا، اور اس نے کچھ ایسی باتیں کیں، کہ مجھے محسوس ہوا وہ اپنے جذبۂ حرص و ہوس "کو پورے طور پر" بروئے کار" لانا چاہتا ہے اور میرے ننگ و ناموس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس جوہر کو کھو دینے کے بعد میرے پاس باقی کیا رہ جاتا؟ مجبوراً میں نے فرار اختیار کیا اس طرح کہ کوئی میری جائے قرار نہ معلوم کر سکے، میں راستہ سے ناواقف ہونیکے باوجود برابر چلتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے اس گلی میں پناہ لی، جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں، دو روز گذر چکے ہیں کہ میرے کام و دہن لطف ذائقہ سے محروم ہیں، کیا آپ کی عنایت سے مجھے "نان خشک" میسر آسکتی ہے کہ میرے پانی پینے کا سہارا ہو جائے؟

اس آدمی نے مصیبت زدہ لڑکی کی یہ داستان عبرت سنی اس پر کچھ ایسا تاثر طاری ہوا کہ وہ "اپنے گریۂ بے اختیار" کو ضبط نہ کر سکا، اس کے گالوں پر آنسو موتی کی طرح ڈھلک رہے تھے، اس نے اس مصیبت زدہ اور دل فگار لڑکی کا بازو پکڑا، اور بلا کچھ کہے ہوئے روانہ ہو گیا، اپنے مکان پر پہونچکر اسنے

نہایت شریفانہ برتاؤ کیا، اور اپنے حسن سلوک سے اسے باور کرا دیا کہ اس سے زیادہ وہ کسی چیز کی تمنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس شخص کے مکان میں اس طرح داخل ہوئی کہ اپنے اخلاق و عادات شکل و شمائل اور حسن و جمال میں اپنی ہمسنوں سے بدرجہا ممتاز تھی، صاحب خانہ سے جو شخص واقف تھا وہ اس لڑکی سے بھی واقف تھا۔ کہ ایک یتیم و بینوا لڑکی ہے، اور یہ گھر اس کا ملجا و ماویٰ ہے۔

صاحب خانہ کے بھی ایک لڑکی تھی۔ جس کی تربیت جدید اطوار و اسلوب پر ہوئی تھی۔ یہ صاحبزادی بھی اپنے ذہنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک عجیب و غریب چیز تھیں، آپ کو حسن و عشق کی اخلاق کش داستانیں بہت مرغوب تھیں۔ فیشن کے بارے میں آپ "اسپشلسٹ" واقع ہوئی تھیں، کہ کون فیشن زیادہ دل کش اور مرغوب طبائع ہے، حسب خواہش جس سے چاہتیں عظمت و بزرگی کا برتاؤ کرتیں جس سے چاہتیں توہین و تذلیل روا رکھتیں اور پھر اس اصول سے والدین بھی مستثنیٰ نہیں تھے، آپکا قلب خودی، خود بینی، خود نمائی، اور، رشک و حسد کے جذبات سے لبریز تھا، کیا مجال کہ آپ کے روبرو کسی اور کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جا سکے، آپ نے جو یہ دیکھا کہ کل کی آئی ہوئی یہ نوخیز چھوکری سب کے دلوں پر عموماً اور پدر بزرگوار کے دل پر خصوصاً اپنا سکہ جما رہی ہے، اپنے خداداد حسن خلوص و حسن خلق سے لوگوں کو موہ رہی ہے تو اس سے آپ بغض للّٰہی رکھنے لگیں، لیکن نہایت چالاکی سے اپنے اس جذبۂ فاسد کو اپنی سہیلیوں سے بھی چھپائے رکھا، لیکن اپنے دل میں مستحکم ارادہ کر لیا کہ اگر موقع ہاتھ آ گیا تو چھوکری نہیں، زک دیکے رہوں گی۔ ادھر تو جذبۂ فاسد کارفرما تھا، ادھر وہ نئی آئی ہوئی الھڑ چھوکری اپنے ولی نعمت کے جذبۂ شکر و سپاس میں اس قدر غرق تھی کہ ذرا بھی نہ سمجھی کہ ۔۔۔

پنہاں ہے دام سخت قریب آشیانہ کے!

کہ ایک روز ایک عجیب واقعہ رونما ہوا،

اتفاقاً صاحب خانہ رات کو بہت دیر میں آیا، بالاخانہ کے زینہ پر وہ چڑھ رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک خط پر پڑی۔ اُس نے اسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا:

"حسب وعدہ آج آدھی رات کو پائین باغ میں آسی سرو کے درخت کے نیچے تمہارا انتظار کروں گا"

ابھی پورے طور سے وہ خط پڑھ بھی نہیں چکا تھا کہ اُسے ساری فضا ہلتی ہوئی معلوم ہوئی معلوم ہوا کہ پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ پھر اپنا دل بہلانے کے لئے اس نے کہا شاید اس

لڑکی کے نام ہو جسے اُس روز وہ لایا تھا، اور یہ تو بڑی ناانصافی ہوگی کہ بغیر کسی ثبوت کے خود اپنی لڑکی کے متعلق اس قدر سوءظن سے کام لیا جائے۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی، آدھی رات قریب تھی۔ وہ واپس ہوا اور پائیں باغ میں دبے پاؤں درختوں کی آڑ لیتا ہوا اسی درخت کے نیچے پہونچ گیا جہاں وہ جدید عاشق و معشوق ملنے والے تھے وہ چھپ کے بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

اس شخص کو تو وہیں چھوڑیئے، اب ادھر کی سنیئے یہ خط درحقیقت اس معصوم لڑکی کا نہیں تھا جو یہاں آکر اپنا دُکھ درد بھول گئی تھی، بلکہ خود صاحب خانہ کی دختر بلند اختر کا تھا، اس وقت صاحبزادی اپنے کمرہ میں سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہوئی آئینہ سے چشمک زنی کر رہی تھیں اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف تھیں، اور یہ سوچ رہی تھیں کہ اس وقت کیسا جوڑا پہن کر مقام مقصود کی طرف نہضت فرما ہوں؟ ادھر یہ بیچاری غریب لڑکی مست خواب و شباب تھی، اس کا حسن "حسن بے پروا" تھا "خود بین و خود آرا" نہیں تھا، لیکن اس وقت خلاف معمول اپنے ولی نعمت کی چاپ سنکر وہ بیدار ہوگئی۔ اس خلاف وقت و موقع آہٹ کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی، وہ اک طرف کھڑی ہو کر جھانکنے لگی کہ کون ہے؟ یہاں آکر جو اس نے ایک نظر ڈالی تو بیک نظر تمام باتوں سے واقف ہوگئی، اور سمجھ گئی کہ اب کوئی گل کھلا چاہتا ہے؟ یہ دیکھکر اُس نے اپنا سر جھکا کر کچھ سوچنا شروع کیا اور اس بلائے ناگہانی کے دفعیہ کی تدبیر سوچنے لگی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا، اس طرح کہ معلوم ہوتا تھا وہ کوئی غیر متزلزل عزم کر چکی ہے۔

اس نے جلدی سے زینہ طے کیا اور صاحبزادی کو دیکھا کہ بن ٹھن کر مقام معہود پر جا رہی ہیں اس نے جھپٹ کر دامن پکڑ لیا تو صاحبزادی گھبرا کے دیکھنے لگیں اور فرمانے لگیں۔

"کیوں کیا ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟ کیا تم میری نگہبان و اتالیق ہو؟"

اس نے کہا "نہیں، میری اتنی مجال کہاں؟ یہ کہکر اُس نے سارا قصہ دہرایا اور یہ بھی بتلا دیا کہ اس وقت اس درخت کے نیچے خود پدر بزرگوار جلوہ فرما ہیں، لیکن اُس نے تسلی دی اور کہا کہ تم مت گھبراؤ، غالباً تمہارے والد کو یہ نہیں معلوم کہ وہ خط کس کے نام ہے، اب تم اپنے کمرہ میں واپس جاؤ اور تمہارے بجائے میں وہاں جاتی ہوں اور مجھے دیکھکر اگر تمہارے متعلق کوئی خیال ہوگا بھی تو دور ہو جائے گا۔

وہ بےگناہ لڑکی زینہ سے اُتر کر اسی درخت کے نیچے پہونچ گئی، اس کے پہونچنے کے بعد اس بدکردار لڑکی کا شریف باپ اپنی جگہ سے نکلا قریب آیا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، اسنے کہا

کہا شکر ہے کہ خدا نے میری عزت رکھ لی اور تو یہاں نظر آئی، میں نے تیرے ساتھ اسی لئے سلوک کیا تھا کہ تو ایسی ناپاک حرکتیں کرے، میں تو اپنی بھولی بھالی لڑکی کو سمجھ رہا تھا کہ اس فعل شنیع کی مجرم وہ ہے تیرا گناہ اس کے سر تھوپ رہا تھا، جو ناکردہ گناہ تھی، بدبخت! تو کسی احسان کی مستحق نہیں، جا دور ہو، میرے گھر کو اپنے ناپاک وجود سے خالی کردے۔"

لڑکی نے یہ الفاظ سُنے، اور دامن سے اپنا منھ چھپا کر چپ چاپ نکل کھڑی ہوئی، ایک نہر کے کنارہ پہونچ کر اس نے اپنی پوٹری سے ایک کاغذ نکال کر کچھ لکھا جسکے آخری الفاظ یہ ہیں:-

"اس نے مجھ پر بیحد و نہایت احسانات کئے تھے، میں نے آج اس کا عیب چھپایا، اس کی لڑکی کی جان بچائی اور خود اپنی جان اس معاوضہ میں کھو دی، الحمد للہ"

صبح کو پولیس نے نعش صاحب خانہ کے حوالہ کردی، نعش دیکھکر اسے بہت صدمہ ہوا، اور وہ بے اختیار رونے لگا، اُسے اپنی گزشتہ حرکت پر سخت ندامت ہوئی پھر تجہیز و تکفین کا حکم دیا۔ اس کے پاس لڑکی کی کوئی یادگار نہیں باقی رہ گئی تھی، سوا ایک چھوٹی سی پوٹری کے جسے اس نے احتیاط سے اپنے صندوق میں رکھ لیا تھا۔

اس سانحہ کو مدت گزر گئی۔ دن رات میں بدلتے رہے اور رات دنوں میں تبدیل ہوتی رہی، ہفتے مہینے بنے اور مہینوں نے سالوں کی صورت اختیار کی۔ اب رفتہ رفتہ صاحب خانہ کو اپنی صاحبزادی کے اخلاق و کردار کے متعلق زیادہ آگاہی ہوئی، وہ حالات معلوم ہوئے جو اب تک پردہ خفا میں تھے ان واقعات نے مضمحل اور پژمردہ کردیا تھا، ایک روز یوں ہی بیکاری میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتا گئی تو اُس نے اپنا صندوق الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ اس میں اس لڑکی کی وہ پوٹری بھی نظر آئی جسے اس سے قبل اس نے کھولا بھی نہیں تھا، لیکن ایک خط ملا جسے اس نے پڑھنا شروع کیا اور جب ان الفاظ پر پہونچا جو لڑکی نے جان دینے سے پیشتر لکھے تھے تو اُس پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا۔ ابھی اچھی طرح وہ پڑھ بھی نہیں چکا تھا کہ سب کچھ سمجھ کر بشدت رنج و الم سے وہ بیہوش ہوکر گر پڑا، یہی غشی اس کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی، نہ افاقہ ہونا تھا نہ ہوا، کبھی کبھی ہذیانی کیفیت طاری ہوجاتی، کبھی اچھا ہوجاتا، پھر بیمار پڑ جاتا تاآنکہ اس نے ایک روز اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کردی۔!

رئیس احمد جعفری

ریاض آپ اپنے آئینہ میں

(بہ سلسلۂ سابق)

قدیر بہ یک ناقہ نشانید و محمل۔

محمل تو ایک ہی تھا۔ جس میں سلمیٰ بھی لیلیٰ بھی۔ محمل کش رکا تو لاری نما نو ساخت نو ایجاد
ئے بھی بالا بلند انجن کے ساتھ رکی۔ اس میں سلامت روی پر یہ وصف مستزاد تھا کہ راؤنڈ ٹیبل
لے پراں نتائج کی طرح کچھ دستوری تحفظات صناع کی ذہنیت نے غیر نمایاں طور پر اس کے لئے مخصوص
بلئے تھے کہ تصادم اور اتفاقیہ افتاد و حوادث کا اندیشہ نہ رہے۔ اُس زمانہ میں مرکب بادی کا خواب بھی
رضی اڑن کھٹولے کا نام سننے کے سوا۔ کسی نے نہیں دیکھا تھا نہ موجدان امریکا و یورپ کے ذہن میں
ڈر کا خیال کبھی آیا تھا۔ البتہ بی بی آسٹن موٹر کے ابتدائی حرفوں نے بہ اعتبار محمل و وجود سلمیٰ و لیلیٰ
بتاً پیشگی کچھ لگاؤ پیدا کر لیا تھا۔

لاری نما کے رکتے ہی بالا بلند انجن کے ڈرائیور نے کہا۔ محمل کے آخری حصے میں دو نشستیں
الی ہیں۔ ساتھ ہی جانشینانِ سلمیٰ و لیلیٰ کی میٹھی۔ ملائم۔ نرم آواز نے سامعہ نوازی کی جس سے بے
رقع و نقاب وہ تابناک چہرے چشم تصور کے سامنے آگئے۔ یا جو برقع و نقاب کی تہوں سے بے کشود
نقاب اثر اندازی کر سکتے تھے ؎

سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی
یہی کم بخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

س شعر نے زبان پر آتے ہی افسانہ از فسانہ می خیزد کی تھرا دی ایک واقعہ یاد آگیا جو پردہ و پردہ دری
بے پردگی کے ارتقائی مدارج آزادی کے نتائج پر بغیر مبسوط اخباری آرٹکل کے کچھ روشنی ڈال سکتا
ہے۔ پردے میں ایسے واقعات دو چار مگر بے پردگی میں فی صدی سے بھی متجاوز۔ ع

دامن یار خدا ڈھانک لے پردہ تیرا

ں کسی دور مقام پر ایک ایسے مقتدر بزرگ رئیس کے مکان پر مہمان تھا۔ جس سے خاندانی روابط و
خلقات کی وجہ سے میرا زمانہ طفولیت ذہیں گزرا تھا، اب بھی میری خاطر داشت زنانخانے میں دلیسی

ہی تھی جیسی بچپن میں گھر کی بیبیاں پرانی ماماییں مجھے اُسی نظر سے دیکھتی تھیں۔ کھانا دونوں وقت۔ دو وقتہ ناشتہ بھی ان اوقات میں کھانے کے تخت یا پلنگ کے قریب ان کی دونوں ناکدخدا صاحبزادیاں دوہری چادر کے پردے میں وہیں آبیٹھتیں اور بیبیاں پردہ نہ کرتیں راتنا لگاؤ بھی بُرا تھا) ہر چند یہ کانا پردہ یا صرف آنکھ کا پردہ نہ تھا۔ ضروری نوشت وخواند و مسائل کی تعلیم اونچے شریف گھروں میں آجا تی ابھی یہ کہنے کا موقع دور تھا۔ ؎ ریاض

کھل کھیلنے کو پردہ نشیں پاتے ہیں تعلیم کچھ آپ زمانے کی ہوا دیکھ رہے ہیں

آواز کا لگاؤ کان کے پردے سے۔ ادب و تہذیب کے حدود میں بے تکلفانہ تھا۔ جو مزاج پرسی اور گھر کے حالات دریافت کرنے میں گو نہ بدنمانہ تھا نہ اس کا موقع دیتا تھا۔ ع

اور کھل کھیلیں گے دو چار ملاقاتوں میں

شرعی و رسمی حجاب کی نگہداشت بہ شدت ملحوظ رہتی۔ عام اس سے کہ اور بیبیاں بیٹھی ہیں یا نہیں۔ قصبات میں نامحرم اعزہ اُس زمانے میں بھی محرم سمجھے جاتے تھے اور یہ بدنما رواج کبھی کبھی کسی حد پر شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ میں اعزہ سے نہ تھا۔ بیگانہ تھا۔ مگر اعزہ سے کم نہ تھا۔ خاندانی شرافت ایک حد تک صفات پر خامئ عمر میں بھی اثر انداز رہتی ہے نیز پاکیزگی تعلیم بھی۔ با اینہمہ ع لبساکین دولت از گفتار خیزد۔ رکنے والی چیز نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اتفاقات نے یہ ترقی یہ صورت بھی پیدا کر دی۔ ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

میں نے دراز افسانے کو بہ طرز اختصار گویا ایک مصرع میں لے لیا۔ مجھے افسانہ نا بیان میں ہر موقع پر بالشبر طیکہ لکھ سکوں) اپنی گریز یا طولانی عمر کو آخری سانس کی طرح کوتاہ کرنا ہے۔ افسانہ نگاری سے بھی نابلد ہوں۔ خواہ بہ طرز قدیم ہو یا جدید۔ اس اعتبار سے کہ گانا رونا کون نہیں جانتا۔ بُرے بھلے اسلوب سے کچھ لکھے جاؤں۔ مگر میں زندگی کے اُس نازک موقع پر پہنچ چکا ہوں کہ عمر کوتاہ و افسانۂ دراز کا حسن کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ یہ کہنے کو ہو ؎ ثاقب لکھنوی

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جینے سے جی اُکتا گیا ہے آخر کب تک جیوں۔ پھر بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ نازک وقت آئے۔ جیسے صال سمجھ رہا ہوں۔ دعا ہے مجھے یہ کہنا پڑے مگر نہ کہنا پڑے تو اچھا ہے ؎ ریاض

وقت آخر یاد فرمایا مجھے کس حسن سے ہچکیاں یہ کہتی آئیں موت کا پیغام ہے

آغاز شباب کا خواب دیکھ رہا تھا کہ بڑھاپے نے موت یاد دلا دی۔

کسی کا دوسری سے سن میں کچھ بڑا ہونا۔ آنیوالی قیامت کے فتنوں کو اپنی کفِ پا کے لئے برگ حنا بنائے ہوا تھا۔ یہ بھی قیاسی ہے۔ نظارۂ جمال کا کیا ذکر۔ نقشِ کف پا بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئے تھے۔ نہ نوشت و خواند اس پیام و سلام کا ذریعہ تھی۔ جس کا امکان نشستگاہ میں نہ تھا۔ پیامی بھی اک ضعیفہ تھی جس نے کئی حج کئے تھے اور جس کے خیال میں اک دبے پاؤں چلنے والی چیز سے ہر صبح یہ کہہ دیا کرتا تھا ؎ ریاض

اے نسیم سحری اسکو لئے جائیو بام نفس سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں

ہفتے کی طرح مہینے گذرتے گئے۔ طوفانی اشکوں کی گریہ پائی جا ہتی تھی نظارۂ جمال کی حسرت کو دل سے نکال لے جائے۔ مگر یہ اپنی جگہ پر تھی پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آواز میں بھی پتی لگنے کی خلش پیدا ہو گئی۔ آبرو کے پاس نے میرے لئے بھی موقع کی نزاکت بڑھا دی تھی۔ پھر بھی انتہائی جرات سے عصمت مآب کو مطلع کئے بغیر ایک روز موقع مجانے پر جب گھر کی بیبیاں کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں اور صاحب خانہ مع ضروری اشخاص کے علاقے پر تشریف لے گئے تھے۔ باب کعبۂ مقصود اندرونی جانب سے اس طرح بند تھا کہ دست دعا کی جنبش جب چاہے اسے کشود کار کا ذریعہ بنائے۔

تاریک شب کے خطرناک حصے میں بند دروازے سے میں آسیب کی طرح وسیع صحن میں اپنے سائے سے بچتا گھنے اشجار گل کے سائے میں چھپتا اُس خوابگاہ ناز تک پہونچا۔ جس کا نقشہ پہلے سے آنکھ میں تھا اور جہاں شمع کی وہی روشنی چھپے چہرے پر پڑ رہی تھی ؎ ریاض

یار کے بند صبا آہستہ وا کرنے کو تھے چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کرنے کو تھی

جھجک بھی خوف بھی شرافت سے گرا ہوا فعل بھی گہرے پردے نے اور ڈرا دیا تھا کہ یہ کہنے کو نہ ہو ؎ ریاض

اُٹھے فتنے نگاہ خشمگیں سے گلے ملتے ہوئے چین جبیں سے

چھپے چہرے سے آنچل کا سرکانا تھا کہ یہی صورت پیش آئی اگر ساتھ ہی نام نہ بتایا جاتا تو ایک ہی چیخ رسوائی کے لئے کافی تھی۔ نظارۂ جمال کی حسرت نکلی مگر بُری طرح۔ حسن عشق سے زیادہ بیتاب تھا شرعی جواز کے حدود میں آجانے کی کوشش تھی۔ بہ صورت حرماں نصیبی۔ جانِ زار جمال آفریں کے سپرد ہو چکی تھی۔ اشک پیہم و گریہ متصل نے والدین کو سعی جواز کی طرف آمادہ کر دیا تھا۔ باینہمہ ایک عفت مآب پردہ نشین کی شرافت نفس کسی نامحرم کی نگاہ کو کھُلکر موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ بے پردہ آواز کی طرف سے صرف سعی جواز کا ایما اور مایوسانہ فوری بازگشت کی تاکید (رق حاصل) آئی نظارۂ جمال نے مجھ سے کچھ کہا تو یہی ؎

لپک شعلے کی ہے یا گل فشانی دیکھتے جاؤ کلیم انکی ادائے لن ترانی دیکھتے جاؤ

ناکامی مجھے اپنی جگہ پر واپس لائی۔ ابھی تک تو لب ناکین دولت از گفتار سے سابقہ تھا اب تو نظارۂ جمال نے ہجوم شرارہ و برق نے مجھے نئے تجلی زار میں پہونچا دیا تھا۔ وطن واپس آنے پر میری تمام کوششیں جواز کے لئے ناکام رہیں۔ برعکس میری حالت میں تغیر پیدا کرنے کو میرا عقد جوار وطن میں کردیا گیا اور افسانۂ محبت ٹریجیڈی پر تمام ہوا۔ وہی پیامی ضعیفہ وطن میں میرے مکان پر یہ کہتی آئی کہ غم فرقت سے جاں بر ہونا محال تھا۔ کسی نے جان زار پہلے ہی۔ جان آفرین کو سپرد کردی تھی۔ آخر وہ وقت آگیا کہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ ؎ ریاض

کفن سرکا کے حسن نوجوانی دیکھتے جاؤ ذرا افتاد مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

پردے کی سختیاں کس سختی سے پہلے تھیں۔ اب کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونیوالا ہے۔ اس موقع پر ایک تازہ نظم موسوم بہ عقد ثریا نذر نگار کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ غرض نہیں ہے کہ مویدین آزادی و بے پردگی پر اثر ڈالوں میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں ان کے اثر سے محفوظ رہوں۔ یہ نگار کا اختیاری امر ہے کہ وہ اپنے صفحات کے دامن کو عقد ثریا کے روشن دھبے سے سجائے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی نگارندہ نگار سے یہی کہونگا ع

سپردم بہ تو مایۂ خویش را۔

عقد ثریا

ہر اک محفل میں اب پہلو بہ پہلو بیمیاں ہونگی
ہمیں چوگاں ہمیں گو یہ کہیں گی مرد میداں سے
جگہ لیں گی۔ جگہ دیں گی۔ یہ اپنے چشم و ابرو پر
میاں سایہ بنے ہوں ساتھ پابندی نہیں اسکی
یہی چھائی رہیں گی محفلوں پر رات ہو دن ہو،
نہ گلگشت چمن میں پاؤں اٹھ جائیں کہیں انکے
پئے تعلیم گھر سے کم سنی میں پاؤں نکلیں گے
درون پردہ یہ کیا تھیں۔ برون پردہ کیا ہوگا

حجاب اٹھ جائے گا ہر کام میں یہ درمیاں ہونگی
سبک ہو کر نگاہوں میں۔ رواں ہونگی دواں ہونگی
کوئی جب میہماں ہوگا یہ اُس کی میزباں ہونگی
کبھی خود میزباں ہونگی کہیں خود میہماں ہونگی
نصیب دوستاں ہونگی نصیب دشمناں ہونگی
ہوائیں بھر کے سایہ انکی نازک ساریاں ہونگی
قیامت ڈھائیں گی گھر سے نکلکر جب جواں ہونگی
نہاں رہکر نہاں رہتیں یہ کھلکر اب عیاں ہونگی

من اندازِ قدت را می شناسم۔ ہو جگہ کوئی … اُٹھیں گی انگلیاں کھل کھیلنے پر یہ جہاں ہونگی
نمائش حسنِ عریاں کی ہے۔ شوقِ خود نمائی بھی … نمایاں داغ بن کر ان کی اب گلکاریاں ہونگی
نظر آئیں گے ذرّے خاکِ پاکے۔ کوکب و اختر … ترقی پر رہے جلوے تو راہیں کہکشاں ہونگی
کہاں کا مرکب بادی اُڑیں گی یہ بلند اس سے … پر پرواز کہتے ہیں کہاں ہیں یہ کہاں ہونگی
یہ چمکائیں گی جا کر زہرہ و مریخ کی دنیا … یہ بن کر چودھویں کا چاند زیبِ آسماں ہونگی
خدا جانے کہاں لیجائیگی ان کو اُٹھان ان کی … یہی ہیں خواب ان کے تو کہاں تک یہ کہاں ہونگی
مطیعِ حکم ان کے ہونگے شوہر کی طرح کتنے … کریگا حکم برداری ہر اک۔ یہ حکمراں ہونگی
نقابِ رُخ اسی امید نے یورپ میں الٹی تھی … ثریا مشعلِ راہِ امان اللہ خاں ہونگی
مزا بے پردگی کا ہو گیا معلوم طفلس میں … خبر کیا تھی سرِ دربار یوں رسوائیاں ہونگی
بڑھے گا دخترِ رز کو منہ لگا کر فوج کا افسر … دمِ تقریر سرزد اس سے بے عنوانیاں ہونگی
ہوا بدمست۔ کیوں شہ سے اجازت خواہ بوسے کا … یہ ہیں تہذیب کی باتیں جو زیبِ داستاں ہونگی
جھکگا وہ عاجزی سے بعدِ شہ سوئے ثریا بھی … سمجھتا تھا نظر انداز یہ بے باکیاں ہونگی
عتاب آمیز ادائے شہ سے ہل چل پڑ گئی کیسی … وہ کچھ بھی ہو جو باتیں ہو چکیں سرزد یہاں ہونگی
نہ آیا آبرو پر حرف لیکن پھر بھی تو آیا … جہاں بے پردگی ہوگی۔ یہی گستاخیاں ہونگی
کہیں کیا ہم زمانے کی ہوا کچھ اور کہتی ہے … نیا فیشن نئی سج دھج غضب عریانیاں ہونگی
بطرز آزمائش ہوں۔ زن و شو۔ عقد سے پہلے … نئی باتیں نئی جدت نئی آزادیاں ہونگی
وہ دن بھی آئیگا پوری ہو آزادی کی ہر خواہش … وہ دن بھی آئیگا یہ جدتیں رائج یہاں ہونگی
نہ سرمہ آنکھ میں ہوگا نہ لب پر پان کی سرخی … حنا ہوگی نہ ہاتھوں میں نہ دھانی چوڑیاں ہونگی
نہیں رہنے کا یہ فرضی تعلق بھی زن و شو کا … یونہی اب رفتہ رفتہ دور سب پابندیاں ہونگی
جدائی اختیاری ہوگی۔ بعدِ عقدِ رسمی بھی … نہ ہوگی قید مذہب عقد میں آزادیاں ہونگی
پکارے دخترِ رز سے یہ نویدِ عیش کہتی ہے … نکوکاری کے بدلے ہر طرف بدکاریاں ہونگی
بنیں گی بچہ کش ہو کر نہ اب دنیا میں ناکارہ … نہ بچے ہونگے اب انکے نہ یہ بچوں کی ماں ہونگی
ترقی کے لئے بے پردگی کیوں لازمی ٹھہرے … یہی تو دامنِ عصمت کی اڑتی دھجیاں ہونگی

مثل سچ ہے نہیں ہوتیں برابر انگلیاں پانچوں … وطن کی آبرو بھی پاک دامن بیبیاں ہونگی

بہت تعلیم پاکر نام پائیں گی زمانے میں بہت با عصمت و عفت بھی ائیں بیبیاں ہوں گی
بہت تعلیم پانے پر کرینگی قوم کی خدمت بہت تعلیم پاکر آبروئے خانداں ہوں گی
انھیں میں ہوں گی ایسی بھی کریں ہم سجدے دامن پر یہی تو مایۂ صد نازشِ ہندوستاں ہوں گی

یہ نکلیں گی ہمیشہ نورایاں بنکے پردے سے حجابِ ابرِ رحمت سے نمایاں بجلیاں ہوں گی

نگاہِ شوقِ بد بیں ان سے خیرہ ہو نہیں سکتی تصور ہی میں حسن و عشق کی خوش فعلیاں ہونگی

بڑھاپے میں ریاض افشانہ کر راز سیہ کاری
مجھے ڈر ہے تقدس کی ترے رسوائیاں ہونگی

سلما و لیلے کی ہم سخنی دلکش انداز کے ساتھ ایسی نہ تھی کہ سننے والوں کو محمل کی بلندی تک پہونچنے کے لئے لفٹ کا محتاج رکھتی۔ بات کہتے ہی میں اپنے ظریف ہمراہی کے ساتھ گوشۂ محمل میں تھا۔ ساتھ ہی بالا بلند غیر مصنوعی انجن میں حرکت پیدا ہوئی۔ ہمراہی ظریف میرے ملازم بھی تھے اور بچپن کے دوست بھی۔ موسیقی سے کافی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی جائے نشست لیلے سے گونہ قریب تھی۔ اسے اتفاق پر محمول کیجئے یا ان کی سعئ پنہاں کا نتیجہ سمجھئے۔ میں بجائے خود سلما سے دور مگر سلما کی طرف تھا۔ تیرگئ شب میں اس کا بھی اندازہ ہوا کہ سلما و لیلے تنہا نہیں ہیں کوئی بلائے بد یا آشوبِ روزگار اور بھی ہے۔ تمام معاملات میں تصور کی کار فرمائیوں کو عجیب و غریب دخل تھا۔ رفتار بھی خواب آور تھی۔ شب کا گزرا ہوا حصّہ بھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نفیرِ خواب بلند ہوئی۔ جو آواز ارغنوں کی طرح خوش آئند نہ تھے۔ مجھ پر بھی غنودگی کا اثر تھا۔ ہمراہی ظریف پر بھی۔ ممکن ہے ان کی غنودگی میں تصنع کو بھی دخل ہو۔ خفیف سردی نے تاریکی میں دلائیوں کو زیادہ آویزش کا موقع دیدیا تھا۔ ان صورتوں میں جیسا کہ ہمراہی ظریف نے بعد کو بیان کیا۔ جا بیجا افتاد کا دستِ شوق کو کیا خیال ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مصنوعی و غیر مصنوعی نیند کا غلبہ ہو نہ ہاتھ کی نگہداشت ہو سکتی تھی نہ پاؤں کی۔ ہر غلط افتاد غلبۂ خواب کے تحت میں تھی۔ ایسے موقع پر وہ خود بھی سمجھتے تھے۔" ع۔ تماں گرنشست بر آں کس کہ پاکباز بود۔ ہمراہی ظریف نے خود کو ایسی حالت میں بنالیا تھا کہ ساق سیمیں ہو یا اُس سے زیادہ کوئی نرم حصّہ۔ دستِ شوق کی ہر بیجا افتاد۔ نیند کے غلبے پر محمول کی جاسکے۔ آزمائشی طریقوں نے رفتہ رفتہ اُن کو اطمینان دلا دیا کہ لیلے ہو یا سلما یا کوئی بلائے

آشوب روزگار سب نیند کے ماتے ہیں۔ ہر ایک کی نفیر خواب ہی اطمینان کے لئے کافی تھی۔ خصوصاً لیلےٰ کی گہری نیند یا اس حد تک خاموشی جس سے سطحی مدعا بر آری کے لئے نیم راضی کا پہلو نکلتا ہو۔ کچھ خطرہ تھا تو صرف اس مصرع کے لحاظ سے ع ابھی ہے نام خدا وہ غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے۔ پھر بھی دستِ شوق کی بیباکی مزید تجسس میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اوپر کی جانب سرکتے سرکتے ان کا سرِ نیاز۔ پشتِ پا سے لیلےٰ کی کمر تک پہنچ گیا تھا۔ ادھر لیلائے شب بھی تا کمر پہنچ چکی تھی۔ کہ دستِ شوق کو نہایت بے موقع دو گلیٹوں کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی کسی مرض کا بھی۔ ابھی وہ بُجرأت وضاحت کے ساتھ آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس آنی حالت میں تغیر پیدا ہوا۔ گلیٹوں کی مجموعی حالت نیز ان کی حرماں نصیبی نے ان کو اس مصرع کا مفہوم ع شب اول عروس تر گردد اچھی طرح سمجھا دیا۔ اب ان کی طبیعت درکی طور پر مائل بہ استفراغ ہوئی یہ وہ وقت تھا کہ توبہ کو اُن کے استغفار پر ہنسی آتی تھی۔ جتنا بڑے تھے اتنا ہی گھٹے۔ اب وہ لیلےٰ کی عوض ڈرایور کے قریب نظر آئے۔ دفعتاً ڈرایور نے بلند آواز سے کہا۔
یہ کیسے اندھے مسافر ہیں جو سڑک کے وسط میں دراز ہیں۔ ڈاک گاڑی سے کٹ جانے کا بھی اندیشہ نہیں ڈاک گاڑی سے میل ٹرین نہ سمجھے گا۔ اس زمانے میں ڈاک مرے کمپنی کے ٹھیکے میں کمپنی کی گھوڑا گاڑیوں پر جایا کرتی تھی۔ میں نے بھی گھبرا کر ان کو دیکھا اور بے اختیار چاہا کہ اپنی دلائی ان کو دیدوں اور وہ سردی میں کسی درخت کے نیچے استراحت کریں۔

میں اسی خیال میں تھا کہ محمل کش کی رفتار رُک گئی۔ تھکے ماندے مسافر جو سنگ راہ بنے تھے۔ اب اس جگہ نہ تھے اور ناقہ لیلےٰ اُن کے قابو میں تھا۔ اس کی روانی نشیب کی جانب بجائے شرق شمال رویہ تھی جو دور جا کر رُکی۔ محمل کے زیریں حصہ مسقف میں شور برپا تھا۔ گریہ وزاری سے کہرام مچا ہوا تھا۔ چاندنی بہت صاف تھی۔ مسافر شیخوں کے درمیانی حصوں سے زخمی کئے جاتے تھے۔ ناقۂ لیلی۔ گسستہ عناں۔ آزادی کے ساتھ نیم کی شاخوں میں حلاوت کام و دہن حاصل کر رہا تھا ؎

خم شاخسار ہا ز گلوئے بلند تو   فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

قابو رکھنے والا ڈرایور مع اسسٹنٹ لاٹھیوں کی ضرب سے سڑک ہی پر زمیں رسیدہ ہو چکا تھا بالائی حصہ میں۔ نفیر خواب کا کیا ذکر موت کی خاموشی طاری تھی۔ سب کو جان کے لالے پڑے تھے مگر مجھے گو نہ مال کی بھی فکر تھی۔ میرے پاس تھا کیا۔ ایک جیبی رومال۔ جس میں ساٹھ روپئے تھے لد رومال جیب کے اندر۔ اس کے سوا ایک معمولی زین کا بیگ دہلی کا نوایجاد۔ جس کا اُس زمانے میں ابتداً

رواج ہوا تھا۔ بیگ میں کچھ کپڑے ایک امرتسری چوتھی۔ جس میں دو ضخیم مطبوعہ دیوان لپٹے ہوئے پکیٹ کی شکل۔ دو روپے اور بھی تھے۔ جو میں نے ہمراہی ظریف کی جیب میں ڈال دئے تھے۔ صاف چاندنی میں چالیس پچاس ڈاکو گھیر اڈالے ہوئے زخمیوں کی جامہ تلاشی میں مصروف تھے۔ میں نے چاہا جیب سے زربستہ رومال نکال کر دور پھینک دوں۔ مگر روپلے ڈھیلے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بوٹ میں نیچے کی طرف زربستہ رومال کو بہ احتیاط رکھا۔ اور محمل کے بالائی حصے میں محفوظ کر دیا۔ دوسرے پاؤں کے بوٹ کو بھی اُسی کے برابر جگہ دی۔ یہ ہوتا تو وقت پیش آتی۔ اتنے میں کسی نے برچھی سے حملہ کیا۔ میں بال بال بچا۔ محمل پر زد پڑی۔ گالیوں کے ساتھ اترنے کی تاکید پر میں بالائی حصے سے کود کر زمین پر گرا۔ اور حملے سے پہلے میں نے یہ بات اُن کے دل میں اتار دی کہ میرے پاس بیگ میں کافی رقم ہے وہ لے لو اور کسی غریب کو اب نہ مارو۔ میرے ہمراہی کو بھی اترنے کی تاکید کی گئی وہ بھاری جسم کے آدمی تھے۔ سنبھل کر اترنے لگے۔ مگر لاٹھی سے حملہ کیا گیا وہ چوٹ کھا کر گرے جامہ تلاشی سے میں بھی محفوظ نہیں رہا تھا وہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ ان کے گرتے ہی میں نے یہ کہہ دیا اس غریب کو نہ مارو جیب میں دو روپے ہیں لے لو۔ خانہ تلاشی کے نتیجے میں وہ مجھے راست باز سمجھے۔ چھ زخمی جو قریب قریب مبتلائے اذیت زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو کراہنے اور چیخنے چلانے سے روکا۔ ڈاکو اوپر کے درجہ کو خالی سمجھ رہے تھے ادہر متوجہ ہوئے کہ میرے بیگ سے کافی رقم حاصل کریں۔ اب سلما و لیلےٰ نے شور مچایا میں نے انھیں فریاد و زاری سے روکنا چاہا تو پیہم آوازیں آئیں۔ سمجھائے جا سار سمجھائے جا۔ اس آواز کے ساتھ میں گویا بالکل آزاد تھا۔ میں نے قریب جا کر ان کو سمجھایا۔ اور سب کو بے نقاب دیکھا۔ سلما سن رسیدہ تھی۔ بلائے بد بھی جوانی سے اُتری ہوئی اور کریہہ منظر بھی۔ لیلےٰ کا کیا پوچھنا وہ انیس سال کا ایک نوجوان شخص تھا جس کی رسیلی اور نرم آواز نے تاریکی شب میں دوشیزہ کا دہوکا دیا تھا۔ میرے سمجھانے سے بلائے بد نے ایک پوٹری دی۔ کہا اس میں بائیس روپے ہیں۔ اس کے سوا ہمارے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ میں نے پوٹری ڈاکوؤں کے حوالے کی اور کہا اب ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بجواب مجھ پر عتاب ہوا۔ میں قریب سے ہٹ گیا۔ ڈاکوؤں نے سلما اور بلائے بد کے ناک کان نوچ کر لہولہان کر دیا صرف ظریف لکھنوی "والا" لیلےٰ نظر آتا ہے" ان کے دست جور سے محفوظ رہا۔ بیدردی کے ساتھ یہ بھی اتارے گئے۔ اور اسباب کے ہمراہ میرا بیگ بھی اتارا گیا۔ میں نے چاندنی میں دیکھ لیا تھا کہ جلال پور کے قریب ندی والا کروندے کا جنگل ہے۔ میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ جنگل کے کنارے ایک صاف شفاف ٹکڑا ہے۔ جس میں ایک فرش رکھی ہوئی ہے اور بہت سا اسباب پھیلا ہوا ہے۔ ہم لوگوں کو چھوڑ کر سب ڈاکو ٹکڑے کی طرف چلے گئے تھے۔ دو چار

وہی باقی رہے تھے - جنھوں نے میرا بیگ اور کچھ اسباب اتارا تھا - اسباب تو انھوں نے ایسے ہی پھینک دیا میرا بیگ لیکر ٹیکرے کی طرف چلے گئے جسے وہاں جاکر انھوں نے چھرے سے چاک کیا اس نازک موقع پر میں نے دیکھا کہ ایک بیل گاڑی سڑک سے گزر رہی ہے میں سمجھا کہ پولیس آگئی - میں نے ڈرانے والے لہجے میں بلند آواز سے کہا پولیس آگئی ہے - اب کوئی جانے نہ پائے - یہ سننا تھا ڈاکوؤں کے پاؤں اکھڑ گئے - اور وہ سب جنگل میں ہو رہے - گاڑی سڑک پر رکی ایک پولیس کانسٹبل "ہم آگئے ہم آگئے" کہتا ہوا قریب آیا - میں وہ دونوں ٹیکرے تک پہونچے - جسے میں فتنہ سمجھا تھا وہ مرے کمپنی کی ڈاک گاڑی تھی جو کسی طرح رک گئی تھی - اس کے گھوڑے بھی الجھے ہوئے تھے - ڈاک کے تمام تھیلے چاک شدہ اور پارسل وغیرہ پڑے ہوئے تھے - اسی ڈاک گاڑی پر انسپکٹر جنرل پولیس کا قیمتی اسباب بھی تھا - جو ڈاکوؤں نے مختلف اسباب کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا تھا - میں اور کنسٹبل جنگل کی طرف بڑھے - یہ کہتے ہوئے کہ اب جنگل سے نکل کر ڈاکو نہیں جا سکتے - دفعتاً ایک شخص کروندے کی جھاڑی سے نکلا - ادھر کنسٹبل کی گھگی بندھ گئی ادھر اسکی میں بذہن خود گل دیگر شگفت لیکر آگے بڑھا - دیکھا تو راجہ صاحب کھیری گڈھ کے بھائی ہیں - راجہ صاحب کا اسم گرامی مربیان گلکدہ ریاض کی فہرست میں بہ خصوصیت درج تھا - ممدوح کو میں نے پہچانا - آپ نے بھی چوٹ کھائی تھی اور بھاگ کر ایک جھاڑی میں چھپ گئے تھے - میں نے کانٹے چنے - کنسٹبل غائب تھا سڑک پر وہ گاڑی بھی نہ تھی - جسے میں پولیس کی جماعت سمجھا تھا - راجہ صاحب کے بھائی نے کہا - میرے دو ہمراہی مارے گئے - میں نے یہ کہکر ع اے باد صبا اینہمہ آوردۂ تست - ایک خندق میں دو لاشیں دیکھیں یہ برچھیوں کے زخم سے ہلاک ہوئے تھے - کوچمین وغیرہ کیا ہوئے کچھ معلوم نہ ہوا راجہ صاحب کے بھائی مجھ سے بار بار کہتے لکھنؤ بھیجدیجئے - راجہ صاحب منتظر ہوں گے جو شادی کی غرض سے نیپال جا رہے ہیں - سیتا پور سے دن میں گھوڑا گاڑیاں جا چکی ہیں - پچھتر ہزار روپیہ بھی ہمراہ گیا ہے - میں دن میں نہ پہونچ سکا شب کو روانہ ہوا - پانچ ہزار روپیہ میرے ہمراہ تھا - میں اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتا نہ آپ کسی سے ذکر کریں - میں خود خوف زدہ اس خیال سے تھا کہ جنگل سے نکلکر ڈاکو پھر نہ آجائیں - میں نے پراگندہ پارسلوں پیکٹوں اور متفرق قیمتی اسباب میں اپنا چاک شدہ بیگ اور امرتسری چوتھی مع روپیوں کے موجود پائی - میں نے ہر چیز کو وہیں بحال خود رہنے دیا - زخمیوں کو سمجھا دیا کہ فریاد و زاری کریں - اور چلائیں کہ ہمارا اس قدر روپیہ گیا - میں بھی رونے اور شور و غل کرنے میں ان کا شریک تھا - میری زبان پر یہی تھا کہ میرے بھی پانچسو لٹے - میرے ظریف ہمراہی جن کا نام وزیر خاں تھا - میرے ہموطن اور ہمسایہ محلے کے رہنے والے تھے - انھیں بھی درد کی اذیت محسوس ہو رہی تھی - ان کے لئے شب اول

صرف عورتیں ہی زخمی نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ چالیس پچاس نفر ڈاکو بھی زخمی ہوئے تھے۔ انھوں نے لیلےٰ کی دیکھ بھال کی تھی۔ ڈاکوؤں نے ان کی دیکھ بھال کی بلکہ مجھ ناکردہ گناہ کی بھی۔ میری خدا ترسی گو نہ میری کفیل تھی کہ میں نے چوٹ نہیں کھائی۔ تھوڑے عرصے میں کنسٹبل موضع نیر بھٹی پور سے جماعت کثیر لے کر واپس آیا۔ نیر بھٹی پور حافظ نظام احمد انداز مہتمم ریاض الاخبار کا موضع تھا۔ مجھے بھی سب پہچانتے تھے وزیر خاں کو بھی۔ آگ ہر طرف روشن کی گئی۔ اب خوف دور ہوا۔ بنیے اپنے بوٹ اور روپیہ کو دیکھا وہ مجھ سے زیادہ لعافیت تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک سوار آیا جس نے پوچھا یہ دوسرا ڈاکا ہے معلوم ہوا ڈاک گاڑی لوٹنے سے پہلے ایک نامی زمیندار کو لوٹا ہے جو زنانی سواریوں کے ساتھ مونڈکن سے فارغ ہو کر واپس جارہا تھا کئی آدمی شدید مجروح ہوئے تھے۔ سوار سیتاپور حکام کو مطلع کرنے روانہ ہوا۔ لکھنؤ سے سیتاپور جانے والی گاڑیاں آگے پیچھے آکر ضروری پرسش کے بعد روانہ ہوتی گئیں۔ ایک گھوڑا گاڑی پر چودھری محمد بخش مرحوم تعلقدار بلوہ بھی تھے اور جھپٹ پر ان کا ملازم فقیرے جو مجروح وزیر خاں ہمراہی کا ہمسایہ بھی تھا۔ گاڑی سڑک پر تھی۔ وزیر خاں زخمیوں کے ہمراہ اپنی جائے افتادہ پر تھیں کسی نے چلا کر۔ فقیرے سے کہا بھیا مارے گئے۔ میں زخمی ہوں۔ چھاپہ خانہ میں اور مکان پر اطلاع کر دینا گھوڑا گاڑی تیز روانہ ہو گئی۔ میں اس وقت اتفاقیہ سو گیا تھا۔ کچھ رات باقی تھی کہ ڈپٹی کمشنر ضلع مسٹر ٹوئیڈی ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس منشی ولایت اللہ تحصیلدار صدر انسپکٹران و سب انسپکٹران و کنسٹبلان کوتوالی و لین متعدد سواران۔ رسالہ و پوسٹ ماسٹر وغیرہ مختلف سواریوں پر پہونچ گئے۔ سب سے پہلے بعجلت پراگندہ ڈاک وافتادہ اسباب صاحب انسپکٹر جنرل بہادر پولیس دوسری گھوڑا گاڑی پر روانہ کیا گیا۔ اسی پر راجہ صاحب کھیری گڈھ کے ضرب خوردہ بھائی بھی۔ ضروری مختصر بیان لینے کے بعد بٹھا دیے گئے۔ پھر میرا تفصیلی بیان ڈپٹی کمشنر نے لیا۔ بیان میں سلما و لیلےٰ کے واقعات حذف کر دیے گئے۔ خدا ترسی اور رولائی دینے کے قصہ سے آغاز ہوا۔ مگر ڈاکے سے بھی زیادہ نازک وقت میرے لئے پیش آیا۔ جب میں نے مس سلما سے بائیس روپیہ کی پوٹری لیکر ڈاکوؤں کے حوالہ کی۔ اظہار کارگزاری میرے لئے بلائے جان ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ضلع نے بدلے ہوئے تیور سے فرمایا کہ آپ نے ڈاکوؤں کو پورے طور پر مدد دی۔ یہ فقرہ میرے لئے جام مے نہ تھا جام زہر ہلاہل تھا۔ یہ کہنے کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ ع

ہمنشیں ہم چلے سنبھال ہمیں

لغزش کے ساتھ خاص حالت طاری ہوئی۔ مسٹر ٹوئیڈی ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ نے فوراً بڑھ کر اور یہ کہکر مجھے سنبھالا ڈپٹی کمشنر صاحب نے مذاق سے کہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب خود بھی ہنسنے لگے۔ حاضرین میں

میں ابھی تک برہنہ پا تھا۔ انسپکٹر پولیس جائے محفوظ سے میرا بوٹ لائے۔ جوتا بعافیت میرے پاؤں میں پہونچا اور روپیہ میری ہی جیب میں بیان میرا ہو رہا تھا کہ تیز گاڑیوں پر حافظ نظام احمد۔ رفیق قدیم مرحوم جالعالم پریس مین مطبع نیز دیگر اعزہ و احباب میری لاش لانے کے لئے ماتم کناں فریاد و زاری کرتے پہنچے۔ گاڑیوں کے پیچھے لوگوں کا تانتا لگا ہوا۔ جس نے جہاں سنا وہیں سے روانہ ہوا۔ مجھے زندہ دیکھ کر لوگوں نے فرط مسرت سے مجھے اٹھا لیا۔ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ صاحب کو استعجاب تھا یہ واقعہ کیا ہے آخر انھیں سمجھایا گیا۔ کہ مکان پر کیا تمام خیرآباد میں ماتم برپا ہے۔ بیان ختم ہوتے ہی مجھے اجازت دیگئی میں بعافیت گھر پہونچا۔ مبارک سلامت کے لئے ہمسایہ محلے امنڈ آئے۔ بہر حال یہ عالم تھا ؎

وہ آرہے مرے ہمسایہ میں تو سائے سے فدا ہوئے در و دیوار پر در و دیوار پر

انعام اکرام خیر خیرات اور مبارکباد کے سلسلے نے وہ ساٹھ روپلے بھی نہ چھوڑے جو جان کی طرح نہ بھی مال کی طرح ضرور مجھے عزیز تھے۔ ڈاکوؤں کے لئے کئی ہزار انعام اور انسپکٹری کے عہدے کا اعلان گزٹ میں ہوا۔ یہ کمبخت ڈاکو ڈھاٹے باندھے۔ برچھی اور لمبی لمبی لاٹھیاں لئے۔ ہر روز شب کو خواب میں مجھے نظر آتے۔ اور یہ سابقہ مہینوں رہا مگر میں اُن کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ نہ سزا دے سکتا تھا سلسلۂ تحقیقات دس مہینے تک جاری رہا۔ اور میں برابر شب کو خواب میں انھیں دیکھتا رہا بلکہ بیداری میں بھی ان کی صورتیں میری پیش نظر رہتیں۔ مگر تقدیر میں انعام نہ تھا اسلئے سزا دلانے سے معذور رہا۔ سیتاپور۔ ہردوئی۔ کھیری کے کئی سے بدمعاش اسی ڈاکے کے سلسلے میں سزایاب ہوگئے۔ مگر ڈاکے اور اس سے متعلقہ سنگین جرائم قتل و ضرب شدید میں کوئی سزایاب نہ ہوا۔

مجھے بیان کردہ لہ ۵ روپیہ جرمانہ کا جو پکٹ میں خطوط روانہ کرنے کی بنا پر ہوا تھا کبھی افسوس نہیں ہوا مگر اس ساٹھ روپلے جرمانہ کا جو اپنے ہاتھ سے مجھ پر ہوا آج بھی افسوس ہے اور یہ اقتضا پیرانہ سالی و مفلسی کا ہے ع ہم سن کے پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا۔

خیرآباد۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء ریاض

فکاہات

میر کُبّی

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ انھیں میر کُبّی کہا کرتے تھے، حالانکہ ان کی زندگی کا مقصود صرف ہنسنا اور ہنسانا تھا، غالباً یہ نام انکا اسی طرح کا تھا جیسے زنگی کو کافور۔ کہا جاتا ہے۔ جس وقت سال گزشتہ انھیں تپ آئی تو سرسام کا حملہ اتنا سخت ہوا کہ دماغی توازن بلکلیت بگڑ گیا۔ علاج سے خیر وہ حالت تو باقی نہ رہی۔ لیکن سنک نہ جانا تھی نہ گئی۔

میر صاحب نہایت اچھے تعلیم یافتہ شخص تھے اور تعلیم سے زیادہ مطالعہ وسیع تھا، جس صحبت و مجلس میں بیٹھتے بلبل کی طرح چہکتے۔ اور اپنی بذلہ سنجیوں سے ایک بار روتے ہوئے کو بھی ہنسا کر چھوڑتے ایک دن نخاس سے مع اپنے چند احباب کے گزر رہے تھے کہ سامنے سے قبلہ وکعبہ میر یاور حسین صاحب کسی خیال میں محو تشریف لاتے ہوئے نظر آئے، چونکہ میر صاحب کو تقدس اور سنجیدگی سے ازلی دشمنی تھی، اس لئے بے چین ہو گئے اور فوراً جلدی جلدی قدم اٹھا کر قبلہ وکعبہ کے پاس پہونچے اور سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا تو رُک گئے اور مسکرا کر فرمایا " میر صاحب مزاج تو اچھا ہے، بہت عرصہ کے بعد زیارت ہوئی آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا" یہ سنتے ہی میر صاحب نے بہت بھیانک قسم کی شکل بنائی، منھ کچھ کھل گیا، نیچے کا ہونٹ لٹک گیا، آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں اور اسی طرح ہاتھ جوڑے جوڑے عرض کیا کہ " قبلہ وکعبہ غضب ہو گیا۔ میں تو حضور ہی کے یہاں ایک مسئلہ دریافت کرنے جا رہا تھا لیکن اب مجھ میں پوچھنے کی ہمت نہیں رہی"

——"کیوں، کیوں، ضرور فرمائیے۔ کیا قصہ ہے۔"

——"نہیں حضور آپ خفا ہو جائیں گے"

——"مسئلہ دریافت کرنے میں شرم و خفگی کیسی؟"

——" یہ بات نہیں، بلکہ یہ جو آپ نے ابھی فرمایا کہ تجھ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا تو ایک بات میری

سمجھ میں اور بھی آئی ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔

—"خیر پہلے وہ مسئلہ تو آپ دریافت کیجئے۔"

—"سچ بتائے آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔"

الغرض جب قبلہ و کعبہ نے پوری طرح یقین دلادیا کہ وہ برہم نہ ہوں گے تو میر صاحب نے نہایت ادب سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ:-

"رات جب میں سویا تو عجیب و غریب واقعہ مجھ پہ گزر گیا۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ رات کو شیطان سوتے میں مختلف طریقوں سے نظر آتا ہے، کبھی بھوت بن کر ڈراتا ہے، کبھی کوٹھے سے گرادیتا ہے اسی طرح کبھی وہ عورت کی شکل بن کر آتا ہے اور غسل کے طبی فوائد کو مذہبی ضرورت میں تبدیل کردیتا ہے۔ یہاں تک تو مجھے معلوم ہے، لیکن قبلہ و کعبہ رات کو یہ غضب ہوا کہ وہ مرد بنکر میرے پاس آیا۔ اب کیا عرض کروں کہ جی پر کیا گزر گئی۔ صبح کو اٹھا تو سخت حیران کہ اب کیا کیا جائے، تمام کتابیں ڈھونڈھ ڈالیں، لیکن کہیں یہ مسئلہ نظر نہیں آیا اور کسی امام و مجتہد نے کسی جگہ یہ ذکر نہیں کیا کہ اس صورت میں شرعی حکم کیا ہے، پھر اسی کے ساتھ میں اس لئے بھی حیران تھا کہ آج تک تو شیطان کو یہ جرات ہوئی نہیں کہ مجھ ایسے نجیب الطرفین حسنی و حسینی سید کے ساتھ اس طرح پیش آئے، لیکن یہ معمہ تو غالباً حل ہو گیا، کیونکہ جس وقت حضور نے یہ فرمایا کہ "تجھ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا تو فوراً میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو رات کو حضور ہی فرط شوق میں پہونچ گئے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی معمولی شیطان تو اس طرح کی جرات میرے ساتھ کر نہ سکتا تھا۔"

یہ سننا تھا کہ قبلہ و کعبہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور لگے بے نقط سنانے، لیکن میر صاحب ہیں کہ سامنے ہاتھ جوڑے کانپ رہے ہیں اور برابر یہی کہے جا رہے ہیں کہ "حضور جو جی میں آئے کہہ لیں، لیکن یہ میں کیسے مان لوں کہ رات کو قبلہ و کعبہ نے اس بندی کو مشرف نہیں فرمایا۔"

الغرض یہ حالت تھی میر صاحب کی آزادی اور خوش طبعی کی۔ بیماری سے قبل۔ لیکن اب اسمیں بہت تغیر پیدا ہو گیا تھا اور ان کی باتوں سے اب زیادہ غور و تامل (گو سنجیدہ وہ بھی نہ ہوتا تھا) کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اسی کے ساتھ یہ ایک نئی جدت اور ہو گئی تھی کہ عجیب و غریب تشبیہ استعارات و تلمیحات استعمال کرنے لگے تھے۔

صبح کو جب میں پہونچا تو بہت غور سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے اہم مسئلہ پہ غور فرما رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "میر صاحب آپ کس غور و فکر میں

منہمک ہیں۔"

چونک کر بولے۔" سنو جی، یہ خدا، ظالم خدا، جس نے زہرہ ایسی گانے والی کو مار ڈالا، فدا حسین ایسے سرودئے کو نہ چھوڑا، وہ مولانا یکائی ایسے علام الدہر اور فاضل اجل کو کیا چھوڑے گا۔ قسم خدا کی یہ ضرور مجھے مار ڈالے گا۔ پھر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ آہ، یہ چوک کیسا سنسان ہوجائیگا اس نخاس میں کیسی خاک اڑنے لگے گی۔ اور کیوں بھئی یہ اسٹیشن وسٹیشن سب ٹوٹ جائیں گے۔ لوگ پھر سفر کیسے کریں گے، وہی پرانے زمانہ کی بہلیاں پھر رائج ہوجائیں گی۔ واللہ کیا زمانہ ہوگا، منزل بہ منزل لوگ سفر کریں گے، شام کو کسی تالاب کے کنارے بستر بچھا کر کھلی ہوئی فضا میں لوگ سو یا کریں گے، بی منی گا رہی ہوں گی (اب وہ زیادہ بہک چلے تھے) حکیم صاحب نسخہ لکھوا رہے ہیں، ڈھول بج رہا ہے، بچہ رو رہا ہے، پانی سرد ہے، روٹی گرم ہے۔ نہر پر چل رہی ہے پن چکی، دھن کی پوری ہے کام کی پکی"

اب میری ہنسی بے قابو ہو چلی تھی، لیکن میں نے بہت ضبط سے کام لیا، کیونکہ میر صاحب کی حالت اب یہ ہو گئی تھی کہ اگر کوئی ان کے سامنے ہنس دے تو خفا ہو جاتے تھے اور پھر گھنٹوں خاموش رہتے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو کو کاٹ کر کہا کہ" میر صاحب، آپ نے الہ آباد کی نمائش تو ضرور دیکھی ہوگی، سچ کہئے گا کیا چیز تھی۔" میر صاحب نے یہ سن کر ایسی صورت بنالی۔ جیسے وہ بہت غور کر رہے ہوں اور پھر سر ہلا کر دیر تک سوچتے رہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ دو تین بار۔ نمائش، نمائش، نمائش کہا اور پھر چونک کر بولے۔" تم نے دہلی اسٹیشن پر بجلی کے ہنڈے دیکھے ہیں بالکل جیسے چھلی ہوئی لیچی (اب ان پر دورہ تشبیہات کا پڑنے لگا) دودھ کے شربت کا قطرہ جو انگلی کے سرے سے ٹپکنا چاہتا ہو، بالکل وا اریم بردئے خود چکیدن، یا وصیل مچھلی کا انڈا جو بیچ سے دو کر دیا گیا ہو، یا جنت کا انگور جو خوشہ سے علیحدہ ہونے کے لئے تیار ہو۔ ہاں بس یہ سمجھ لو کہ الہ آباد کی نمائش بھی ایسی تھی، واللہ جیسے کسی کے کان کا آویزہ، ماتھے کا جھلمل جھلمل کرنے والا جھومر، نقرئی پازیب کی جھنکار، سینہ پر پڑی ہوئی جڑاؤ دھکدھکی لم یطمثھن قبلھم انس ولاجان۔ فبای الاء ربکما تکذبان۔ آہ! بھئی تمہیں تو معلوم ہے کہ میں نے وہاں اسی لئے ملازمت کرلی تھی واللہ وہ تین مہینے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا "شیر مادر" ہیں — مگر توبہ ہے میری (کان پکڑ کر) توبہ — معاذ اللہ جب ۲۴ دسمبر کی شام کو میں ایک جگہ گرا۔ تو دنیا نے یہی جانا کہ میں نے ٹھوکر کھائی تھی۔ حالانکہ وہ تو مجھے غش آیا تھا، کسی نے مجھے چلتے چلتے دیکھ لیا تھا، آہستہ سے نقاب کا کونہ سرکا کر صرف کنپٹی پر پڑی ہوئی بالوں کی ایک لٹ دکھادی تھی۔ بھائی موسیٰ کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ اچھے آدمی تھے۔ جبھی سے مجھے ان سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ یہ شعر تم نے سنا کسی نے

کیا خوب کہا ہے ؎

ذہانت آپ کی ہے یہ بھی موسیٰ ورنہ تھی کسکو
توقع اس بیاں کی ایک محروم تماشا سے

یہ شعر پڑھ کر میر صاحب دیر تک ہنستے رہے اور پھر دفعتاً خاموش ہو کر اپنے دونوں گال ٹٹول کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ کیوں جی ذرا دیکھنا تو زیادہ ہنسنے سے میرا دہانہ تو نہیں پھیلتا جا رہا ہے۔ پھر خود ہی گالوں سے ہات ہٹا کر جھنجلاتے ہوئے بولے " ہوگا، پھیلتا ہے تو پھیلنے دو ——— وہ مجھے مار یگا ضرور۔ قیامت تک نہیں چھوڑے گا۔ آہ! ظالم خدا، قسم خدا کی، اس سے زیادہ ظلم اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے مار ڈالے۔ کوئی پوچھے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے، میں نے اس کا کیا لیا ہے، لیکن وہ تو اس کی عادت ہے، خون منھ کو لگ گیا ہے، دوست دشمن کی تمیز نہیں، گاؤخر کا امتیاز نہیں، چلے ہیں اللہ میاں بن کے، ہر ایک کو مارنے، یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم۔ (پھر وہ گانے لگے)

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
ایسی زمیں بنائی، یہ آسمان بنایا

اب میر صاحب کی دماغی حالت زیادہ بگڑتی جا رہی تھی اور ایسی صورت میں ان کو اصلی حالت پر لانیکی صرف ایک ہی تدبیر تھی کہ ان کے سامنے غالب کا کوئی شعر پڑھ دیا جائے۔ پھر ان کی توجہ تمام تر اسکی طرف منتقل ہو جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ کے بعض محو شدہ نقوش پھر ابھر رہے ہیں اس لئے میں نے فوراً ان کی موسیقی کو قطع کر کے زیادہ بلند آواز کے ساتھ غالب کا یہ شعر پڑھنا شروع کیا:-

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع

یہ سنتے ہی وہ چونک کر بولے ——— " دیکھا تم نے! حقیقت یہ ہے کہ غالب بھی پرلے سرے کا حرامزادہ تھا یہ اُن کے اعتراف کی انتہائی صورت تھی، اور ہر حسین و جمیل دلکش و دلچسپ، بلند و ممتاز چیز کی تعریف وہ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ اُن سے اگر کبھی دریافت کیا جاتا کہ یہ کونسا طریقہ استحسان کا ہے تو وہ اسکے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ترکی زبان میں ہر اچھی چیز کو عالی جناب کہنا کونسا طریقہ ہے۔ وہاں تو میز، قلم، کرسی، وغیرہ سب عالی جناب کہلائیں اور میں غالب کو حرامزادہ بھی نہ کہ سکوں!

انھوں نے غالب کو گالی دینے کے بعد جو نکات اس شعر کے بیان کرنے شروع کئے تو کمال

ایک گھنٹہ گزر گیا اور اسی سلسلہ میں روح کی حقیقت، خیال کی تعریف، باد کی ماہیت، شمع کی ترکیب، جلوہ کا مفہوم، اور اہتزاز کے سلسلہ میں، ایتھر، ہوا، بجلی وغیرہ کے اہتزازات و تموجات الغرض سبھی کچھ بیان کر گئے، اور پھر آخر میں ایک بار گالی دے کر اٹھ بیٹھے اور بولے کہ :- "حد یہ ہے کہ کمبخت جہاں ٹھوکر کھاتا ہے وہاں بھی اک لطف کے ساتھ۔ لکھتا ہے :-

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

اچھا اب اس شعر کے ٹکڑے کرو، اسکی "بکھان" کرو۔ گرمی کا زمانہ تھا، لو چل رہی تھی، محبوب خس خانہ کے اندر خدا معلوم تنہا یا کسی کی معیت میں مصروف استراحت تھا، یہ حضرت گھبرائے ہوئے وہاں پہونچے اور اطلاع کرائی کہ "غالب حاضر ہے"۔ وہاں سے جواب آیا کہ "خوب یہ کونسا موقع آنے کا ہے کہدو کہ اس وقت خلوت ہے، پھر کسی وقت آئے جب اور لوگ بھی موجود ہوں"۔ غالب نے جو گھبرا کر اس کا جواب دیا تو بجائے شعر کے ایک مستقل گالی ہو کر رہ گیا کہ "مجھے معلوم ہے آپ خلوت میں ہیں لیکن مجھکو اندر نہ بلانے کا یہ کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ غالب بالکل خواجہ سرا ہے اور اسکے ساتھ تنہائی کسی طرح باعث بدنامی ہو ہی نہیں سکتی"۔

لفظ رسوائی کہکر ذم کا یہ پہلو غالب نے پیدا کر دیا، لیکن اس لطف کے ساتھ کہ شعر پڑھیے تو اک کیفیت سی پیدا ہوتی ہے اور خیال اس طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لفظ "اے" نے اس خواجہ سرائیت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے تالی بجا کر ناک پر انگلی رکھ لی ہے اور تھرک تھرک کر، اوئی اللہ، اوئی توبہ کر رہے ہیں۔

وہ اس کے آگے کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک لڑکا "چین نا ہیں آوے تم بن شیام" اُدھر سے گاتا ہوا گزرا اور میر صاحب کا ذہن پھر اسی اندیشہ کی طرف منتقل ہوا، جس کے ماتحت انھوں نے خدا کی شکایت شروع کی تھی۔ فوراً اُٹھے اور جلدی جلدی بکس کھول کر ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے ڈال دیا اور بولے کہ اسے پڑھو۔ چونکہ یہ تحریر میر صاحب کی انتہائی کیفیت وارفتگی کا نتیجہ تھی، اس لئے بہت پر لطف تھی۔ یہ ایک خط تھا جو انھوں نے خدا کے نام لکھا تھا۔ ابتدا یوں کی گئی تھی :-

"جناب خدا۔ سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ"۔

میں نے پوچھا یہ جناب خدا کیا معنے؟ کہنے لگے کہ "یہ اُن کا تخلص ہے"۔ میں نے کہا "کیا خدا شاعر بھی ہے"!

بولے۔ یقیناً اس سے زیادہ شاعر کون ہوگا۔ جسنے دنیا میں ایسے ایسے "مصرع تر" بنائے۔ پھر یوں بھی دیکھو تو یہ ساری کائنات شعر نہیں تو اور کیا ہے۔ مشتری کو کسی بحر میں تصنیف کیا، مریخ کو کسی بحر میں بنایا، چاند کی زمین اور زمین کا چاند اور شیر قالین اور ہے اور شیر نیستاں اور ہے ـــ تو اور میں اور من تو شدم تو من شدی۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ، عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل ــــ

میں نے کہا کہ یہ سلام علیکم کیسا۔ کیا خدا کو بھی ضرورت ہے کہ سلامتی کی دعا اُس کو دیجائے۔ وہ یہ سنکر ہنسے اور بولے کہ "کیا واقعی مینے سلام علیکم لکھا ہے اچھا تو اسے کاٹ دو اور برکاتہ کو بھی حذف کر دو۔ مگر رحمت اللہ کے بعد علیہ ضرور بڑھا دو مصرعہ ہو جائے گا۔

"جناب خدا رحمت اللہ علیہ"

اور پھر سوچکر بولے کہ اسکے بعد دوسرا مصرعہ یہ لکھدو۔

"سلامٌ، ولامٌ علےٰ من لدیہ"

اس کے بعد خط کا مضمون یوں شروع ہوا۔

" رات میں نے خواب میں آپ کو مضمحل دیکھکر بہت افسوس کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اب آپ کے بندے آپ کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن معاف فرمائیے۔ آپ نے بھی تو" زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر کبھی عمل نہیں کیا۔

یہ دور استبداد و قہرمانیت کا نہیں ہے۔ ساری دنیا سے شخصی حکومت اُٹھتی جا رہی ہے۔ لیکن آپ نے کبھی عرش سے نیچے اُتر کر اپنے بندوں کی نہیں سُنی، اور نہ ان کے پاس بیٹھکر ان کی خواہشوں اور ضرورتوں پر غور کیا۔ مثلاً میں ہوں کہ اس وقت میرا جی یہ چاہتا ہے کہ ڈربی کا ہیلا ٹکٹ پندرہ لاکھ کا میرے نام نکل آئے، لیکن میں جانتا ہوں آپ کبھی اس کو پورا نہیں کریں گے اور بجائے میرے شیو پرشاد لال بقال کو یہ روپیہ دلوا دینگے۔ حالانکہ نہ اُس کو دولت کی ضرورت نہ دولت کو اُس کی۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ سب سے پہلے ضرورت روپیہ کی ایک گنہگار کو ہوا کرتی ہے اور اسی سے اور لوگوں کو فائدہ پہونچتا ہے لیکن آپ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ میں بھی کچھ کم گنا ہگار نہیں، مجھے کبھی دولت نہ دینگے۔ بلکہ اس تنگ دل کو دید ینگے جو طاعت تو خیر کیا گناہ بھی اس ڈر سے نہیں کرتا کہ اس میں روپیہ کا خرچ ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آہستہ آہستہ یہ جذبات مخالفت آپ کے خلاف بہت ترقی کر رہے ہیں، اور مجھے بحیثیت ایک بندۂ قدیم ہونے کے بڑا افسوس ہوگا اگر کسی وقت آپ خدائی سے معزول کر دیے گئے۔ ہر چند اُس وقت میرے لئے بھی یہ موقع ہوگا کہ کثرت آراء سے غالباً منصب خداوندی پہ فائز ہو جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ کامیابی کے

کے ساتھ بندہ پروری کرسکوں، تاہم چونکہ آپ ایک زمانہ سے میرے خاندانی خدا چلے آرہے ہیں اور عرصہ سے یہ تعلقات باہمی قائم ہیں، اس لئے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اتنے دنوں کی مروت یوں توڑ دی جائے بہرحال اب وہ وقت نہیں رہا کہ یہ کام اس طرح زیادہ عرصہ تک چل سکے۔ کیونکہ آثار انقلاب قوی ہوتے جارہے ہیں اور تنقید و اعتراض کے لئے ہر شخص دلیر نظر آتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں صاحب یہ انسان کو جو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا ہے، سو بتائیے کہ اسکی ساخت میں وہ کونسی تکمیل ہے، جس پر کوئی صناع یا خالق فخر کرسکتا ہے؛ ذرا سا ٹھنڈا پانی بے وقت پی لیجئے تو زکام، نزلہ، انفلوئنزا موجود، بے احتیاطی سے سوئی کی نوک بھی چبھ جائے تو خون کا فوارہ جاری، گرم ہوا لگی اور بخار مسلط، کوئی تیز خوشبو ناک میں پہونچی اور چھینک پر چھینک وارد، بیماریوں کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ جتنے آدمی نہیں اتنی بیماریاں پیدا کردی ہیں۔ انسان کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ کوئی آفت آہی پڑ آئے، لیکن وہ "بے شرم" کھلونے کی طرح فوراً اٹھ کھڑا ہوا، کنوئیں میں ڈھکیل دو اور اپنے آپ کھٹ سے باہر نکل آئے، کوٹھے سے گرا دو اور پھر اُچک کر وہیں پہونچ جائے گرمی ہو تو مینہ بن جائے، سردی ہو تو انگیٹھی کی طرح دہکنے لگے، اور بارش آئے تو اچھی خاصی چھتری بن جائے۔

تنگ جگہ ہو تو سکڑ جائے۔ جگہ وسیع ہو تو پھیل جائے۔ جن چیزوں کا نام اعضاء رئیسہ رکھا گیا ہے۔ انکے ضعف و نقص کو اور اپنی بے بسی کو ملاحظہ کیجئے کہ نہ ان میں دفع مرض کی صلاحیت اور نہ ہم میں چارہ کار کی اہلیت، مثلاً دل، جگر وغیرہ کو دیکھیئے جو اس قدر احتیاط سے بنائے گئے ہیں، لیکن انھیں ایسا چھپا کر رکھا ہے گویا جسم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، نہ ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کا حال معلوم کرسکتے ہیں، خیر اس کو بھی جانے دیجئے، مرد بد نصیب تھا، جس طرح چاہا بنا دیا، لیکن عورت کی ساخت میں تو لطافت و پاکیزگی کا لحاظ رکھا ہوتا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس کو بول و براز سے مستثنےٰ کردیا جاتا، یہ خیال کس قدر تکلیف دہ ہے کہ دنیا کی حسین سے حسین عورت بھی اسی گندگی میں مبتلا ہے۔

الغرض آپ کے بندے آجکل بہت آزاد ہوتے جاتے ہیں اور ضرورت ہے کہ آپ کبھی کبھی عرش کی بلندی سے اتر کر ان کی بھی سن لیا کریں اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم چند ذی ہوش فرشتے ہی ایسے متعین کیجئے جو صحیح صحیح خبریں آپ تک پہونچا دیا کریں۔

نہ اب کوئی پیغمبر آپ کی طرف سے آتا ہے، نہ معجزوں کا ظہور کسی سے ہوتا ہے، نہ من و سلویٰ کسی پر نازل کیا جاتا ہے، نہ طور پر کبھی آپ جلوہ افروز ہوتے ہیں، نہ چاند کے دو حصہ کرکے اپنی قدرت کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ آخر قصہ کیا ہے۔

بنا بریں حالات، میری رائے ہے کہ آپ اب عجائب وغرائب کے اظہار پر آمادہ ہو جائے اور سب سے پہلے مجھے غیر فانی بنائے، خضر کے وجود سے اب لوگ انکار بھی کرنے لگے ہیں۔ اس لئے اچھا موقعہ ہے کہ مجھے ان کا جانشین بنا کر لوگوں کا منہ بند کیجئے۔ پھر یہ میرا ذمہ ہے کہ آپ کی خدائی کو از سر نو دنیا میں مستحکم کر دونگا اور آپ کا یہ اضمحلال ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔

مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس پر توجہ فرمائیں گے اور یہ خط پہنچتے ہی جبریئل کو اپنی منظوری کا پروانہ لیکر بھیجیں گے۔"

آپکا بندہ خیر خواہ

میرا بکائی

یہ خط پڑھنے کے بعد میں تو گھر چلا گیا۔ لیکن دوسری صبح یہ معلوم کرکے مجھے کس قدر افسوس ہوا کہ خدا نے بجائے جبرئیل کے عزرائیل کو ان کے پاس بھیجدیا اور اس طرح ہمارے میر بکائی خبکی انتہائی تمنا عمر جاوداں حاصل کرنے کی تھی دفعتاً قلب کی حرکت بند ہونے سے فنا ہو گئے۔ اور آخرکار انکا یہ اندیشہ پورا ہو کر رہا کہ " خدا مجھے نہیں چھوڑیگا اور ضرور مار ڈالے گا"

نگار

جولائی سنہ ۱۹۳۱ء

کیا ہوگا اور کیسا؟

جنوری سنہ ۳۱ء کے نگار میں اردو فراست التحریر کے متعلق ایک مستقل رسالہ شائع ہو چکا ہے۔ اب جولائی میں انگریزی فراست التحریر کا حصہ شائع کیا جائے گا تاکہ جن حضرات کے پاس جنوری کا رسالہ موجود ہو ان کو یہ کتاب مکمل صورت میں ملجائے۔

وہ حضرات جنکے پاس جنوری کا رسالہ نہیں ہے یا جنوری کے بعد سے خریدار ہوئے ہیں ان کو اردو فراست التحریر کا حصہ ۸ر میں علاوہ محصول دفتر سے علحدہ مل سکتا ہے۔

جن حضرات کا چندہ جون میں ختم ہو رہا ہے انکو اپنا سلسلۂ خریداری رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ ایسی بے بہا کتاب سے محروم رہیں گے۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرة

واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بآیاتنا لایوقنون۔ (قرآن)

حضرت نیاز مدظلہ العالی کا ممنون و شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے مطالعۂ حدیث کے مضمون دجال میں قرآن شریف کی آیت مذکور الصدر کی غلط فہمی سے مجھکو آگاہ کیا۔ میں نے اس آیت پر دوبارہ غور کیا۔ اور مجھے جو اشتباہ تکلمھم کے معنی پر تھا۔ اسکو اب میں صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میں اس آیت میں قرآن شریف کے ایک بے مثل پیشین گوئی کو پورا پاتا ہوں جو ہمارے سامنے موجودہ زمانہ میں ہو تی ہے۔ جلالین نے بھی تکلمھم کے دو معنی دئے ہیں۔ اگر (ل) مشدد پڑھا جائے۔ تو اس کے معنی باتیں کرنے کے ہیں۔ مگر یہ معنی یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ البتہ اگر (ل) بلا تشدید کے پڑھا جائے۔ تو اس کے معنی آزار یا اذیت یا زخم پہونچانے کے ہوتے ہیں اور یہ معنی یہاں پر زیادہ موزوں ہیں۔

دابۃ من الارض۔ ارض پر آل داخل ہو کر اسکو ایک مخصوص زمین پر محدود کر دیتا ہے۔ یہ مخصوص زمین کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں اور کشاف نے اپنی تفسیر میں آیت "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" میں اسکی پوری صراحت کر دی ہے کہ ارض کے معنی ارض مقدس یا شام کے ہیں۔ جسکو اب فلسطین اور قدیم زمانے میں کنعاں کہتے تھے۔ اور قرآن شریف میں اس آیت میں خدا کا مسلمانوں سے وعدہ ہے کہ وہ ارض مقدس کے وارث ہونگے (اس کا مقابلہ حضرت مسیح کی تمثیل انگور کے باغبانوں سے کرو جو انجیل مرقس و لوقا میں ہے۔ زبور داؤد اور مکاشفات دانیال میں یہی بشارت ہے)

اسکو زیر نظر رکھ کر پہلے جملے کے معنی صاف ہو جاتے یعنی ارض مقدس کی وراثت کا وعدہ جب مسلمانوں پر پورا ہو جائے گا۔ تو ہم ارض مقدس میں ایک دابۃ کو پیدا کرینگے۔ جو مسلمانوں کو زخم پہونچائیگا یا اذیت میں ڈالے گا۔ اس کے بعد ان الناس کانوا بآیاتنا یوقنون صرف ایک اضافی و بے تعلق جملہ رہجاتا ہے۔ جو قرآن میں اختتام قول کے بعد اکثر اعادہ کیا گیا ہے۔

اب دابتہ کیا چیز ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جنگ عظیم میں جو توپ (Tanks) زمین پر چلنے والی اور فوجوں کو پیسنے والی ایجاد کی گئی تھی۔ اس کا نام عربی میں "دبابتہ" رکھا گیا ہے۔ اور بیت المقدس پر مسلمانوں کی پامالی میں جنگ عظیم کے زمانے میں اسی دبابتہ نے سب سے زیادہ کام کیا تھا۔

یہ تو خیر لطیفہ سے زیادہ نہیں۔ بہرحال میں نے جو غلطی دابتہ الارض کے متعلق ذکر دجال میں کی تھی اس سے میں رجوع کرتا ہوں۔ میں اس خیال میں تھا کہ کہیں دابتہ الارض سے وہ جانور تو مراد نہیں جس کا ذکر مکاشفہ یوحنا اور دانیال میں تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے؟ اگر اس سے مراد صرف ہلاکت و تباہی ہو، تو پھر گفتگو اس میں ہوگی کہ آیا عربی زبان میں دابتہ کسی غیر ذی روح کے لئے استعمال ہوتا ہے یا نہیں؟

"حق گو"

(نگار) فاضل مقالہ نگار (حق گو) نے اس کا اعتراف تو کر لیا کہ تکلمھم بغیر تشدید لام کے درست ہے اور اس لئے آزار یا اذیت پہونچانے کے پہونچانے میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں الارض اور دابتہ کے متعلق جو اظہار خیال انھوں نے کیا ہے۔ اس سے مجھے ہنوز اختلاف ہے۔

الارض کا مفہوم اختیار کرنے میں انھوں نے صاحب کشاف اور شاہ ولی اللہ کا تتبع کرتے ہوئے ارض مقدس اور شام کے معنے لئے ہیں۔ کیونکہ لفظ ارض پر الف لام تخصیص کا داخل ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، کیونکہ کلام مجید میں ہر جگہ لفظ ارض (جبکہ وہ کسی اور لفظ سے مضاف یا منسوب نہ ہو) الف لام کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور اس لئے صاحب کشاف اور شاہ ولی اللہ کے اصول کے مطابق ہر جگہ لفظ ارض سے کوئی مخصوص و متعین سرزمین ماننا پڑے گی، درآنحالیکہ ہر جگہ قرآنی مفہوم اور سیاق و سباق تعمیم معنی کو چاہتا ہے۔ مثلاً وسع کرسیہ السموات والارض میں کیا آپ الارض سے کوئی مخصوص حصہ زمین مراد لیں گے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس جگہ تخصیص کا مفہوم نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:۔ امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء یہاں بھی ارض پر ال داخل ہے، لیکن مراد سارا کرہ زمین ہے۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آیت زیر بحث میں الارض سے کیوں سرزمین شام یا ارض مقدس مراد لی جائے، اور کیوں نہ اس سے روئے زمین مقصود ہو اور کیوں نہ اس سے ایک عام اصولی پیشگوئی تمام مفسدین کی تباہی کی مراد لی جائے۔

تکلمھم کے متعلق جناب حق گو نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر اسے تشدید لام سے پڑھا جائے

تو اس کے معنے باتیں کرنے کے ہوں گے۔ اور اگر بغیر تشدید پڑھا جائے تو مجروح کرنے کا مفہوم ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار سے یہاں بھی تسامح ہوا۔ کلام، ثلاثی حالت میں بھی مجروح کرنے کا مفہوم ظاہر کرتا ہے اور جب باب تفعیل میں استعمال کیا جائے تو بھی، یعنی کلم و تکلیم دونوں کے معنے ایک ہیں۔ البتہ جب باب تفعل میں اس کا استعمال ہو یعنی اس کا مصدر تکلم ہو تو بات کرنے کو مفہوم میں آئے گا۔ اس لئے آیت زیر بحث میں تخفیف لام کا ذکر غیر ضروری ہے، کیونکہ یہاں باب تفعیل میں اس کا استعمال ہوا ہے اور لام کا مشدد ہونا ضروری ہے۔

اب رہا سوال دآبتہ کے مفہوم کا، سو شکر ہے کہ ہمارے حق گو اپنے بتائے ہوئے مفہوم سے رجوع کرتے ہیں، لیکن ہنوز ان پر تذبذب کی کیفیت طاری ہے، اور وہ بھی محض اس لئے کہ معلوم نہیں عربی زبان میں لفظ دآبتہ کسی غیر ذی روح کے لئے استعمال ہوتا ہے، یا نہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر لفظ دآبتہ فی الحقیقت کسی مہلک جانور یا چرپایہ و درندہ ہی کے لئے استعمال ہوتا ہو تو بھی اس کو مجازی حیثیت سے محض بہ معنی ہلاکت و تباہی استعمال کر سکتے ہیں۔ قرآن میں کثرت سے الفاظ کا استعمال مجازی معنے میں ہوا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی اگر دآبتہ الارض کا بھی کوئی مفہوم مجازی لے لیا جائے۔

محمد عمر نعمانی۔ ایڈورڈ گنج۔ شملہ۔
شملہ۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۱ء

مکرمی محترمی جناب مولانا نیاز صاحب زاد لطفکم

السلام علیکم۔ میں عرصہ کے بعد مسلمانان ہند کے پنجاہ سالہ علمی مرکز اور حکومت ہند کے پایۂ تخت (علی گڑھ) کا طواف کرنیکے بعد حال ہی میں شملہ وارد ہوا ہوں۔ میں جس وقت یہاں سے روانہ ہوا تھا تو ۱۹۳۰ء اپنے آخری سانس گن رہا تھا۔

میری عدم موجودگی شملہ کے زمانہ میں نگار براہ راست شملہ پہنچتا رہا۔ اسلئے اب ورود شملہ پر نگار کے گذشتہ پرچے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نگار کی جنگ "علمائے دین و مفتیان شرع متین" سے خوب ہوتی رہی۔ حقیقتاً آپ نے مطبوعہ فتوے جاری کرکے آلات رشد و ہدایت کی سمائی فضاء میں تہلکہ ڈال دیا۔ ان کے خیالات اس فتوے کے متعلق چاہے کچھ ہی ہوں میرا تو خیال ہے کہ وہ آپ کو کشتنی و گردن زدنی تصور کرتے ہوں گے۔ لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ آپ نے ایک بہت بڑی اسلامی

خدمت سرانجام دی ہے۔ جس چیز کو وہ اسلام سمجھ رہے ہیں وہ ایک سطحی شے ہے اور اسلام حقیقت نفس الامر میں جیسا کہ آپ سمجھ چکے ہیں بہت ارفع واعلیٰ ضابطۂ عقائد، عبادات اخلاق ومعاملات ہے، اس سے کون واقف کار انکار کرسکتا ہے۔ کہ آج ان علمائے دین ومفتیان شرع متین" نے "صوم و صلوٰۃ، حج وزکوٰۃ" کی صوری ادائیگی کو اصل اصول اسلام سمجھ رکھا ہے۔ چند رسوم ورواج ہیں جن کو یہ حضرات اسلامی تعلیمات کا مجموعہ قرار دیکر اسلام کو دنیا کے روبرو ایک افضل واکمل مذہب کی صورت میں پیش کرنے کے خوگر ہو چکے ہیں اور حقیقی محاسن وفضائل اسلام کو ناقص تعلیمات کی وجہ سے جہل ونادانی کے غلاف درغلاف پردوں میں مستور کرچکے ہیں۔ آج تو حالت یہ ہے کہ اطراف و اکناف ملک کے بعض ان مدارس عربیہ سے (جن کو ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اقتضائے عالم میں کیا ہو رہا ہے) طلبہ درس نظامیہ کی چند فرسودہ اور بوسیدہ کتب رٹ کر نکلتے ہیں اور دنیا جہان کو اپنی معلومات، ناقصہ کے مقابل ہیچ سمجھنے لگتے ہیں۔ بس۔

جس کی بہار یہ ہو تو اسکی خزاں نہ پوچھ،

پھر آپ کو ان حضرات سے جائے شکایت کیوں ہو۔ دور نہ جائیے پچیس تیس سال کا زمانہ گذر چکا کہ محض نصاب تعلیم کا مسئلہ زیر بحث وتمحیص ہے۔ لیکن کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اب تک اس بارے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ تابہ اصلاح بدعات ورسومات چہ رسد۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب تک ان ہادیان دین متین کا قلب ماہیت نہ ہوگا۔ جبتک نام نہاد صوفیائے وقت کے قلوب اذہان میں تغیر عظیم رونما نہ ہوگا اور وہ قوالی رقص وسرود کی ذہنیت کو خیرباد نہ کہینگے موجودہ مسلمانوں جیسی علم وعرفان سے عاری قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ بہرکیف اوائل ۳۱ء سے اگر ایک طرف آپ ان خدائی فوجداروں سے دست وگریباں تھے تو دوسری جانب نیازکیش بھی پانچ چار ماہ نچلا نہ بیٹھ سکا دوران قیام علی گڑھ میں بعض احباب نے فرمائش کی کہ میں اپنے ناچیز خیالات سے عامۃ المسلمین کو بہرہ ور ہونے کا موقع دوں۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں خاموش رہتا۔ ماہ رمضان کے مبارک ایام تھے۔ جامع مسجد میں میری تقریریں ہوئیں۔ لیکن عجب حسن اتفاق کہ جن امور کو آپ ایک طرف "علماء دین" کی خدمت میں پیش کرکے ان کے مزعومات باطلہ اور ظنیات لاطائلہ کے بتوں کو توڑ رہے تھے۔ میں علی گڑھ کے محراب منبر سے عبادات اسلامیہ کی اصلی غرض و غایت کا غلغلہ بلند کر رہا تھا۔ میں نے بلا لومۃ لائم بیان کیا کہ رسمی عبادات جن کے مسلمان خوگر ہو چکے ہیں۔ ہرگز مسلمانوں کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکیں۔ اگر انھیں اپنی آیندہ سود وبہبود مدنظر

اور وہ دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو رسمیات کو خیرباد لکہکر اسلامیات کی اصلی و حقیقی کائنات میں قدم رکھیں۔ عبادات کی غایت الغایات کو سمجھیں۔ عقائد مذہبی سے صحیح طور پر آگاہ ہوں۔ اخلاقیات کو اپنا دستور العمل بنائیں اور معاملات کو معاملات سمجھ کر سرانجام دیں۔ ورنہ محض اسلام اسلام پکارنا اور مسخ شدہ تعلیمات اسلامیہ پر تکیہ کرنا مسلمانوں کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ یقین جانئے میں نے بھی ڈنکے کی چوٹ کہا اور تعلیمات قرآنیہ سے ثابت کیا کہ تمام ارکان اسلام کے اغراض و غایات علوئے اخلاق و روحانیات کے سوا کچھ نہیں۔ اس پر عربی مدرسا کے ایک فارغ التحصیل مولوی نے جیسا کچھ سیخ پا ہو کر منہ کی کھائی وہ ارباب علی گڑھ پر خوب روشن ہے۔ آخر علی گڑھ علیگڈھ ہے۔ وہاں کم از کم علوم و فنون کے ماہرین کی تو کمی نہیں۔ انھوں نے حق و باطل میں تمیز کی۔ اور ناچیز خیالات کے اظہار پر میری حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میں نے بھی اگر حقیقت حال کے اظہار کو خودستائی پر محمول نہ کیا جائے۔ آیتوں اور روایتوں سے حتی الامکان ثابت کردیا کہ ارکان اسلام وسعت اخلاق و ارتقاء روح کے حق میں نفس ناطقہ کا حکم رکھتا ہے اسی لئے عرب میں یہ روایتی مثل زبان زد چلی آتی ہے کہ

لا تصلح امۃ حتے تصلح اخلا قھا.....

اور احسنا بکم اخلاقکم واسنابکم اعمالکم ہی اسلامی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان علمائے اسلام کی مخالفت نے آپ کے سمند ہمت پر تازیانہ کا کام کیا ہوگا۔ اور آپ بھی اپنے مطمح نظر اور مطرح فکر میں بیش از بیش سینہ سپر ہو کر ظاہر پرستی کے تار و پود کو تار عنکبوت ثابت کر دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

(نگار) مجھے یہ معلوم کرکے کس قدر مسرت ہے کہ آپ نے نگار کی مذہبی خدمات کا اعتراف صرف زبان ہی سے نہیں کیا۔ بلکہ عملاً اس کے استحسان کا ثبوت پیش کیا۔ اس وقت نہیں بلکہ ہمیشہ سب سے بڑا مرادوہی سمجھا گیا جس نے حق وصداقت کی تبلیغ میں کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ کے اس مردانہ عزم کی داد نہ دوں۔

اگر آپ کبھی لکھنؤ تشریف لائیں اور نگار کی ڈاک ملاحظہ فرمائیں تو آپکو معلوم ہو کہ دنیا اس آواز کے لئے کس قدر بیتاب تھی۔ جس کے بلند کرنے کی توفیق عرصہ سے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی، اور ہر شخص اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب دیکھنے کے لئے کس درجہ مضطرب تھا۔ جس کے چہرہ کو مدارس کے مولویوں

محراب و منبر کے واعظوں اور خانقاہ کے مشایخ نے اپنی غلط تعلیم، اپنی لغو تبلیغ اور اپنی لایعنی تصریحات سے گرد آلود و مستور بنا رکھا تھا۔

ڈڈرو کا قول ہے کہ :" بادشاہ وقت انسانوں کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔ اور علماء دین عقول انسانی کو۔ بادشاہ کا وجود نہ رہے تو انسان آزاد ہو جائے اور علماء دین نہ ہوں تو فکر انسانی آزاد ہو جائے اس لئے زمین کے آخری بادشاہ کا گلا اُس آنت کے پھندے سے گھونٹ دو جو سب سے آخری عالم دین کی آنت سے طیار کی گئی ہو"

اس لئے جہانتک ممکن ہو تانت کے یہ پھندے طیار کرتے رہیئے اور دنیا سے اس موذیت کے جراثیم کو مٹاتے رہیئے کہ اب یہی ہے اصل خدمت اسلام کی اور انسانیت کی۔

موج کوثر

یہیں اودھ کی ایک خاتون نے جو باوجود برافگندہ نقاب رہنے کے، اپنی شخصیت کو بے حجاب کر دینے پر کسی طرح راضی نہیں، ایک تحریر کے ساتھ ذیل کے چند اشعار اشاعت کی غرض سے روانہ کئے ہیں۔ آپ لکھتی ہیں کہ:-

"مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ عورتوں کی غزلگوئی کو پسند نہیں فرماتے اور پھر بھی یہ جرأت کرتی ہوں کہ آپ ہی کے پاس یہ چند اشعار بغرض اشاعت بھیج رہی ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نہ شاعرہ ہوں، نہ شعر فہمی کی مدعی، لیکن پھر بھی گاہے گاہے، بے اختیار کسی خاص اثر کے ماتحت متفرق ابیات قلم سے نکل جاتے ہیں، حیران ہوں کہ انھیں کیا کہوں۔ وزن و تقطیع سے بے نیاز ہونے کا نام نثر ہے۔ اس لئے یہ شعر تو یقیناً نہیں ہیں، مزخرفات میں البتہ ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ بہرحال اشاعت و عدم اشاعت کا اختیار آپ کو حاصل ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ کیا بلا ہے۔ آپ غالباً یہ سُن کر حیران ہونگے کہ میرے پاس اسی نوع کی پریشاں خیالی کا ایک ضخیم دفتر موجود ہے۔ یہ چند ابیات صرف وہ ہیں، جو گزشتہ رات کی تنہائی میں بے اختیار زبان پر جاری ہو گئے۔

نہیں بھولتی ہے نہیں بھولتی ہے ۔۔۔ وہ صورت بھلایوں کہیں بھولتی ہے

جان جو زندگی پڑتے ہیں، ۔۔۔ چارۂ کار اُن کو کیا معلوم

چارۂ دل کیتے ہو مشکل نہیں، ۔۔۔ جاؤ تم سے چارۂ دل ہو سکا

بے تمہارے میں جی گئی اب تک ۔۔۔ تم کو کیا خود مجھے یقین نہیں

زمانہ مجھ سے خفا ہے تو ہو نہ دلیکن خدا کے واسطے تم تو خفا نہو مجھ سے

کہاں تک لکھے جاؤں خط اُنکو ہمدم وہ جب پڑھتے ہیں یونہی بھولتے ہیں

کیا کہا تمنے کہ "کیا تو نے دیا ہے اے لو" گو نکمی سہی اک جان ہے باقی لے لو

چند دن آہ، یہاں میں بھی خدائی کرلوں جھوٹ ہی کہدو کہ "ہاں تجھ سے محبت ہے مجھے"

بانسری بج رہی تھی دور کہیں رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

کل کا بھی دن کیا یونہی ٹل جائیگا آج کی شب اور کروٹیں بدل لیں

راقمہ..............

محترمہ۔ میں یقیناً عورتوں کی غزلسرائی کا مخالف ہوں، نہ کہ دردسرائی کا۔ آپ کا ایک ایک شعر آپکے تاثرات عمیق کی تصویر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس درد مہجوری کے ماتحت آپ کے دل سے یہ پارہ ہائے آہ نکلے ہیں، وہ اس قدر بلند و معصوم چیز ہے کہ عورت کیا مجھے تو بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں بھی نظر نہیں آتی آج کل عورتوں کی شاعری بھی (بہت سے مردوں کی طرح) یکسر اکتسابی ہوتی ہے جس سے سوائے شہرت اور نام و نمود کے کچھ اور مقصود نہیں ہوتا۔ اور میں اسی چیز کا مخالف ہوں۔ مجھے آپ کی اس عالی ظرفی اور بلند نظری پر رشک آتا ہے کہ باوجود اس قدر پاکیزہ اشعار کہنے کے بھی آپ اپنے نام کا اظہار پسند نہیں فرماتیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر میں خود ذاتی طور پر آپ کی اعلےٰ تربیت سے آگاہ نہ ہوتا یا یہ کہ خود آپ کے اشعار کا ایک ایک لفظ اگر اس لطافت خیال اور رقت جذبات کا شاہد نہ ہوتا جو دنیا میں صرف عورت ہی کے محبت کرنیوالے دل کی خصوصیت خاصہ ہے تو میں کبھی یقین نہ کرتا کہ یہ اشعار آپ ہی کے یا ہندوستان کی کسی عورت کے ہو سکتے ہیں، جہاں مردوں سے غزلیں اور مضامین لکھوا کر اپنے نام

سے شائع کرانے کی ذلیل عادت وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

آپ کے یہ تمام اشعار بالکل اسی نوع کے ہیں جو ہندی شاعری میں کسی "بیوگنی" کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں، وہی دردمندی، وہی بیچارگی وہی انہماک محبت اور وہی عجز و فتادگی جو ہندوستانی عورت کا خمیر ہے آپکے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ نگار کے صفحات اسکی اجازت نہیں دیتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپکا ایک ایک شعر مستقل گفتگو چاہتا ہے۔

خدا کرے آپ خوش رہیں کہ ایک زمانہ کے بعد آپ نے ایسے ایسے پاکیزہ شعر سنا کر تھوڑی دیر کیلئے مجھے وہ عہد ماضی یاد دلا دیا جب زندگی واقعی عبارت تھی صرف "بانسری کی آواز" سے گویہ کہنے والا کوئی نہ تھا کہ "رات کس درجہ یاد آئے ہو تم ——"

بہر حال نگار کے صفحات آپکی اس جمیل "پریشان خیالی" کے شیرازہ بندی کیلئے ہر وقت حاضر ہیں اور میں شکرگزار ہونگا اگر آپ وقتاً فوقتاً اس "مجموعۂ پریشانی" کو جو عرفی کی زبان میں "خیالِ زلف" سے کم دلکش نہیں ہے، نگار کے لئے منتشر فرماتی رہیں گی

"نیاز"

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

شاعت کے یکسالہ قیام کے اندر جس محنت و جانفشانی سے لیکر متعدد کتابیں شائع کیں، وہی بجائے خود قابل ستائش امر تھا چہ جائیکہ اسی کے ساتھ ایک نہایت ہی بلند و پاکیزہ ذوق کا ماہوار رسالہ جاری کرنا اور صرف تنہا اپنے دماغ کے اعتماد پر! مجھے امید ہے کہ ارباب ذوق ایوان اشاعت کے ممبر ہو کر جناب مجنوں کی خدمات کا اعتراف کرینگے اور ایک ایسے شخص کی خدمات سے ملک کو مستفید ہونے دینگے جس سے اگر آپ چاہیں تو بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔

غالباً سینکڑوں ہی بار اس امر کا اعلان کیا گیا ہو کہ خریداران نگار کو تبدیلی پتہ یا عدم رسی رسالہ کی اطلاع دینے کی غرض سے حسب خط و کتابت کی ضرورت ہو تو نمبر خریداری ضرور تحریر فرما دیں، لیکن افسوس ہے کہ بعض حضرات پھر بھی اسطرف مطلق توجہ نہیں فرماتے اور بعض تو یہ ستم کرتے ہیں کہ اپنا نمبر خریداری ۱۱۰۴ لکھدیتے ہیں جو نگار کا رجسٹرڈ نمبر ہے۔ نہ کہ کسی کا نمبر خریداری۔

نمبر خریداری وہ ہے جو پتہ کے داہنی جانب ہر ماہ بلیو بلیک سیاہی سے درج کیا جاتا ہے۔ اگر آپ صرف ایک بار اسکو غور سے پڑھکر کسی جگہ نوٹ فرمالیں، تو ہمیشہ کے لئے ہماری اور آپ کی دقت رفع ہو جائے۔

بعض حضرات یہ لکھدیتے ہیں کہ فلاں ضلع کے خریدار دنمیں ہمارا نام و پتہ ڈھونڈھ لیا جائے۔ انکو شاید اسکا علم نہیں کہ رجسٹر خریداران ضلع وار مرتب نہیں کیا جاتا اور اسلئے انکے اس ارشاد کی تعمیل کیونکر ممکن ہے۔

وہ حضرات جن کے پاس رسالہ کسی ماہ کا نہیں پہونچتا انکے لئے بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ دفتر کو مورد الزام قرار دیں، انکو کبھی خیال نہیں ہوتا کہ ممکن ہے راستہ میں پرچہ گم ہو گیا ہو یا یہ کہ خود انکی ڈاک کا انتظام درست نہ ہو یا یہ کہ اُن کی عدم موجودگی میں رسالہ آیا ہو اور کسی نے اُسکو غائب کر دیا ہو۔

جسوقت رسالہ طیار ہوتا ہے تو فہرست خریداران سے پتہ کے کاغذ کا کم از کم دو بار مقابلہ کر لیا جاتا ہے تاکہ کوئی نام رہ جائے اور اسکے بعد پرچہ ڈاکخانہ روانہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ احتیاط ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی بعض حضرات کو رسالہ نہیں پہونچتا اور کسی نہ کسی طرح راستہ میں یا اُنکے پاس پہونچنے سے قبل غائب ہو جاتا ہے۔ اسکے صرف دو علاج ہیں ایک یہ کہ ہر خریدار اپنے مقامی ڈاکخانہ کو توجہ دلائے اور ڈاکیہ کو تاکید کیجئے کہ وہ آپکی ڈاک کسی اور کے حوالہ نہ کرے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ۲۰ تاریخ سے قبل ہی پرچہ عدم رسی کی اطلاع دفتر کو دیدیجئے تاکہ پرچہ دوبارہ روانہ کر دیا جائے۔ بعض حضرات دو دو ماہ کے بعد چونکتے ہیں اور جب ہم پرچہ ختم ہو جانیکی وجہ سے تعمیل نہیں کر سکتے تو برہم ہوتے ہیں حالانکہ اُنکو سمجھنا چاہئے کہ قاعدہ کی عدم پابندی کا بار کس پر ہونا چاہئے۔

لائبریریوں، اخبار خانوں اور مدارس سے اس قسم کی شکایات زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی وجہ کھلی ہوئی یہ ہے کہ ان مقاموں میں ڈاک کسی خاص شخص کے حوالہ نہیں کیجاتی اور رسالہ کا مکتوب الیہ تک پہونچنے سے قبل ہاتھوں ہاتھ کہیں سے کہیں پہونچ جانا بالکل ممکن ہے۔ کیا آیندہ آپ ان امور کا لحاظ رکھیں گے۔

نیاز

حقیقتِ شاعر

طعنہ زن ہیں، مجھ پہ اہلِ دعوئے فضل و کمال — یعنی میں "صرف ایک شاعر" کے سوا کچھ بھی نہیں
کارواں بیتاب ہے، تدبیرِ منزل کے لئے — مجھکو لیکن شورشِ بانگِ درا کچھ بھی نہیں
موت کے سائے میں ہے دنیائے فانی کا نظام — اور مجھے اندیشۂ دامِ فنا کچھ بھی نہیں
لے رہا ہے ذرہ ذرہ درسِ تکمیلِ حیات — اور یہاں اک ناتمامی کے سوا کچھ بھی نہیں
اُسطرف، تعمیرِ گیتی میں ہزاروں انقلاب — اور ادھر یہ جوشِ ہمت آزما کچھ بھی نہیں
دوڑتا ہے، خار و خس کی نبض میں خونِ چمن — میرے حق میں نغمۂ موجِ صبا کچھ بھی نہیں
سطح پر، بکھرے ہوئے ہیں سینکڑوں جلوے، مگر — مجھکو یہ نظارۂ بینش فزا کچھ بھی نہیں
حیف، وہ بیگانۂ احساسِ دل، جسمیں کہیں، — سوزِ ناکامی، نشاطِ مدعا کچھ بھی نہیں

الغرض ہر شے میں ہیں بیدار آثارِ حیات
موت کے حجرے میں ہے خوابیدہ میری کائنات

نکتہ چیں احباب، اس الہامِ دانش کے عوض — کاش کچھ اپنی حقیقت پر نظر فرما سکیں
مطمئن ہے جنکے زیرِ سایہ شاعر کا دماغ — کاش یہ اُس منزلِ علم و یقیں کو پا سکیں
کاش، انکی سطح بیں نظریں گھڑی بھر کیلئے — روحِ شاعر کے عمیق اسرار تک بھی جا سکیں
بند ہے شاعر کے سینے میں جو طوفانِ حیات — کاش، اُسکی شورشیں انکی سمجھ میں آ سکیں
نطق کے افسوں سے بخشیں روح کو بالیدگی — دل پہ جو گرتی ہیں، ایسی بجلیاں چمکا سکیں
چند لفظوں میں گرہ اسرارِ دل کی کھولدیں — جنبشِ لب سے دماغِ فکر کو جو نکا سکیں
کاش ان اہلِ ہوس کے سامنے بھی صبح و شام — شاہدِ فطرت کی زلفیں دوش پہ لہرا سکیں

کاش یہ بھی سُن سکیں سازِ حقیقت کی صدا،
نبضِ گیتی میں حیات افزا لہو دوڑا سکیں،

ذرۂ ناچیز اور شانِ جلالِ آفتاب!
ناتواں سی اک نظر اور سامنے اتنے حجاب!!

تو اگر مے کی لطافت سے نہیں ہے آشنا — کون کہتا ہے، گدائے کوچۂ میخانہ ہو
بے خبر ہے کیف کے رازوں سے گر تیری نگاہ — کون کہتا ہے، فدائے نرگسِ مستانہ ہو
تیری فطرت ہے، اگر بیگانۂ ذوقِ حیات — کون کہتا ہے، رہینِ گردشِ پیمانہ ہو
روح کے اسرارِ بیداری سے گر واقف نہیں — کون کہتا ہے کہ تو صرفِ رہِ بتخانہ ہو
تیرے دل ہی میں نہیں گر رازِ ہستی کی تلاش — کون کہتا ہے کہ تو بیہوش بن، دیوانہ ہو
تو اگر ہے ناشناسِ جلوۂ تسکینِ روح — کون کہتا ہے، حریفِ شورشِ پروانہ ہو
تو اگر ہے ناپذیرِ عشرتِ ناز و نیاز — کون کہتا ہے کہ محوِ جلوۂ جانانہ ہو
تو سمجھتا ہے، اسے غافل! اسیرِ دامِ عقل — طائرِ اسرارِ ہستی ہی کہیں عنقا نہ ہو

سن کہ تو کس دانشِ بیدار پر مغرور ہے
دور ہی منزل سے اے سیاح کوسوں دور ہے

میں دکھاؤں آ تجھے آئینۂ سترِ ازل — تا کہ تیری روح پر طاری ہو عرفاں کا جلال
شعر کیا ہے، خود تری فطرت کا اک پیغام ہے — جسکو پہنچاتا ہے تجھ تک شاعرِ نازک خیال
تیرگی کے قلب کی آواز سن سکتا ہے تو — تو اگر پہچانتا ہے جنبشِ نبضِ جمال
تیرے سینے میں اگر روشن ہے فطرت کا چراغ — گر تجلی گاہِ عرفاں ہے تری بزمِ کمال
گر ترے امروز میں ہے جامِ فردا کا سرور — گر ترے آغاز میں ہے، جلوۂ حسنِ مآل
تجھ سے کرتی ہے اگر صبحِ درخشاں گفتگو — تجھ سے شامِ تار اگر لیتی ہے درسِ قیل و قال
تو اگر ہے رازدانِ ہستیٔ دانش فریب — تو اگر ہے، بے نیازِ حلقۂ دامِ خیال
ہاں یہ ممکن ہے، تری فطرت ہے گر اتنی بلند — ورنہ فہمِ ہستیٔ شاعر ہے تحصیلِ محال

در سفالین کاسۂ رنداں بخواری منگرید
کیں حریفاں خدمتِ جامِ جہاں بیں کردہ اند
(حافظ)

علی اختر (از حیدر آباد)

پرتوِ غیب

ہنوز شعلہ ہے پردے میں منھ چھپائے ہوئے
مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں لَے جلائے ہوئے

ہنوز یار ہے خلوت گزینِ حجلہ نشیں
تمام بزم کے چہرے ہیں مسکرائے ہوئے

ہنوز قطرۂ نیساں ہے اندر ضمیرِ سحاب
مگر صدف میں ہیں موتی سی جگمگائے ہوئے

کھلے ہوئے ہیں صبا میں ہزار ہا نافے
اگرچہ زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے

ہنوز غیبتِ خورشید سوا افق ہے اُداس
تمام دشت کے ذرے ہیں جگمگائے ہوئے

رچی نہیں ہے فلک پہ ہنوز شادیٔ ابر
چمن کی خاک ہے خود کو دلہن بنائے ہوئے

ہنوز میان سے باہر نہیں ہوئی ہے وہ تیغ
پڑے ہیں کتنے مگر خون میں نہائے ہوئے

نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام
مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے

ضمیر سنگ میں خوابیدہ ہے جمالِ صنم
ابھی سے کتنے برہمن ہیں سر جھکائے ہوئے

چہک رہے ہیں عنادل لہک رہی ہے نسیم
ہنوز غنچۂ رنگیں ہے سر جھکائے ہوئے

سلگ رہے ہیں برابر ہزار ہا خرمن
ہنوز ابر میں بجلی ہے منھ چھپائے ہوئے

خبر ہے جوش اٹھے گی کسی کی آنکھ ادھر
دلوں کو لوگ کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

جوش ملیح آبادی

تو ـــــــ ؟

اے کہ، مجھکو آرزو کے خواب دکھلاتا ہے تو !
آنکھ کھلنے پر کہاں ؟ روپوش ہو جاتا ہے تو !
چاند تاروں کے مسرت خیز نغمے اور ہیں !
کہکشاں کے کیف سے لبریز نغمے اور ہیں !
اور ترے، نشتر سے بڑھ کر تیز نغمے ـــ اور ہیں !
کس جگہ ہو کر نہاں ؟ "یہ تیر" برساتا ہے تو !

(۲)

بوئے گل لاتی ہے جب تیرے تبسم کا پیام !
کوئی کہتا ہے، کہ تو گلشن میں ہے محوِ خرام !
دوڑتا ہوں، اور آ جاتا ہوں، بے نیل مرام !
کون سے پردے میں اے محبوب چھپ جاتا ہے تو !

(۳)

آنکھ اٹھاتا ہوں تو گویا جلوہ آرا ہے ـــ تو ہی !
سر جھکاتا ہوں تو جیسے دل میں بیٹھا ہے ـــ تو ہی !!
چونک اٹھتا ہوں تو اِک موہوم دنیا ہے ـــ تو ہی !!!
پاس آ آ کر کہاں کوسوں نکل جاتا ہے تو !

گیت گائے جائیں بزم زہرہ و ناہید میں !!
دوڑتے پھرتے ہوں نغمے ـــ دامنِ خورشید میں !!
اور "مایوسی" ہو میری ـــ محفلِ امید میں !!
کیوں ہر اک ذرے کو خاموشی سکھا جاتا ہے تو !

(۴)

تیرے غمزوں سے کوئی بے اعتنائی سیکھ لے ،
کس طرح ہوتا ہے خونِ آشنائی ـــ سیکھ لے !
سیکھ لے ، بس کوئی تجھ سے بیوفائی ، سیکھ لے !
پھیر کر آنکھیں مجھے برباد کر جاتا ہے تو !

(۵)

آبشاروں کو تری مستی سے ہشیاری ، ملے !
تیری نکہت سے چمن زاروں کو گلباری ، ملے !
شمعِ دل کو "مرگِ الفت" کی عزاداری ، ملے !
یاد بھی ہے ؟ چارہ سازِ عشق کہلاتا ہے تو !

(۶)

آنسوؤں کو میرے صبحِ شبنمستانیں ـــ نہ ڈھونڈھ
میری آہوں کو ــــ فضائے نغمہ ساماں نہ ڈھونڈھ
میرے دل کی آگ کو ــــ شمع فروزانیں نہ ڈھونڈھ
میں وہی ہوں جس سے اے محبوب شرماتا ہی تو !

(۷)

آہ ! بس رہنے دے ، تحقیرِ غمِ پنہاں نہ کر !
خونِ دل ہو جائے گا ۔ خونِ دلِ نالاں نہ کر !
عشق کے کمزور ہاتھوں سے جدا داماں نہ کر !
چھوڑ کر مجبورِ الفت کو کہاں جاتا ہے تو !

دوش صدیقی

رجزِ معنوی

جلا دیتا ہے جو ہر کو گرفتار بلا ہونا
جبھی شیوہ ہی اہلِ درد کا درد آشنا ہونا

مرے پہلو میں دل ہی چھانٹ کر رکھا ہی قدرت نے
میں کیا سے کیا ہوا ہوں اور ابھی ہو کیا سے کیا ہونا

حقیقت زندگی اور موت کی آئینہ ہی مجھپر
وہ محوِ جستجو رہنا یہ نذرِ مدعا ہونا

نہ جینے کے برابر ہی جہانمیں رائگاں جینا
وہ ہونا خاک ہونا ہے نہیں جو کام کا ہونا

نہ کیوں تدبیر کی شمشیر کا صیقل ہو ناکامی
مری قسمت میں ہو فرمانڈہ ارض و سما ہونا

میں قطرہ ہوں مگر ایسا کہ جو ساحل نہیں رکھتا
میں ذرہ ہوں مگر ایسا جسے ہو خودنما ہونا

اکیس برسوں کی بیماری سے اللہ نے شفا بخشی
مبارک ہو دعاءِ صبحگاہی کا دوا ہونا !!

آمین حزیں

دو۲ تبسم

یعنی جنابِ شوکت تھانوی مشہور مزاحیہ نگار کے مجموعہ مضامین کی

دو جلدیں

موجِ تبسم (اور) **بحرِ تبسم**

مجلد علاوہ محصول (۶؍) غیر مجلد علاوہ محصول (عہ) — مجلد علاوہ محصول (عا) غیر مجلد علاوہ محصول (۱۲؍)

دونوں معہ محصول مجلد للعہ غیر مجلد ہے میں

اگر دیکھنے کے بعد آپ واپس کرنا چاہیں گے۔ تو محصول ڈاک وضع کرکے آپ کی رقم آپ کے پاس بھیجدی جائے گی۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

غزلیات

(ذہین فاروقی)

بندِ نقاب وا نہ ہوا وا کئے بغیر
مانا نہ کوئی راز کو افشا کئے بغیر

دنیا میں وجہ بر ہمیِ دل نہیں کوئی
پہچانتا ہوں تم کو تماشا کئے بغیر

پاسِ وفائے وعدہ پہ غالب تھی شانِ حسن
اُٹھا نہ یہ حجاب تقاضا کئے بغیر

معصومیت وہ حسن کی اب کیا کہے کوئی
شرما گئے وہ عرض تمنا کئے بغیر

میں ہوں فریب خوردۂ نیرنگِ آرزو
ملتے ہیں آپ۔ اور تمنا کئے بغیر

تنہائی خیال مجھے کب ملی ذہین
دنیا کو نذرِ شورشِ تنہا کئے بغیر

قیامت خیز منظر حسن والفت کا تصادم تھا
میری آنکھوں میں آنسو تھے ترے لب پہ تبسم تھا

فراموشی مری تیرے تجسس میں قیامت تھی
میں تھا محوِ طلب اور باعثِ شوقِ طلب گم تھا

ذہین اور آپ اُسکو بھول جائیں اسکی مرتی ہی
فراموشی کے قابل وہ سزاوارِ ترحم تھا

یوں مجھ کو بزمِ ناز میں دیکھا نہ کیجئے
مرے مذاقِ عشق کو رسوا نہ کیجئے

جلوہ اور اس ادا سے کہ پردا نہ کیجئے
جی چاہتا ہے آنکھ بھی اب وا نہ کیجئے

ہے کفرِ عشق آرزوئے غیر اسلئے
اپنے سوا کسی کی تمنا نہ کیجئے

یہ ہے علاجِ شکوۂ رسوائی نظر
جب کوئی دیکھتا ہو تو دیکھا نہ کیجئے

منظور مجھ کو کشمکشِ ضبط و اضطراب
ہاں اپنے التفات کو رسوا نہ کیجئے

مجھکو تو صبر تھا ستم گاہ گاہ پہ
یہ بھی اگر بُرا ہے تو اچھا نہ کیجئے

اب تو ذہین یاس ہی انجام کار ہے
کیا کیا امید کیجئے کیا کیا نہ کیجئے

(مجازی لکھنوی)
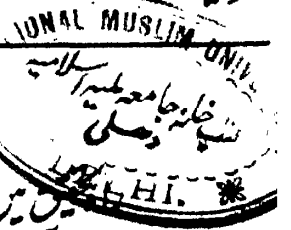
[illegible] میں دہوکہ نظر آتا ہی مجھے — علم خود جہل کی جانب لئے جاتا ہی مجھے
راہبر آپ تو منزل کا پتہ پا نہ سکا — پھر وہ کس منھ سے بھلا راہ بتاتا ہی مجھے
جب عداوت میں مزا تھا تو ہوئے دوست عدو — خود غرض سارا زمانہ نظر آتا ہی مجھے
دل کے عالم کا بدلنا تھا کہ دنیا بدلی — راز ہی راز جہاں میں نظر آتا ہی مجھے
عمر بھر میں مری تحقیق یہاں تک پہونچی — یہ جہاں ایک معمّا نظر آتا ہی مجھے

اے مجازی غمِ ہستی نہیں جھیلے جاتے
لا کوئی جامِ مئے ناب۔ پلاتا ہی مجھے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

منیجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ